for Fran with
Lots (& lots) of ♡
from Satya
30.05.2009

دل خوں شدۂ کشمکش حسرت دیدار
آئینہ بدست بت بدمست حنا ہے
غالب

شرح دیوانِ غالب اردو

اور

تنقید کلام غالب

المعروف بہ

ہدیۂ سعید

از

ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد علیگ

ناشر
غالب اکیڈمی، نئی دہلی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : شرح دیوانِ غالب
مصنف : ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد علیگ
قیمت : -/250 روپے
مطبع : پرنٹ سینٹر، دریا گنج، نئی دہلی- 002 110
کمپوزنگ : افراح کمپیوٹر سینٹر، D-15، گلی نمبر 2، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر،
نئی دہلی- 025 110

ISBN 81-904001-4-2

Sharah Diwan-e-Ghalib
by Dr. Qazi Sayeeduddin
Rs. 250/-

پیش لفظ

دیوان غالب کی بہت سی شرحیں شائع ہوئی ہیں۔ ان سب کی اپنی افادیت ہے۔ مولانا طباطبائی، مولانا حسرت موہانی، مولانا سہا، مولانا آصف، آغا باقر اور یوسف سلیم چشتی کی شرحیں مقبول ہوئیں لیکن دستیاب شرحوں کی تعداد کم ہی ہے۔ غالب اکیڈمی کے بانی حکیم عبدالحمیدؒ کی سرپرستی اور نگرانی میں غالب اکیڈمی نے دیوان غالب کا ڈیلکس ایڈیشن، عام ایڈیشن اور ہندی میں دیوان غالب فوٹ نوٹ کے ساتھ شائع کئے۔ یہ سارے ایڈیشن بہت مقبول ہوئے۔ کافی عرصے سے یہ ضرورت محسوس کی جارہی تھی اور حکیم عبدالحمیدؒ کی خواہش بھی تھی کہ دیوان غالب کی شرح بھی اکیڈمی کی طرف سے شائع کی جائے۔ اس کی دو صورتیں تھیں، دیوان غالب کی نئی شرح لکھوائی جائے یا پہلے لکھی گئیں نایاب شرحوں میں سے اشاعت کے لیے منتخب کی جائے۔ دونوں ہی صورتیں نہ صرف مشکل تھیں بلکہ دیرپا بھی تھیں۔ لیکن اس مشکل کو جناب سید اوصاف علی صاحب نے بہت جلد حل کر دیا۔ انھوں نے کافی غور و فکر کے بعد ہدیۂ سعید یعنی دیوان غالب مع شرح مقدمہ مشتمل بر سوانح عمری تنقید کلام غالب از قاضی سعید الدین اشاعت کے لیے منتخب کیا۔ جس کا ایک نسخہ اپنے برادرِ عزیز جناب سید عشرت علی صاحب، الہ آباد سے حاصل کیا۔ یہ شرح مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے 1926 میں شائع ہوئی تھی لیکن اب نایاب ہے۔ دیگر شرحوں کے مقابلے میں اس میں کتاب کے آغاز میں ہی غالب کی سوانح عمری پر مضمون بھی شامل کیا گیا ہے اور غالب کے کلام پر تنقیدی مضمون بھی۔ اس کی زبان سادہ اور عام فہم ہے جسے عام قاری اور طلبا

آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ شرح 1926 میں طلبا کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی تھی لیکن آج بھی اس میں زبان کی سلاست موجود ہے۔ غیر ضروری طوالت اور وضاحت سے کتاب پاک ہے۔ جو اشعار بہت صاف اور واضح ہیں ان کے بارے میں صرف اتنا لکھ دیا ہے کہ "مطلب صاف ہے"۔ شعر کا مطلب لکھنے سے پہلے شعر میں استعمال ہوئے مشکل الفاظ کے معنی دے دیے گئے ہیں اور پھر شعر کا مطلب بیان کر دیا گیا ہے۔ ایک نمونہ درج ذیل ہے۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سر گشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

معنی و مطلب :

سر گشتہ :- حیران، تیشہ :- بسولا۔ کلہاڑی۔ کوہکن نے جب اپنی معشوقہ شیریں کے مرنے کی خبر سنی تو اس نے اپنے آپ کو اسی تیشہ سے جس سے وہ نہر کھود رہا تھا، مار ڈالا۔ یہ شعر فرہاد پر تنزاً کہا گیا ہے کہ اس کو رسوم و قیود کی پابندی جو کہ دیوانگی و آزادی کے خلاف ہو اس قدر تھی کہ اس نے آپ کو تیشہ ہی سے مارا اور اس کے بغیر نہیں مرا گویا کہ وہ رسوم و قیود کا سرگشتہ (دیوانہ) تھا نہ کہ شیریں کا۔

امید ہے کہ اکیڈمی کی دیگر مطبوعات کی طرح غالب کے قارئین اس کتاب کو بھی پسند کریں گے۔ اس کتاب کی حصولیابی اور انتخاب کے لیے جناب سید اوصاف علی صاحب کا شکریہ لازمی ہے۔ اکیڈمی کے صدر جناب خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب اور اراکین گورننگ کونسل، غالب اکیڈمی کا بھی شکریہ ادا کرنا واجب ہے جن کی مرضی اور منشا سے کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی۔

ڈاکٹر عقیل احمد
سکریٹری، غالب اکیڈمی

27/ اکتوبر، 2007

دیباچہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قائم ہونے پر ہماری جامعہ عالیہ میں ایک اسلامی تعلیم گاہ کی حیثیت سے یونیورسٹی کی تعلیم میں زبان اردو کے فروغ کو مدنظر رکھا گیا۔ اس لیے اس یونیورسٹی کا گریجویٹ ہونے کے واسطے یہ ضروری سمجھا گیا کہ وہ زبان اردو میں بھی جو کہ فی زمانہ مسلمانون کی قومی زبان سمجھی جاتی ہے، کافی دسترس رکھتا ہو۔ اسی خیال کی تکمیل کے لیے مختلف جماعتوں میں اردو کی تعلیم لازمی کی گئی اور معقول نصابات اردو تجویز ہو کر داخل تعلیم یونیورسٹی ہوئے۔ چنانچہ بی، اے کی ڈگری کے واسطے دیوان غالب اپنی مخصوص اہمیت کے اعتبار سے داخل نصاب کیا گیا۔ اس زمانہ میں بندہ بھی بی۔ اے کلاس میں تعلیم پاتا تھا۔ اگرچہ اس وقت دیوان غالب کی بہت سی شرحیں موجود تھیں، لیکن ان میں کوئی بھی اس قدر جامع نہ تھی جو طلباء کی ضروریات کو تنہا پورا کر سکتی ہو۔ ان دقتوں اور مشکلات کی وجہ سے میرے چند احباب نے مجھ کو اس پر آمادہ کیا کہ میں اس ضرورت کو پورا کروں اور دیوان غالب کا ایک ایسا اڈیشن تیار کروں جو ان سب پر حاوی اور جس سے موجودہ دشواریوں کا ازالہ ہو سکے۔ الحمد للہ کہ یہ مشکل کام، جس کو میں اپنی اہلیت سے کہیں زیادہ سمجھتا تھا، پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس شرح کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ غالب پر جتنا لٹریچر کتب و رسائل وغیرہ میں دستیاب ہو سکتا ہے اس سب پر حاوی ہے۔ اشعار کے مطالبات میں پہلے مشکل الفاظ کے معنی اور اس کے بعد شعر کے معنی نہایت سلیس اور صاف طریقہ پر بیان کیے گئے ہیں۔ اکثر اشعار کے ساتھ ان کا محلِ تصنیف بتلایا گیا ہے جس کو معلوم کرنے کے بعد شعر کا مطلب نہایت ہی پُر کیف ہو جاتا ہے۔ شروع میں مرزا کی مفصل سوانح عمری دی گئی ہے اور ان کے کلام پر

تنقید کی گئی ہے۔ مختلف شارحین کے جائز اختلافات، ناظرین کی دلچسپی کے لیے بجنسہٖ درج کردیے گئے ہیں۔ مولانا حالؔی نے یادگار غالب اور مقدمہ شعروشاعری میں جن جن اشعار کا مطلب تحریر فرمایا ہے، چونکہ وہ بندہ کے خیال میں ان اشعار کے مطالب میں آخری الفاظ ہیں، اس لیے ان کو ضروری اضافات کے ساتھ بجنسہٖ نقل کردیا گیا ہے۔ مرزا صاحب نے خود اکثر خطوط، عود ہندی اور اردوئے معلّٰی میں بعض اشعار کے معانی بیان فرمائے ہیں جو ناظرین کے ملاحظہ کے واسطے لکھ دیے گئے ہیں۔ رسالہ اردو میں غالب پر چند مضامین نوشتہ جناب سید ہاشمی صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو اور جناب مولوی محمد مہدی صاحب کارکن دارالترجمہ حیدرآباد دکن شائع ہوئے، جو کہ حل مشکلات غالب میں نہایت ہی گراں قدر اضافہ ہیں۔ ان کے تحریر کردہ مطالب برائے استفادہ ناظرین درج ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مرحوم بجنوری کا ایک مضمون بعنوان ”محاسن کلام غالب“ طبع ہوا ہے جس میں غالب کے اشعار کی فلسفیانہ وادبیانہ ودیگر خوبیوں پر بحث کی گئی ہے۔ حسب ضرورت اکثر جگہ اس سے اقتباسات لے کر درج کردیے گئے ہیں۔ مولانا طباطبائی، مولانا حسرت موہانی، مولانا سہا، مولانا آسی، مولانا نظامی بدایونی ومولانا شوکت میرٹھی صاحبان کی شرحوں سے بہت کچھ مدد لی گئی ہے۔ آب حیات سے بھی اکثر جگہ امداد لی۔ میں فاضل شارحین، مصنفین و مولفین، اڈیٹران ونامہ نگاران رسائل واخبار کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی تصانیف نے بندہ کے اس اہم کام کو ایک حد تک سہل بنادیا۔ اس کے بعد میں اپنے بزرگ ومحترم ادیب وفاضلِ وقت جناب حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کا تہ دل سے مشکور ہوں کہ آپ نے اپنا گراں وقت صرف کرکے اس شرح پر نظرثانی فرمائی۔ اسی سلسلہ میں میں اپنے معزز احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جن کی معاونتِ مشفقانہ وہمت افزائی کے بغیر میں اس مہم میں عہدہ برآ نہیں ہوسکتا تھا۔

خاکسار
سعید الدین احمد

۲۷؍جولائی ۱۹۲۶ء

مقدمہ

مرزا کی سوانح عمری، نام، تخلص وجائے ولادت

اسداللہ خاں نام المعروف بہ مرزا نوشہ المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ، المتخلص بہ غالبؔ۔ شروع شروع میں اردو میں اسدؔ بھی تخلص کرتے تھے۔ ۸؍رجب ۱۲۱۲ھ کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ خود لکھتے ہیں ”عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ قاعدۂ عالم ہے کہ آب وگل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا:

خاندان وولدیت

مرزا سلجوقی ترک تھے، ان کا سلسلہ تو ابن فریدون تک پہنچتا ہے۔ مرزا کو اپنی اعلیٰ نسبی اور علو خاندان پر بڑا فخر تھا، جس کا اکثر اشعار میں اظہار کیا ہے۔

غالب از خاک پاک تورانیم   لا جرم در نسب فرومندیم
ترک زادیم و در نژاد همی   به سترگانِ قوم پیوندیم
ایبکم از جماعۂ اتراک   در تمامی زماہ دہ چندیم
فن آبائے ما کشاورزیست   مرزبان زادۂ سمرقندیم

ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کی سلطنت کے بعد اولاد سلجوق اِدھر اُدھر منتشر ہوگئی۔ مرزا کے دادا شاہ عالم کے زمانہ میں سمرقند سے ہندستان آئے اور ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں کے توسل سے دربار مغلیہ سے ان کو ایک معقول منصب عطا ہوا۔ پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ تنخواہ میں ملا۔ ان کے کئی بیٹے تھے۔ مرزا کے والد عبداللہ بیگ خان عرف مرزا دولہا کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی لڑکی سے ہوئی جو کہ عمائدین شہر آگرہ میں سے تھے اور آگرہ ہی اپنی سسرال میں رہنے سہنے لگے۔ اس لیے مرزا نے بھی بچپن میں آگرہ ہی میں پرورش پائی۔ مرزا دو بھائی تھے۔ لیکن ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف خاں نوعمری ہی میں پاگل ہوگئے تھے اور اسی حالت میں انھوں نے عین شباب میں انتقال کیا۔ مرزا کو ان سے بہت محبت تھی اور ان کے مرنے کی وجہ سے ہمیشہ نہایت غمگین رہتے تھے، لیکن جب کبھی ان کی خستہ حالی کا خیال آجاتا تو صبر اور شکر کرتے:

دی مرے بھائی کو حق نے از سرنو زندگی
میرزا یوسف ہے، غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

مرزا کے والد تلاش روزگار میں ادھر اُدھر پھرتے رہے۔ لکھنؤ، حیدرآباد اور الور، مختلف جگہ ملازمت کی اور اسی سلسلہ میں جبکہ راجہ بختاور سنگھ والی الور کی ملازمت میں بغاوت کی سرکوبی کے واسطے تعینات تھے، ان کے گولی لگی اور اسی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مرزا اس وقت پانچ سال کے تھے۔ ان کے والد کے انتقال کے بعد ان کے چچا نصر اللہ بیگ خان نے ان کی پرورش کی لیکن ان کا سایہ بھی مرزا کے سر پر نہ رہا اور مرزا ابھی آٹھ برس کے ہونے پائے تھے کہ وہ بھی راہیِ عدم ہوئے۔

مسکن

مرزا کا بچپن کا زمانہ آگرہ میں گزرا اور شادی کے کچھ عرصہ بعد تک مستقل سکونت آگرہ میں رہی۔ لیکن دہلی میں شادی ہو جانے کی وجہ سے ان کی وہاں رفتہ رفتہ آمد و رفت بڑھتی رہی اور آخر نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ قریب پچاس سال دہلی میں رہے مگر ہمیشہ کرایہ کے

مکان میں۔ کبھی کوئی مکان نہیں خریدا۔ اگر ایک مکان میں رہتے رہتے جی اکتا جاتا تھا، تو دوسرے مکان میں چلے جاتے تھے۔

تعلیم و مطالعہ

جب تک آگرہ میں رہے شیخ معظم سے، جو آگرہ کے نہایت ہی مشہور و معروف معلّموں میں سے تھے، برابر تعلیم پاتے رہے۔ اس کے بعد ایک دوسرے ادیب پارسی نژاد نومسلم عبدالصمد سے، جو کہ عربی و فارسی کے ایک بڑے عالم تھے، کچھ عرصہ تک فارسی زبان سیکھی۔ علاوہ ان فاضل ادیبوں کی فیض صحبت و تعلیم کے مرزا میں خود فطری قابلیت اس قدر تھی اور اردو فارسی سے قدرتاً ایسی مناسبت تھی کہ ان کا ایک جگہ یہ دعویٰ کرنا کہ میرا کوئی استاد نہ تھا، کچھ غلط نہیں ہے۔ جیسا کہ لکھتے ہیں ''مجھ کو مبدا فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ لوگ مجھ کو بے استاد کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے۔'' مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ گو مرزا کو عبدالصمد کے ساتھ رہنے کا بہت کم موقع ملا لیکن انھوں نے عربی و فارسی میں ان سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ جیسا کہ خود مرزا کی تحریروں، ان کے اعترافات اور قاطع برہان و درخش کاویانی کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے، فارسی زبان و ادب میں مرزا کو اس قدر عبور حاصل ہوگیا تھا کہ خود اہل زبان بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ مرزا کو فن عروض میں بھی کافی دستگاہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے بعض بعض قصائد اور غزلیں ایسی ٹیڑھی اور سخت بحروں میں لکھی ہیں جو ایک معمولی شاعر کا کام نہیں۔ اس کے علاوہ مرزا کو علم نجوم سے بھی کچھ واقفیت تھی۔ علم تصوف سے ان کو خاص مناسبت تھی اور تصوف کی کتابوں اور رسالوں کا بہت زیادہ مطالعہ کیا کرتے تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مرزا کی شہرت، مقبولیت و امتیاز کا باعث ان کی یہی تصوف دوستی اور متصوفانہ خیالات تھے۔ تاریخ، سیاق و مساحت وغیرہ سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی جبکہ وہ خاندان تیموریہ کی تاریخ یعنی مہر نیم روز لکھ رہے تھے۔ کسی نے ان کو مورخ سمجھ کر کچھ

سوالات کیے۔ ان کے جواب میں کہتے ہیں۔ ”میں فن تاریخ و مساحت و سیاق سے اس قدر بیگانہ ہوں کہ ان فنون کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کار پردازان دفتر شاہی خلاصہ حالات از روئے کتب اردو میں لکھ کر میرے پاس بھیج دیتے ہیں میں اس کو فارسی کر کے حوالہ کرتا ہوں۔ میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں۔ میں اسی قدر ہوں کہ نظم و نثر بقدر اپنی استعداد کے لکھتا ہوں، مورخ نہیں ہوں۔

ما قصہ دارا و سکندر نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

لطف کی بات یہ ہے کہ مرزا کی ساری عمر تصنیف و تالیف میں بسر ہوئی لیکن مرزا نے کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی۔ ہمیشہ کرایہ پر کتابیں منگوا کر پڑھا کرتے تھے۔

خوشخطی

علاوہ علمی و ادبی قدرت کے مرزا کا خط نستعلیق نہایت شیریں و دل آویز تھا اور خوشخط ہونے کے ساتھ مرزا زود نویس بھی تھے۔

حافظہ

مرزا کا حافظہ اس قدر زبردست تھا کہ جو کام کی بات مرزا کو نظر پڑتی تھی، وہ ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی اور دوبارہ کتاب دیکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ قاطع برہان میں مرزا نے جو لکھا، وہ سب اپنی یادداشت سے لکھا۔ جب لوگوں نے اس پر اور ان کے نئے نئے محاورات و ترکیبوں پر اعتراض کیا تو اس کے ثبوت میں محض حافظہ سے اساتذہ کے کلام سے دس دس اور بارہ بارہ سندیں پیش کر دیں۔

فکر شعر

مرزا اکثر رات کو سرور و شراب کی حالت میں فکر شعر کیا کرتے تھے۔ جب کبھی شعر پورا

ہو جاتا تو کمربند میں گرہ دے لیتے۔ اس طرح کمربند میں بہت سی گرہیں لگ جاتی تھیں۔ صبح اٹھ کر ان گرہوں کو کھولتے جاتے اور سوچ سوچ کر اشعار قلم بند کرتے جاتے تھے۔

شعر فہمی۔ کتاب فہمی

مرزا شعر فہمی و کتاب فہمی میں ایک خاص قابلیت رکھتے تھے۔ حقائق و معارف کی کتابیں خوب مطالعہ کرتے تھے اور ان کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ کیسا ہی مشکل مضمون کیوں نہ ہو، ایک نظر میں اس کی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم، مرزا کی اس صفت یگانہ کی نسبت گلشن بے خار میں لکھتے ہیں۔ ”مضامین شعرے را کما حقہ می فہمد و بہ جمیع نکات و لطائف پے می برد و ایں فضیلتے است کہ مخصوص خواص اہل سخن است۔ اگر طبع سخن شناسی داری بایں نکتہ می رسی۔ چہ خوش فکر اگرچہ کمیاب است اما خوش فہم کمیاب تر خوشا حال کسیکہ از ہر دو شر بے یافتہ و رختے ربودہ بالجملہ چنین نکتہ سنج نغز گفتار کمتر مرئی شدہ۔“ نواب ممدوح ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ”میں ایک مرتبہ شاہ ولی اللہ صاحب کا ایک فارسی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ ایک بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اتنے میں مرزا نکلے، میں نے ان سے اس کا مطلب دریافت کیا۔ انھوں نے قدرے تامل کے بعد اس کا مطلب فوراً اس خوبی کے ساتھ سمجھا دیا کہ شاید شاہ ولی اللہ صاحب بھی خود اس کو اتنا نہیں سمجھا سکتے تھے۔“

سخن سنجی

مرزا نہایت سخن سنج تھے۔ ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ مولانا آزردہ نے دور نہیں، حور نہیں، کی زمین میں ایک غزل لکھی۔ مرزا کی سخن سنجی آزمانے کے لیے ظہوری کے مشہور مطلع ”عشق عصیانست اگر مستور نیست کشتہ و جرم زماں مغفور نیست۔“ کا اردو ترجمہ ”عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں: کشتہ جرم زماں ناجی و مغفور نہیں۔“ مع اپنے مطلع کے، جس کو وہ اپنے خیال میں نہایت اچھا سمجھتے تھے، مرزا کے پاس لے گئے اور مرزا کی رائے دریافت کی۔ چونکہ اردو ترجمہ سے ظہوری

کے مطلع کی لطافت بہت کچھ جاتی رہی تھی، اس لیے ان کو یقین واثق تھا کہ مرزا ان کے مطلع کو ظہوری کے مطلع پر ترجیح دیں گے، لیکن مرزا ظہوری کے مطلع کو سن کر پھڑک اٹھے اور سر دھننے لگے اور پوچھا کس کا مطلع ہے؟ اس قدر تعریف سننے کے بعد مولانا کو اپنا مطلع پڑھنے کی جرأت نہ ہوئی اور ویسے ہی واپس چلے آئے۔

حلیہ

مرزا دراز قد اور نہایت ہی خوبصورت آدمی تھے۔ عہد شباب میں شہر کے نہایت حسین اور خوبصورت جوانوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ آخر عمر میں مرزا نے داڑھی رکھ لی تھی لیکن سر منڈایا کرتے تھے۔

شادی

مرزا کی شادی دہلی کے نواب فخر الدولہ احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں کے یہاں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر صرف تیرہ برس کی تھی۔ اپنی شادی کا حال مرزا نے خود ان الفاظ میں لکھا ہے۔ ’’تیرہ برس حوالات میں رہا۔[1] رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم حبس دوام صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا۔ مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ مگر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد اس جیل خانہ سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایاں کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی حبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔‘‘[2]

مرزا کی بیوی نہایت متقی و پرہیزگار تھیں۔ مذہبی احکام اور صوم و صلوٰۃ کی نہایت پابند تھیں۔ مرزا کی خدمت گزار اور خبر گیری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتیں۔ مرزا ان کا بڑا خیال رکھتے تھے اور ان کی ضروریات اور اخراجات کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، لیکن اپنی شوخی و ظرافت سے مجبور تھے۔ اکثر اپنی بیوی سے بھی قصداً ایسے جملے کہہ بیٹھتے جو ان کے زہد و متانت کے منافی ہوتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خود دیکھ کر آئے۔ اس کا دیوان خانہ تو پسند آ گیا مگر زنانہ خود نہ دیکھ سکے۔ گھر آ کر اپنی بیوی کو اس کے دیکھنے کے لیے بھیجا۔ جب وہ دیکھ کر واپس آئیں تو پسند و ناپسند کا حال پوچھا۔ وہ بولیں۔ ’’لوگ اس میں تو بلا بتلاتے ہیں۔‘‘ مرزا نے کہا ’’کیا دنیا میں آپ سے بڑھ کر بھی کوئی بلا ہے۔‘‘

کسی نے مرزا کو ان کے ایک شاگرد امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے مرنے کی اطلاع دی، اور لکھا کہ اس کے ننھے ننھے بچے ہیں، اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے؟ بچوں کی کس طرح پرورش ہو؟ مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں ’’امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پالوں گا۔ تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔‘‘

مگر بیوی اس قدر نیک مزاج اور سلیم الطبع تھیں کہ سب کچھ درگذر کرتیں اور کوئی پروا نہ کرتیں۔

اولاد

مرزا کے کوئی اولاد نہ تھی۔ شروع شروع میں سات بچے پے در پے ہوئے مگر تھوڑے تھوڑے دنوں بعد سب مر گئے۔ اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین عارف کے مرنے پر ان کے دونوں بچوں کو اپنی اولاد کے برابر پرورش کی، مگر افسوس کہ یہ دونوں بھی زندہ نہ رہے اور مرزا کے انتقال کے تھوڑے ہی عرصہ بعد راہی عدم ہوئے۔

---

[1] وہ زمانہ جو عالم تجرید میں گزرا۔ [2] زین العابدین عارف کے دونوں لڑکے جن کو عارف کی وفات کے بعد مرزا نے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔

مالی حالت وپنشن

مرزا کے والد کے انتقال کے بعد، جب تک ان کے چچا زندہ رہے وہ ان کے تمام اخراجات کے کفیل رہے۔ ان کی وفات کے بعد چونکہ وہ سرکاری فوج میں رسالدار تھے، سرکار عالیہ نے کوشش کر کے ریاست فیروز پور جھرکہ سے ان کے وارثین اور متعلقین کی پنشن مقرر کروادی۔ چنانچہ مرزا کو سات سو روپیہ سالانہ آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک ملتا رہا۔ لیکن غدر کے بعد بہادر شاہ ظفر سے تعلقات کی وجہ سے تین برس تک مرزا کی پنشن بند رہی۔ ادھر بہادر شاہ کے معزول ہو جانے کی وجہ سے قلعہ کی پنشن بھی بند ہوگئی۔

دو برس تک مرزا ناداری اور مفلسی کے ہاتھوں نہایت پریشان رہے۔ گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ سب لٹ گیا تھا۔ آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی مگر متعلقین کی وہی کثرت تھی۔ نوکر سب بدستور ملازم تھے۔ نہایت تنگی ومصیبت سے گزر ہوتی۔ مرزا خود لکھتے ہیں: ''اس ناداری کے زمانہ میں جس قدر کپڑا اوڑھنا بچھونا گھر میں تھا، بیچ کر کھا گیا۔ گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔''

لوگ اکثر پنشن کا حال دریافت کرتے۔ اسی کے جواب میں میر مہدی مجروح کو ایک خط لکھتے ہیں: ''میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا۔ آگے خدا رزاق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ دستنبو کو اسی اظہار مفلسی پر ختم کرتے ہیں۔ ''اس بازیچۂ اطفال یعنی کتاب دستنبو کے لکھنے میں کب تک خامہ فرسائی کی جاوے۔ جو حالت کہ اس وقت درپیش ہے ظاہر ہے کہ اس کا انجام موت ہے یا بھیک مانگنا۔ پہلی صورت میں یقیناً یہ داستان ناتمام رہنے والی ہے اور دوسری صورت میں نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ کسی دکان سے دھتکارے گئے اور کسی دروازے سے کوڑی پیسہ مل گیا۔ پس اپنی ذلت اور رسوائی کے سوا اب اس میں لکھنے کو کچھ باقی نہ رہا۔ قدیم پنشن اگر مل بھی گئی تو بھی

کام چلتا نظر نہیں آتا اور نہ ملی تو کام ہی تمام ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں چونکہ اس شہر کی آب وہوا اب خستہ دلوں کو راس آتی معلوم نہیں ہوتی، ضرور شہر چھوڑنا اور ضرور کسی اور بستی میں جا کر بسرام کرنا پڑے گا۔''

غدر کے دو برس بعد نواب یوسف علی مرحوم والی رام پور نے مرزا کی ساری عمر کے واسطے سو روپے پنشن مقرر کردی جو نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی مرزا کے آخر دم تک جاری رکھی۔

اگرچہ مرزا کی غربت وعسرت انتہا کو پہنچ گئی تھی اور ایک ایک دن مشکل سے گزرتا تھا لیکن مرزا کو اپنی وضع اور خودداری کا اس قدر خیال تھا کہ انھوں نے صرف اپنی عزت کی خاطر تنگ دستی ومصیبت میں رہنا گوارا کیا اور سرکاری ملازمت سے صاف انکار کردیا۔ آب حیات میں لکھا ہے۔

''جب دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا، مسٹر ٹامسن سکریٹری گورنمنٹ ہند، جو آخر کو اضلاع شمالی ومغربی کے لیفٹیننٹ گورنر ہوگئے تھے مدرسین کے امتحان کے لیے دہلی میں آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ ماہوار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے، اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے۔ لوگوں نے مرزا اور مومن خاں اور امام بخش کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا کو بلایا گیا۔ مرزا پالکی میں سوار ہو کر صاحب سکریٹری کے ڈیرے پر پہنچے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی۔ انھوں نے فوراً بلالیا۔ مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے موافق صاحب سکریٹری ان کو لینے کو آئیں گے۔ جب بہت دیر ہوگئی اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے، وہ خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا۔ لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں۔ اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہوسکتا۔ مرزا صاحب نے کہا ''گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو، نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں فرق آئے۔ صاحب نے کہا ''ہم قاعدہ سے مجبور ہیں۔'' مرزا صاحب نے کہا کہ ''مجھ کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے'' کہہ کر چلے آئے۔

غدر سے تین برس کے بعد جب مرزا ہر طرح سے بری ہوگئے تو ان کی پنشن پھر جاری ہوگئی

اور گورنمنٹ نے از راہ سلوک گذشتہ تین سال کی پنشن بھی عطا فرمائی۔

اس کے علاوہ لکھنؤ سے واجد علی شاہ کے زمانہ میں مرزا کو چار سو روپے سالانہ مقرر ہو گئے تھے لیکن چونکہ دو برس کے بعد خود ریاست ہی ضبط ہو گئی، اس لیے کوئی مستقل آمدنی کی صورت نہ نکل سکی اور ریاست کی ضبطی پر کاغذات کے اِدھر اُدھر ہو جانے سے مرزا کا سالانہ بند ہو گیا۔

مذہب

مرزا در حقیقت اسلام پر یقین واثق رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول سمجھتے تھے۔ صرف دو چیزیں اپنے مذہبی فرائض واجبات میں سے جانتے تھے۔ ایک توحید وجودی اور دوسرے نبی اور اہل بیت نبی کی محبت اور انھیں دونوں چیزوں کو وہ اپنا ذریعہ نجات سمجھتے تھے۔

جہاں تک کہ فرقہ کا تعلق ہے کہ مرزا سنی تھے یا شیعہ، اس کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ مرزا کا میلان طبع تشیع اور خصوصاً فرقہ تفضیلی کی طرف پایا جاتا تھا، جیسا کہ ان کے اس شعر سے جو کہ انھوں نے حضرت علی کی مدح میں لکھا ہے، ظاہر ہے:

جاں پناہا! دل و جان فیض رسانا! شاہا!
وصی ختم الرسل تو ہے بہ فتوای دیں

جناب امیرؑ کو وہ رسول خدا کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے، تشیع کے خلاف مرزا کا جو کچھ رویہ تھا اور اس کے ذم وانحراف میں مرزا نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب بادشاہ اور اہل دربار کی خوشنودیِ مزاج کے واسطے لکھا تھا ورنہ دربار کا ہر ایک متنفس یہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اگر مرزا شیعی نہیں تو تفضیلی ضرور ہیں۔

مرزا کے مذہب کے متعلق یہ ساری خیالی بحث ہے۔ مرزا شیعہ تھے یا سنی، سب برائے نام ظاہراً وہ ارکان مذہب سے کسی کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ نہ کبھی روزہ ہی رکھتے اور نہ نماز ہی پڑھتے۔ شراب کثرت سے پیتے تھے۔ بقول ان کے اسلامی ہمدردی ضرور تھی، مسلمانوں کی ذلت کی اگر کوئی بات سن لیتے تھے، تو ان کو سخت افسوس ہوتا تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ’’مجھ میں کوئی بات مسلمانوں کی نہیں ہے، پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ پر کیوں اس قدر رنج اور تاسف ہوتا ہے۔‘‘

غدر میں جب مرزا کرنل برون کے روبرو گئے تو اس وقت کلاہ چاخ ان کے سر پر تھی۔ کرنل برون نے پوچھا ’’ول تم مسلمان ہے۔‘‘ مرزا نے جواب دیا ’’آدھا۔‘‘ اس پر کرنل برون نے کہا۔ ’’اس کا کیا مطلب ہے؟‘‘ مرزا نے کہا ’’شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا۔‘‘

جس زمانہ میں مرزا کی پنشن بند تھی، کوئی افسر مرزا سے ملنے آئے۔ باتیں ہوتے ہوتے پنشن کا ذکر چھڑ گیا۔ مرزا صاحب نے فرمایا ’’تمام عمر ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار۔ پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھ کو باغی مسلمانوں میں شمار کیا۔‘‘

الغرض مرزا کے مذہبی خیالات کو اجمالاً خود ان کے ان الفاظ میں قلم بند کیا جا سکتا ہے۔ ’’میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود اللہ لا موثر فی الوجوہ اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الاطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمت العالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسن ثم حسین۔ اسی طرح تا مہدی علیہ السلام:

ع   بریں زیست ماہم بریں بگذرم

ہاں اتنی اور بات ہے کہ ریاکار اور زنادقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا اجلانا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوں گا۔ اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تا کہ مشرکین اور منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔‘‘

مرزا مولانا فخر الدین صاحب قدس سرہ العزیز کے خاندان میں مرید بھی تھے، اسی وجہ سے ان کی تجہیز و تکفین اہلِ تسنن کے طریقہ پر عمل میں آئی۔

اخلاق و عادات

مرزا کا اخلاق نہایت وسیع تھا۔ جو کوئی بھی ان سے ملنے جاتا، نہایت ہی تپاک اور کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ مرزا کے خلق کی وجہ سے ان کے دوست بہت کثرت سے تھے۔ جو کوئی بھی ایک دفعہ مرزا سے ملاقات کو آیا، ہمیشہ ان کا گرویدہ رہا۔ مرزا دوستوں کو دیکھ کر نہایت ہی خوش ہوتے تھے اور ان کی خوشی و غم میں ہمیشہ شریک رہتے تھے۔ جو کوئی مرزا کے پاس جاتا، خواہ اجنبی ہو یا دوست، مرزا اس سے نہایت تواضع و خاطر سے پیش آتے تھے۔ ایک دن سید سردار مرزا مرحوم شام کے وقت مرزا سے ملنے آئے۔ باتیں کرتے کرتے رات ہوگئی۔ جب وہ جانے لگے تو چونکہ اندھیرا ہوگیا تھا، مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمعدان لے کر لب فرش تک آئے تا کہ وہ روشنی میں جوتا پہن لیں۔ انھوں نے فرمایا ''قبلہ و کعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا۔'' مرزا نے کہا ''میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمع دان نہیں لایا، بلکہ اس لیے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔''

مروّت

مرزا میں مروّت اس قدر تھی کہ ان کی زبان سے کسی کام کے لیے کبھی انکار نہ نکلتا تھا۔ خط کا جواب کبھی نہ روکتے۔ لوگ اکثر بیرنگ خط بھیجتے۔ مرزا نہایت خوشی کے ساتھ ان کا محصول ادا کر دیتے اور تیوری پر بل تک نہ آتا۔ اگرچہ آخر عمر میں مرزا کی طبیعت اشعار سے اکتا گئی تھی، مگر پھر بھی وہ کسی کی غزل کو بغیر اصلاح کے واپس نہیں کرتے تھے۔ آخر الامر جب لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہے تو ایک صاحب سے اس خلیق پیرایہ میں معذرت کرتے ہیں ''جہاں تک ہو سکا جناب کی خدمت بجا لایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب آنکھ سے اچھی طرح سوجھے، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بو علی قلندر کو بسبب کبر سن کے

خدا نے فرض اور پیغمبر نے سنت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمت اصلاح اشعار سے مجھے معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا، لکھ دیا کروں گا۔''

فراخ دلی

فراخ حوصلگی و فیاضی کا یہ عالم تھا کہ کبھی کوئی فقیر مرزا کے دروازہ سے خالی نہ جاتا۔ اپنے مفلوک الحال اور غریب دوستوں کے ساتھ نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ جہاں تک بھی ممکن ہوتا، احباب کی خدمت کرتے۔ پنشن بند ہو جانے پر اگرچہ مرزا کے ذرائع بالکل مسدود ہو گئے تھے اور مرزا خود نہایت تنگی و ترشی کے ساتھ بسر کرتے تھے، لیکن انھوں نے اپنے متعلقین کی خدمت و معاونت میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ملازمین میں سے کسی کو علاحدہ نہیں کیا۔ اپنے وقار کو اسی فراخ دلی کے ساتھ قائم رکھا۔ مرزا کے پاس اگر کچھ دینے کو نہ ہوتا تھا، تو اپنے گھر کی چیزیں فروخت کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جب مرزا کو دربار لیفٹیننٹ گورنری سے حسب معمولی خلعت ملی تو چپراسی وغیرہ قاعدہ کے مطابق انعام لینے کو آئے۔ مرزا یہ پہلے سے ہی سمجھتے تھے۔ انھوں نے دربار سے واپس آتے ہی فوراً خلعت و جواہر کو بیچنے کے لیے بازار بھیج دیا۔ چپراسیوں کو علاحدہ ایک کمرہ میں بٹھا دیا۔ جب خلعت فروخت ہو کر اس کی قیمت آئی، تو اس میں سے سب کو انعامات تقسیم کر دیے۔

حق پسندی

راست گفتاری و حق پسندی مزاج میں بے حد تھی۔ اپنی غلطی کو فوراً تسلیم کر لیتے تھے۔ اگر ان کے کلام پر کوئی ٹھیک اعتراض کرتا تھا یا کوئی عمدہ تصرف ان کے شعر میں کرتا تھا تو اس کو فوراً تسلیم کر لیتے اور اس کے مطابق شعر کو بدل دیتے تھے۔

خودداری

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ مرزا خودداری اور حفظ وضع کا بھی بہت لحاظ رکھتے تھے۔ گو آمدنی قلیل تھی، مگر جس سے ملتے، مساوات سے ملتے، امراء و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ جو کوئی ان کے مکان پر نہ آتا وہ بھی ان کے یہاں کبھی نہ جاتے تھے۔ بازار میں پالکی یا ہوادار کے بغیر نہیں نکلتے تھے۔ اپنے وقار و عزت کو سب پر مقدم سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، سرکاری ملازمت سے انکار کر دیا۔

چوسر کی عادت اور قید ہونے کا واقعہ

مرزا کو چوسر و شطرنج کھیلنے کی بہت عادت تھی اور ہمیشہ بازی بد کر کھیلتے تھے۔ ایک مرتبہ کوتوال سے کچھ رنجش ہو گئی۔ اس نے ان کو اسی جرم میں قید کرا دیا۔ مرزا نے خود اس واقعہ کو ایک فارسی خط میں بیان کیا ہے جس کا ترجمہ ہم ناظرین کی دلچسپی کے لیے درج کرتے ہیں۔ ”کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناموافق۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سیشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ صدر کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آ گیا اور حکام صدر نے اس رپورٹ بھیجنے پر اس کی بہت تعریف کی۔ سنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفریں کی اور میری خاکساری اور آزردہ روی سے اس کو مطلع کیا۔ یہاں تک کہ اس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا، جو کچھ گذرا اس ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے، اس پر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئین عبادت کے خلاف نہیں۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں۔ اور اگر رہوں تو ہندستان میں نہ رہوں، روم ہے مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے، یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمت للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ کب وقت آئے گا کہ درماندگی کی قید سے، جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے، نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ مجھ پر گزرا اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں۔“

مرزا اس واقعہ سے نہایت شرمندہ تھے اور اس کو اپنی بڑی بے آبروئی پر محمول کرتے تھے۔

چنانچہ لکھتے ہیں:

راز دانا غم رسوائی جاوید بلاست　　　　بہرِ آزارِ غمم از قید فرنگم نہ بود
جو راعد ارود از دل بہ رہائی لیکن　　　　طعن احبابِ کم از زخم خدنگم نہ بود

شراب نوشی

رات کو سوتے وقت مرزا کو شراب پینے کی عادت تھی۔ مگر ہمیشہ مقررہ مقدار میں پیتے تھے۔ نہ کم پیتے تھے نہ زیادہ۔ ملازم کو ہدایت تھی کہ اگر تجھ سے کتنا ہی مانگوں مگر تو زیادہ شراب ہرگز مت دینا۔ مرزا کو اگر کبھی شراب نہ ملتی یا اس کے پینے میں دیر ہو جاتی تو نہایت بے چین ہوتے تھے۔ اس عادت سے مرزا کی صحت خراب ہو گئی تھی جس کا اکثر خطوط میں انھوں نے اعتراف کیا ہے۔ گو مرزا شراب نہایت پابندی کے ساتھ پیتے تھے، اور اس کی بہت سی جگہ تعریف کی ہے، لیکن اعتقاداً اس کو بہت بُرا سمجھتے تھے۔ شراب نوشی کی نسبت مرزا خود ایک جگہ لکھتے ہیں: ”سچ بات کا چھپانا آزادوں کا کام نہیں۔ میں آدھا مسلمان کہ جس طرح قید کیش ملت سے آزاد ہوں اسی طرح بدنامی اور رسوائی کے خوف سے وارستہ ہوں۔ میری مدت سے یہ عادت تھی کہ رات کو فرنچ کے سوا

کچھ کھاتا نہ پیتا تھا اور اگر وہ نہ ملتی تھی تو مجھے کو نیند نہ آتی تھی۔ مگر جوانمرد، خدا دوست، خدا شناس دریا دل مہیش داس، ہندستانی شراب، جو رنگ میں فرنچ سے مشابہ ہے اور بو میں اس سے بہتر ہے، مجھے نہ بھیجتا تو میں ہرگز نہ جانبر ہوتا۔ رباعی

از دیر دلم دایہ زہر در می جست   از بادہ ناب یک دو ساغری جست
فرزانہ مہیش داس بخشید بہ من   آبے کہ برائے خود سکندر می جست

میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''میر مہدی! صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پیے، فوراً رگ وپے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا۔ نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب ہائے غضب۔

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

ایک مولوی صاحب مرزا صاحب سے ملنے آئے۔ ان کو یہ خبر نہ تھی کہ مرزا صاحب کو شراب کا بھی شوق ہے۔ میز پر شراب کا ایک شیشہ رکھا ہوا تھا۔ مولوی صاحب نے اس کو شربت کا شیشہ سمجھ کر ہاتھ میں اٹھا لیا۔ جب دیکھا کہ شراب ہے تو عذر کرنے لگے۔ ''معاف کیجیے میں نے شربت کے دھوکے میں اٹھا لیا تھا۔'' مرزا صاحب اس پر مسکرائے اور کہا ''زہے نصیب دھوکے میں نجات ہوگئی۔''

ظاہر ہے کہ، گھبرا کے نا بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

کسی نے مرزا صاحب کے سامنے شراب کی مذمت کی اور کہا کہ شراب خوار کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا صاحب نے جواب دیا۔ ''بھائی جس کو شراب میسر ہے، اس کو اور کیا چاہیے جس کے لیے دعا مانگے۔''

موسم سرما میں ایک نواب صاحب مرزا کے یہاں تشریف لائے۔ مرزا نے ایک گلاس شراب سے بھر کر ان کے آگے رکھ دیا۔ نواب صاحب نے فرمایا ''میں توبہ کر چکا ہوں۔'' مرزا بولے: (حیرت زدہ ہو کر) ''کیا جاڑے میں بھی۔''

آموں کا شوق

مرزا صاحب کو آموں سے نہایت شوق تھا۔ لوگ دور دور سے مرزا کو آموں کے تحائف بھیجتے تھے۔ بعض بعض خاص دوستوں سے مرزا خود بھی فرمایش کر کے منگاتے تھے۔ اس کے علاوہ بازار سے خریدتے تھے لیکن پھر بھی مرزا کی طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ مرزا نے ایک پوری مثنوی آموں کی تعریف میں لکھی ہے۔ ایک روز چند احباب جمع تھے۔ آموں کا ذکر نکلا۔ ہر ایک نے آموں کے متعلق اپنی اپنی رائے ظاہر کی۔ جب مرزا کی باری آئی تو بولے۔ ''آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں، میٹھا ہو اور بہت سا ہو۔'' یہ سن کر سب ہنس پڑے۔

حکیم رضی الدین ایک دن مرزا کے پاس ان کے مکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو آموں سے زیادہ رغبت نہ تھی۔ اتفاق سے ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے وہاں سے گزرا۔ راستہ میں آم کے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے۔ حکیم صاحب نے مرزا صاحب سے کہا۔ ''دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔'' مرزا نے جواب دیا۔ ''ہاں گدھا نہیں کھاتا۔''

ایک مرتبہ مرزا بہادر شاہ ظفر کے ساتھ باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدے ہوئے تھے۔ آموں کو دیکھ کر مرزا کی طبیعت للچائی۔ آموں کی طرف گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ بادشاہ نے پوچھا ''مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو۔'' مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ ''پیر و مرشد! یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے، بر سر ہر دانہ بنوشتہ عیاں۔ کایں فلاں ابن فلاں ابن فلاں۔ اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانہ پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں؟ بادشاہ

یہ سن کر ہنسے اور اسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کے یہاں بھیج دی۔

ظرافت و حسنِ کلام

مرزا کی گفتگو نہایت ہی پُر مذاق و پُر لطف ہوتی تھی۔ اس لیے لوگ ان سے ملنے کے بہت مشتاق رہتے تھے۔ مرزا کم گو تھے لیکن جو کچھ کہتے تھے، لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ بقول مولانا حالی ’’ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظرف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسن بیان، حاضر جوابی اور بات میں بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں سے تھا۔‘‘

ایک مرتبہ بعد رمضان جب مرزا قلعہ میں گئے تو بادشاہ نے پوچھا ’’مرزا تم نے کتنے روزے رکھے۔‘‘ مرزا نے جواب دیا۔ ’’پیر و مرشد۔ ایک نہیں رکھا۔‘‘

کسی نے مرزا سے پوچھا کیوں حضرت آپ روزہ کیوں نہیں رکھتے۔ مرزا نے جواب دیا۔ ’’بھئی کیا کروں شیطان غالب ہے۔‘‘

ایک صحبت میں مرزا، میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ ذوق بھی موجود تھے۔ انھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ ’’مرزا بولے۔‘‘ میں تو آپ کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔‘‘

ایک دفعہ مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کو مرزا سے ملنے چلے آئے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ مرزا اپنی کوٹھری میں بیٹھے ہوئے چوسر کھیل رہے تھے۔ مرزا کو چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے۔ ’’ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا۔‘‘ مرزا نے کہا۔ ’’قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے، وہ یہی کوٹھری ہے۔‘‘

نواب یوسف علی خاں کے انتقال پر جب مرزا تعزیت کے لیے نواب کلب علی خاں صاحب کے پاس رام پور تشریف لے گئے تو وہاں انھوں نے چند روز قیام فرمایا۔ اسی اثناء میں نواب صاحب کو لفٹیننٹ گورنر صاحب سے ملنے بریلی جانے کا اتفاق ہوا۔ چلتے وقت نواب صاحب نے یونہی معمولی طور پر مرزا سے کہا ’’خدا کے سپرد۔‘‘ مرزا نے کہا ’’حضرت! خدا نے آپ کے سپرد کیا ہے، آپ پھر اُلٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔‘‘

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا اس میں لکھتے ہیں۔ ’’دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں مگر روزہ کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا۔ کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھالیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں، میں تو روزہ کو بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے کہ روزہ بہلانا اور بات ہے۔‘‘

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی آخر تاریخوں میں خط لکھا۔ انھوں نے اس کا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ کر بھیجا۔ اس کے جواب میں ان کو اس طرح لکھتے ہیں: ’’دیکھو صاحب، یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو، اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھ دیا ہے۔‘‘

ایک خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ’’دیوان خانہ کا حال محل سرائے سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے۔ ابر دو گھنٹہ برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔‘‘

غرض مرزا کی ہر بات ظرافت سے پُر ہوتی تھی۔ اگر مرزا کے ان ظرائف و لطائف کو ایک جگہ جمع کیا جاوے تو ایک پوری کتاب بن جائے گی۔

تصانیف

مرزا کی تصانیف میں ایک دیوان اردو ہزار بارہ سو بیت کا، جس کو مرزا نے اپنے بڑے دیوان سے مولانا فضل الحق خیرآبادی کی رائے کے مطابق منتخب کیا تھا اور ایک دیوان فارسی دس ہزار کئی سو بیت کا ہے۔ تیسری کتاب قاطع برہان ہے جس میں مرزا نے برہان قاطع کی غلطیاں

نکالی ہیں۔ اس پر مرزا کی سخت مخالفت ہوئی۔ لوگ گمنام خطوں میں گالیاں لکھ کر بھیجتے تھے۔ ان کی مخالفت میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن میں موید البرہان اور ساطع البرہان قابل الذکر ہیں۔ ان کے جواب میں مرزا نے ''تیغ تیز'' اور ''نامہ غالب'' دو رسالے لکھے۔ بادشاہ کی فرمائش پر خاندان تیموریہ کی تاریخ میں ''مہر نیمروز'' لکھی، جس میں تیمور سے لے کر ہمایوں تک کے حالات درج ہیں۔ یہ مجوزہ کتاب 'پرتوستان' کا پہلا حصہ تھا۔ مہر نیم روز کے ختم کرنے کے بعد مرزا دوسرا حصہ 'ماہ نیم ماہ' شروع کرنے والے تھے کہ غدر ہو گیا اور وہ نہ لکھا جا سکا۔ مرزا نے ایک کتاب 'دستنبو' حالات غدر پر لکھی۔ دیوان اردو و فارسی میں سے انتخابات کر کے ایک کتاب بنائی جس کا نام ''گل رعنا'' رکھا۔ دوران قید مرزا نے ایک فارسی ترکیب بند، جس میں بارہ بارہ اشعار کے صرف سات بند ہیں، لکھا اور اس کو ایک نظم کے مجموعہ موسوم بہ 'سید حسین' کے ساتھ شائع کیا۔ مرزا کے خطوط کو جمع کر کے عود ہندی اور اردوئے معلیٰ شائع کی گئیں۔ ان کے علاوہ 'پنج آہنگ' لطائف غیبی' اور دیگر چھوٹے چھوٹے رسائل بھی مرزا کی تصانیف سے ہیں۔

شاگرد

مرزا کے وسیع اخلاق اور ان کی مہمان نوازی کی وجہ سے ان کے بہت سے شاگرد تھے اور چونکہ مرزا کسی کی غزل کو تصحیح بغیر واپس نہ کرتے تھے، ان کا یہ دائرہ برابر بڑھتا رہا، اس لیے صرف ان چند شاگردوں کے نام لکھے جاتے ہیں جن کو مرزا کے ساتھ کچھ خصوصیت حاصل تھی۔

(۱) **عارف**: یہ مرزا کی بیوی کے بھانجے تھے اور مرزا کو ان سے بہت محبت تھی۔ یہ نہایت ہی خوش فکر اور خوش گلو تھے اور نہایت اچھی طبیعت پائی تھی مگر ان کی عمر زیادہ نہ ہوئی اور یہ جوانی ہی میں مر گئے۔

(۲) **خواجہ الطاف حسین حالی**: جن کی تصانیف مشہور ہیں۔ آپ نے مرزا کی ایک مفصل سوانح عمری اور ان کے کلام کی تنقید میں ایک کتاب موسوم بہ ''یادگار غالب'' لکھی ہے۔

دوسری کتاب میں شعر و شاعری پر لکھا ہے۔ یہ دونوں کتابیں اردو ادب میں نہایت ہی گرانقدر اضافہ ہیں۔ آپ کا دیوان بھی مقبولیت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

(۳) **میر مہدی مجروح** جن کے نام عود ہندی اور اردوئے معلیٰ میں مرزا کے بہت سے خطوط موجود ہیں۔

(۴) **منشی ہرگوپال تفتہ** جن کے چار دیوان فارسی یادگار ہیں۔

(۵) **نواب ضیاء الدین احمد خاں** جو فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔ شاعری و انشاپردازی کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، علمِ انساب، علم اسماء رجال، تحقیق لغات اور عام واقفیت میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔

(۶) **قربان علی خاں سالک**۔ نواب علاء الدین خاں طلائی بھی مرزا کے شاگردوں میں سے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق کے انتقال کے بعد بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی غزلیں بھی مرزا ہی درست کیا کرتے تھے۔

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ اور سید غلام علی خاں وحشت اگرچہ عرفاً مرزا کے شاگرد نہ تھے لیکن حقیقتاً ان کو شاگرد کہنا چاہیے۔ یہ مرزا کو حد سے زیادہ ماننے والے اور معتقد اور ان کی صحبت سے مستفید رہتے تھے۔ ان دونوں کی طرف مرزا نے ایک شعر میں بھی اشارہ کیا ہے:

وحشت و شیفتہ مرثیہ لکھیں شاید
مرگیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

ضعیف العمری

آخر عمر میں مرزا نہایت کمزور ہو گئے تھے۔ چلنا پھرنا بند ہو گیا تھا۔ پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا بہت کم ہو گئی تھی۔ اجابت کرنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی۔ مرزا انھیں کمزوریوں اور دیگر مصائب کی وجہ سے سخت بیزار ہو گئے تھے۔ اکثر موت کی دعا مانگتے تھے۔ ہر سال تاریخ وفات

لکھتے اور خیال کرتے کہ اس سال ضرور مر جاؤں گا۔

۱۲۷۷ھ میں انھوں نے اپنی وفات کا یہ مادہ نکالا “غالب مرد” اس سے پہلے کئی مادّے غلط ہو چکے تھے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر، جو مرزا کے مخصوصین میں سے تھے، ان سے مرزا صاحب نے اس مادّہ کا ذکر کیا۔ انھوں نے فرمایا۔ “حضرت انشاء اللہ یہ مادّہ بھی غلط ثابت ہوگا۔” اس پر مرزا نے کہا “دیکھو صاحب! تم ایسی فال منہ سے نہ نکالو۔ اگر یہ مادّہ مطابق نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔”

ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پھیلی۔ میر مہدی مجروؔح نے دریافت کیا۔ “حضرت وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی موجود ہے؟” اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔ “بھئی کیسی وبا؟ جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکی تو تف بریں وبا۔”

فی الجملہ مرزا کو آخر عمر میں ایک گھڑی جینا دوبھر تھا۔ ہمیشہ مرنے کے آرزومند رہتے تھے۔

وفات

اسی ضعفِ پیری اور بیماری کی حالت میں مرزا پر بیہوشی کے سخت دورے پڑنے لگے۔ جب کبھی کچھ ہوش آجاتا، بے اختیار ان کی زبان سے یہ شعر بار بار نکلتا تھا۔

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے   عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

الغرض مرزا نے اسی حالت میں ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۶ھ مطابق فروری ۱۸۶۹ھ کو تہتر برس اور چار مہینہ کی عمر میں اس جہان فانی کو خیر باد کہا اور درگاہ حضرت سلطان اولیاء نظام الدین قدس سرہٗ میں اپنے خسر کے پائین مزار دفن کیے گئے۔ نماز جنازہ کے وقت اہل سنت و امامیہ، دونوں موجود تھے۔ سید صفدر سلطان نے فرمایا کہ “مرزا شیعہ تھے اس لیے ہم کو اجازت دی جائے کہ ہم اپنے طریقہ پر ان کی تجہیز و تکفین کریں۔” مگر نواب ضیاء الدین خاں مرحوم نے نہ مانا اور تمام مراسم اہل سنت کے طریقہ پر ادا کیے گئے۔

مرزا کی وفات پر بہت سی تاریخیں شائع ہوئیں۔ ان میں سب سے بہتر تاریخ “آہ غالب بمرد” ہے جس پر اکثر لوگوں نے اتفاق کیا ہے۔ یہ تاریخ مرزا کی خود تحریر کردہ تاریخ “غالب مرد” سے قریب قریب ملتی ہوئی ہے۔ خدا مرحوم کو مغفرت عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مرزا کی شاعری

مرزا کی شاعری کو سمجھنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ پہلے شاعری کے عام مفہوم، اس کی خصوصیات اور اس کے محسنات کو سمجھا جائے۔ شاعری کی کوئی ایسی تعریف نہیں کی جا سکتی جو بالکل جامع اور اس کے مفہوم پر پوری طرح حاوی ہو۔ مختلف حکماء و علماء نے مختلف تعریفیں کی ہیں۔ جانسن کی رائے میں شاعری اس فن کا نام ہے جو قوت متخیلہ کے توسل سے انبساط اور حقیقت کو ملا دیتا ہے اور اس کا نتیجہ ایجاد ہوتا ہے۔ کارلائل کہتا ہے کہ شاعری ایک موسیقانہ خیال ہے۔ شیلے اس کی تعریف یوں کرتا ہے کہ شاعری قوت متخیلہ کا انکشاف ہے۔ لیکن حقیقتاً شاعری سے مقصود جذبات و محسوسات انسانی کا وہ پُر کیف و رنگین اظہار ہے جو موزونیت کی قیود کا پابند ہو۔ شاعری تخیل انسانی کی ایک ملفوظ تصویر ہے۔ شاعری و مصوّری میں اس قدر موانست ہے کہ یوں کہنا چاہیئے کہ شاعری ایک بولتی ہوئی تصویر اور مصوری گنگ شاعری ہے۔

لارڈ مکالے نے شاعری کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ہم کو قریب قریب شاعری کے موجودہ مفہوم تک پہنچا دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ “شاعری، جیسا دو برس پہلے کہا گیا تھا، ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبار سے مصوری، بت تراشی اور ناٹک سے مشابہ ہے۔ مگر مصور بت تراش اور ناٹک کرنے والے کی نقل شاعر کی بہ نسبت کسی قدر کامل تر ہوتی ہے۔ شاعری کی کل کس چیز سے بنی ہوئی ہے؟ الفاظ کے پُرزوں سے اور الفاظ ایسے کہ گو ہومر اور ڈینٹی جیسے صناع بھی ان کو استعمال کریں تو بھی سامعین کے متخیلہ میں اشیاء خارجی کا ایسا صحیح اور ٹھیک نقشہ نہیں اتار سکتے، جیسا موقلم

اور چھینی کے کام دیکھ کر ہمارے خیال میں اترتا ہے۔ لیکن شاعری کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ بت تراشی، مصوری اور ناٹک، یہ تینوں فن اس کی وسعت کو نہیں پہنچ سکتے۔ بت تراش فقط صورت کی نقل اتار سکتا ہے۔ مصور صورت کے ساتھ رنگ کو بھی جھلکا دیتا ہے اور ناٹک کرنے والا، بشرطیکہ شاعر نے اس کے لیے الفاظ مہیا کر دیے ہوں، صورت اور رنگت کے ساتھ حرکت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر شاعری باوجودیکہ اشیاء خارجی کی نقل میں تینوں فنوں کا کام دے سکتی ہے، اس کو تینوں سے اس بات پر فوقیت ہے کہ انسان کا بطون صرف شاعری ہی کا قلمرو ہے۔ نہ وہاں مصوری کی رسائی ہے، نہ بت تراشی کی۔ اور نہ ناٹک کی۔ مصوری اور ناٹک وغیرہ میں انسان کے خصائل یا جذبات اس قدر ظاہر کر سکتے ہیں جس قدر چہرہ یا رنگ اور حرکت سے ظاہر ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہمیشہ ادھورے اور نظر فریب نمونہ ان کیفایات کے ہوتے ہیں، جو فی الواقع انسان کے بطون میں موجود ہیں، مگر نقش انسانی کی باریک، گہری اور بوقلموں کیفیات صرف الفاظ ہی کے ذریعہ سے ظاہر ہو سکتی ہیں۔ شاعری کائنات کی تمام اشیاء خارجی اور ذہنی کا نقشہ اتار سکتی ہے۔ عالم محسوسات دولت کے انقلابات، سیرت انسانی معاشرت نوع انسانی، تمام چیزیں فی الحقیقت موجود ہیں اور تمام وہ چیزیں جن کا تصور مختلف اشیاء کے اجزاء کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جا سکتا ہے، سب شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں۔ شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اس قدر وسیع ہے جس قدر خیال کی قلمرو۔''

شاعری دراصل کوئی اکتسابی چیز نہیں بلکہ یہ ایک عطیہ الٰہی ہے۔ اس کے حظ اور اس کی حقیقی کیفیات سے صحیح معنوں میں وہی لوگ بہرہ ور ہو سکتے ہیں جن کو قدرتاً اس کی طرف رجحان ہو اور طبعاً اس کی استعداد و اہلیت مفوض ہوئی ہو۔ صرف وہی شخص شاعر ہو سکتا ہے جس میں شاعری کا مادہ موجود ہو۔ بننے کو تو ہر شخص شاعر بن سکتا ہے لیکن اس سے سوائے سوسائٹی کے نقصان کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ لٹریچر و زبان تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ جھوٹ اور مبالغہ سے لوگوں کے کان آشنا ہو کر ان کا مذاق گر جاتا ہے۔ حقائق و واقعات مفقود ہو جاتے ہیں۔ ان نام نہاد شعراء کی ہزل گوئی سے زبان میں غیر مہذب اور فحش الفاظ داخل ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی طبیعت متانت اور سنجیدگی سے پھر جاتی ہے اور صرف مطائبات و مضحکات و ہزلیات دل آویزی کا سرمایہ رہ جاتی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں اس قسم کے شعرا کی کثرت اور نئی روشنی کے اکثر افراد اس قسم کے لٹریچر سے موانست و گرویدگی اس کا بین ثبوت ہے۔

دوسری طرف حقیقی شاعری میں وہ قدرت اور سحر ہے کہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے بڑے سے بڑے کام حل ہو جاتے ہیں۔ تاریخ میں ہم کو بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شعراء کی جادو بیانی سے سینکڑوں انقلابات ہو گئے، نیستیاں ہست اور ہستیاں نیست ہو گئیں۔ انگلستان کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ ''ایڈورڈ نے جب ویلز پر چڑھائی کی تو ویلز کے شاعروں نے قومی ہمدردی کے جوش میں نہایت ولولہ انگیز اشعار کہنے شروع کیے تا کہ اہل ویلز کی ہمت اور غیرت زیادہ ہو۔ اگرچہ انگلستان کی سپاہ کے آگے ان کی کچھ حقیقت نہ تھی لیکن شاعروں کے پُر جوش کلام نے حب وطن کا جوش اس قدر پھیلا دیا تھا کہ جب وہ فوج شاہی کے مقابلہ پر کامیابی سے بالکل مایوس ہو گئے تو بھی اطاعت خوشی سے قبول نہ کی۔ شاعروں کے کلام سے ایڈورڈ کی اس قدر مزاحمت ہوئی اور اس کو ایسی دقتیں اٹھانی پڑیں کہ فتح کے بعد اس نے ویلز کے تمام شاعروں اور دوستوں کو قتل کروا ڈالا۔ اگرچہ شاعری کا نتیجہ ویلز کے شاعروں کے حق میں بہت بُرا ہوا اور ملک کے لیے بھی کچھ مفید نہ ہوا، لیکن اس واقعہ سے شعر کی تاثیر اور کرامت بخوبی ثابت ہوتی ہے۔

ان چند الفاظ میں مختصر طور پر شاعری کی ماہیت اور اس کی عظمت دیکھنے کے بعد اب ہم زبان اردو و فارسی کے بلند پایہ اور عدیم المثل شعر گو مرزا غالب کی شاعری کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ ان میں شعر کہنے کی خداداد قابلیت تھی اور ان کی طبیعت قدرتاً موزونیت کی طرف مائل تھی۔ مرزا نے گیارہ برس کی عمر میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا، اور سب سے پہلے اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ مرزا کو سیدھے اشعار کے بجائے مشکل اور پیچیدہ اشعار زیادہ مرغوب تھے اور اسی قسم کے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ بیدلؔ کے کلام کو بہت شوق سے

پڑھتے تھے۔ اسی وجہ سے خود بھی جو شعر کہتے تو یہی کوشش کرتے کہ اس کا مطلب کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔ اس مشکل پسندی پر طرہ یہ تھا کہ مرزا کو فارسی سے فطرتاً مناسبت ہونے اور فارسی تعلیم کی وجہ سے ان پر فارسیت کا رنگ اس قدر غالب ہوگیا تھا کہ اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ ان پر اردو زبان کا مشکل سے اطلاق ہوسکتا ہے۔ مثلاً

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا   تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل پسند آیا
شب خمارِ شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا   تا محیطِ بادہ، صورت خانۂ خمیازہ تھا
نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب   پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

ان اشعار میں اگر ایک ایک دو دو لفظوں کو بدل دیا جاوے تو ہر ایک کو فارسی کا شعر کہا جاسکتا ہے۔

بعض جگہ فارسی اردو ترکیبوں کو بالکل ملا دیا ہے اور بعض جگہ فارسی ترکیبوں اور محاوروں کا بجنسہٖ اردو میں ترجمہ کرکے اشعار میں استعمال کیا ہے۔ جیسے:

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط   تو ہو اور آپ بہ صد رنگِ گلستاں ہونا
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل   کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا   بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

مرزا عام روش پر چلنا پسند نہیں کرتے تھے اور بہ نسبت اس کے کہ شعر عام فہم ہو، اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ ان کے خیالات اور طرزِ بیان میں جدت اور ندرت پائی جائے۔ بعض جگہ تو وہ قصداً شعر کو اس قدر مشکل بنا دیتے تھے کہ سوائے ان کے کوئی دوسرا اس کا مطلب نہیں کہہ سکتا تھا۔ جیسے ان کا یہ شعر:

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

اس شعر میں اگر مرزا خود نہ بتاتے کہ ”اے“ کو بجائے جز کے استعمال کیا ہے تو کوئی بھی اس

شعر کے مفہوم تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یا یہ شعر:

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

شارحین نے اس شعر کے معنی بیان کرنے میں نہایت بلند پروازی سے کام لیا ہے مگر شاعر کے مطلب تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ اسی سلسلہ میں ذیل کے اشعار بھی غور طلب ہیں:

برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بیتابی   ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر
از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ   طوطی کو شش جہت مقابل ہے آئینہ

مری تعمیر میں، مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا، ہے خونِ گرم دہقاں کا

ان اشعاروں کو لوگ مہمل کہتے ہیں۔ مگر ہماری نظر میں ان میں سے ہر ایک شعر مرزا کی نہایت جانکاہی، جگر کاوی، دماغ سوزی اور بلند خیالی کا نتیجہ ہے، جو ان کی ژرف نگاہی اور غیر معمولی قابلیت کا شاہد ہے۔

مرزا کا یہ طرز لوگوں کو بہت ناپسند تھا اور مختلف طریقوں سے مرزا پر ناراضگی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ جب کبھی کسی مشاعرہ میں مرزا کی شمولیت کی خبر لوگوں کو ملتی تو وہ تعریضاً ایسے اشعار لکھ کر لاتے جو الفاظ و تراکیب کے لحاظ سے تو نہایت پُرشان و شوکت ہوتے مگر معنی کے لحاظ سے بالکل مہمل ہوتے تھے اور اس طرح مرزا کو یہ جتایا جاتا تھا کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ مرزا عبدالقادر صاحب نے جو بہت ہی خوش مزاج اور ظریف الطبع لوگوں میں سے تھے، مرزا سے کہا کہ آپ کا ایک شعر سمجھ میں نہیں آتا۔ مرزا نے پوچھا ”کونسا شعر ہے؟“ آپ نے فوراً دو مصرعے موزوں کرکے پڑھے:

پہلے تو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا یہ سن کر حیران ہوئے اور کہا ”حاشا یہ میرا شعر نہیں ہے۔“ اس پر مرزا عبدالقادر صاحب نے ظریفانہ دلیری سے کہا کہ ”اگر آپ کے پاس دیوان ہو تو میں دکھا سکتا ہوں۔“ مرزا سمجھ گئے کہ مجھ پر اس پیرایہ میں اعتراض کیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ میرے اشعار ایسے ہوتے ہیں۔

اس قسم کی نکتہ چینی کے جواب میں کہتے ہیں:

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

لیکن مرزا نے کچھ عرصہ کے بعد ان نکتہ چینیوں اور اعتراضات سے متاثر ہو کر اور اکثر احباب کے کہنے سے اس قسم کے قریب قریب دو ثلث اشعار نکال دیے اور آئندہ کے لیے اس روش کو مجبوراً خیر باد کہا۔

مرزا عامیانہ اور سُوقیانہ الفاظ، محاورات اور خیالات سے احتراز کرتے تھے۔ کبھی مبتذل محاورات اور تشبیہیں استعمال نہیں کرتے تھے۔ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ کسی نے مرزا کے ایک شعر کی ان کے سامنے بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا ”ارشاد ہو تو وہ کون سا شعر ہے؟“ انھوں نے میر مانی متخلص بہ اسدؔ، شاگرد مرزا رفیع سوداؔ کا یہ شعر پڑھا:

اسدؔ اس جفا پر بتوں سے وفا کی
میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

چونکہ اس شعر میں تخلص اسدؔ تھا اس لیے وہ سمجھے کہ یہ مرزا کا ہی شعر ہے۔ مرزا شعر کو سن کر نہایت ہی برافروختہ ہوئے اور غصہ سے کہنے لگے۔ ”اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس کو رحمت خدا کی۔ اور اگر مجھ اسدؔ کا شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی۔“ مرزا کو یہ شعر اپنی طرف منسوب ہونا اس لیے ناگوار گزرا کہ ’میرے شیر‘ اور ’رحمت خدا کی‘ عامیانہ محاورے ہیں جن کو استعمال کرنا مرزا کبھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اسد کی رعایت سے ’میرے شیر‘ کہنا یہ بھی ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔ وہ ایسی مُبتَذَل رعایتوں کو بندش میں لانا اپنی کسر شان سمجھتے تھے۔

اس قسم کی بندشیں مرزا کو کاہیکو گوارا ہوتیں۔ وہ تو خود ریختہ گوئی اور اردو شاعری کو حقیر اور اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اردو میں شعر کہنا کوئی کمال نہیں۔ چنانچہ ایک فارسی قطعہ میں کہتے ہیں:

فارسی بہ بیں تا بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذرد از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است
راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید
ہرچہ در گفتار فخر تست[1] آں ننگ من است

نبی بخش مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں۔ یہ غزلیں کاہیکو ہیں، پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھ کو ناز ہے، کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا۔ اب قدردانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظل سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن سے سوغات نہیں لائے، یعنی نیا ریختہ۔ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔“ لیکن ساتھ ہی اس کے مرزا کو یہ بھی فکر رہتی تھی کہ ان کے معاصرین میں ریختہ گوئی میں ان کی فوقیت و افضلیت قائم رہے۔ اس لیے ان کو مجبوراً اس طرف بھی کچھ نہ کچھ توجہ کرنی پڑتی تھی۔

مرزا کی اردو شاعری میں ان کی غزلیات نہایت ممتاز ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سوائے غزلیات کے اور کوئی صنف قابل شمار نہیں۔ اگرچہ تعداد میں بہت ہی کم ہیں لیکن ان میں منتخب اور برگزیدہ اشعار اس قدر زیادہ اور اس اعلیٰ پایہ کے ہیں کہ مرزا کے دیوان ریختہ کو باوجود کم مایگی کے دیگر ضخیم سے ضخیم دیوانوں پر فوقیت حاصل ہے۔

مرزا کے خیالات میں وہ رفعت اور باریکی ہے کہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

---

[1] ذوق کی طرف اشارہ ہے

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

مرزا کے یہ دونوں شعر ان کی بلند پروازی، تعمق اور عظمت تخیل کے شاہد ہیں۔ مرزا کے کلام میں وہ بلاغت ہے کہ دیکھی نہیں گئی۔ ایک ایک شعر میں مطالب کے دریا سما گئے ہیں:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری شامت جو آئے　　اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم!　　میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے
ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر　　یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

قطرۂ و موج و حباب کے ہیچ و ناچیز ہونے کو ایک عام محاورے میں اس طرح ادا کرنا کہ ”یاں کیا دھرا ہے“ منتہائے بلاغت ہے:

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

اس شعر میں شراب کا ذکر نہ کرنا عین متقضائے بلاغت ہے۔

مرزا اپنے طرز بیان کے خود موجد ہیں، برخلاف متقدمین کے جن کی شاعری کا دائرہ اور ساری کوششیں صرف پرانے مضامین تک محدود تھیں اور انھیں کو لوٹ پھیر کر نئی نئی بندشوں میں بیان کرتے تھے۔ مرزا نے اس رسم قدیم کا اپنے اوپر التزام نہیں رکھا اور بالکل نئے اور اچھوتے مضامین پر، جن کو اب تک کسی شاعر نے مس تک نہیں کیا تھا، اپنے تغزل کی بنیاد قائم کی:

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے　　میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں
آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے　　صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
آہ کو چاہیے ایک عمر، اثر ہونے تک　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجے　　ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید　　ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے
ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب　　خونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا

یہ سب بالکل نئے اور اچھوتے مضامین ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں پائے جاتے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بالکل نئی طرح نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے:

وفا داری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یہ بھی اپنی نوعیت کا بالکل نیا مضمون ہے:

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز　　تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشہ کرے کوئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا　　مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
نظارہ کیا حریف ہو، اُس برقِ حُسن کا　　جوشِ بہار، جلوے کو جس کے نقاب ہے
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

بالکل نئے اور کیسے لطیف پیرایوں میں یہ بتلایا ہے کہ معشوق حقیقی کا جلوہ ہم کو میسر نہیں ہوسکتا۔

ایک دوسرے شعر میں مسئلہ توحید کو نہایت خوبی کے ساتھ اس طرح قلم بند کیا ہے:

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یعنی مظاہر و نوامیس فطرت میں ہر جگہ یکسوئی اور یکسانیت ہے، تنقیض و تضاد نہیں پایا جاتا۔ یہی فاعلیت کی یکتائی کی دلیل ہے۔ اس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کرسکتا:

طاعت میں، تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

بالکل نیا اور اچھوتا خیال ہے۔

مرزا نے معمولی مضامین کو بھی ایک بالکل نئے رنگ میں بیان کیا ہے۔ ان میں ایسی ایسی نزاکتیں اور باریکیاں رکھی ہیں جو دیگر اساتذہ کے یہاں بہت کم ملتی ہیں:

اے عافیت کنارہ کر، اے انتظام، چل   سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج
دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو   رکھتا ہے ضد سے کھینچ کر باہر لگن کے پانو
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا   کل تم گئے کہ، ہم پہ قیامت گزر گئی

مرزا کا اسلوب بیان بالکل نرالا ہے:

وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے   تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار   یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو   کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

مرزا نے جن واقعات و محسوسات کو نظم کیا ہے، ان کے مطالعہ سے آنکھوں کے سامنے ایک تصویر کھنچ جاتی ہے۔ مرزا کا مشہور قطعہ: اے تازہ واردان بساطِ ہوائے دل۔ الخ، مرزا کی اس کمال صفت کا بے نظیر نمونہ ہے۔ یہ قطعہ شاعری و موسیقی کے دو فنونِ متحدہ کی ایک واحد مثال ہے اور اپنی نوعیت کا بالکل نرالا اور لاجواب ہے:

مرزا رموز حیات، انسان اور اس کے جذبات و خصائل سے کماحقہ واقف تھے، اس لیے جس دلکش اور پُر معنی پیرایہ میں ان کو بیان کیا ہے، اس لحاظ سے مرزا کو بحیثیت ایک ماہر نفسیات و مصور فطرت، نہایت ممتاز درجہ حاصل ہے:

غیر کو یارب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

ایک شرمیلے معشوق پر عاشق کی گستاخی کے وقت جو کیفیت گزرتی ہے، وہ اس سے بہتر پیرایہ میں بیان نہیں کی جاسکتی:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد   پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

اکثر لوگ طاعت و زہد کے ثواب اور ان کی برکات کے پورے پورے معتقد ہونے پر بھی ان پر کاربند نہیں ہوتے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہی کہ ان کی طبیعت بندگی و عبادت سے بھاگتی ہے۔ ہزار کوشش کرتے ہیں، اس طرف مائل نہیں ہوتی۔ اس حقیقتِ فطری کو اس شعر میں کیسے سلیس اور سادے پیرایہ میں بیان کیا ہے جو بیان سے باہر ہے:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج   مشکلیں مجھ پر پڑی اتنی کہ آساں ہوگئیں
مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں   عمرِ عزیز صَرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

یہ دونوں مفہوم اس سے بہتر بیان نہیں کیے جاسکتے۔

مرزا نے جو اشعار بطور تلقین و نصیحت لکھے ہیں اور ان میں جو کچھ استدلال کیا ہے، وہ لطف سے خالی نہیں:

زنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال   راہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر
ہم مُوَحِّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم   ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

محاسن شاعری میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شاعر نشست الفاظ یا بندش مضمون سے ایک ادنیٰ سے ادنیٰ اور معمولی سے معمولی چیز کو اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر سے بہتر معنی پہنا دے۔ ایسے اشعار اکثر نہایت لطیف ہوتے ہیں۔ مرزا اس میں کسی سے کم نہیں:

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد!
مے ہے مگس کی قے نہیں ہے

شراب کو شہد پر کس خوبی سے ترجیح دی ہے۔ ایک دوسرے شعر میں شراب کو ذریعہ نجات قرار دیا ہے:

ظاہر ہے کہ، گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

جام جم جیسی گرانقدر و بے بہا چیز پر ایک معمولی مٹی کے پیالے کی کس عمدگی کے ساتھ فوقیت دکھلائی ہے۔

تصوف میں اکثر اساتذہ نے اشعار کہے ہیں، لیکن مرزا غالب کی بندشوں اور خیالات میں ایک عجیب ہی لطافت ہے:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا
جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں
ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

فلسفہ اور تصوف میں مرزا کو جو قدرت حاصل تھی، وہ ان اشعار اور اشعارِ سابقہ سے ظاہر ہے۔ مسائل تصوف میں مرزا کی جادو بیانی ان کے اس دعوے پر

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مہرِ صداقت ہے۔

مرزا، جہاں تک ہوسکتا تھا، عام اور مُبتذَل تشبیہوں کو جو معمولی ریختہ گویوں کے کلام میں پائی جاتی ہیں، استعمال نہیں کرتے تھے، بلکہ زورِ تخیل سے خود نئی نئی تشبیہیں پیدا کرتے تھے، جن میں سے اکثر بہت ہی لطیف ہوتی تھیں۔ مثلاً

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

عمر کو ایک بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دے کر حسن تشبیہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ مثلاً:

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے، چراغِ رہگزارِ باد، یاں

دنیا کی ساری چیزیں زوال پذیر ہونے کی بنا پر خورشید کو چراغ رہگذر سے تشبیہ دینا بالکل نئی تشبیہ ہے۔ ذیل کی تشبیہ بھی ملاحظہ طلب ہے:

شکوہ سے پُر ہوں میں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

حسن تشبیہ کے ساتھ ساتھ استعارہ و کنایہ و تمثیل کے استعمال میں بھی مرزا کو بڑا ملکہ تھا جن سے مرزا کے کلام میں عجیب طرفگی پیدا ہوگئی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار لکھے جاتے ہیں:

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا
دہانِ ہر بُتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی
عدم تک بیوفا! چرچا ہے تیری بیوفائی کا

لفظی مناسبات اور رعایات میں بھی مرزا کو یدطولیٰ حاصل تھا:

آمد بہار کی ہے کہ بلبل ہے نغمہ سنج
اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے
نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
لاگ ہو، تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
گر نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

مرزا کے اکثر اشعار شوخی و ظرافت کے نہایت ہی مہذب اور دل آویز نمونوں سے پُر ہیں:

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
بوسہ دیتے نہیں، اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر اِن کردہ گناہوں کی سزا ہے

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز   سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو، کیا ہے

مرزا کو معنی آفرینی میں بڑا کمال حاصل تھا جس کی وجہ سے مرزا کا کلام دیگر اساتذہ کے کلام کے مقابلہ میں نہایت امتیاز رکھتا ہے۔ مرزا کو خود اپنی اس علوئیت کا احساس تھا، جیسا کہ ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں: ’’بھائی شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے۔‘‘ اکثر اشعار ذو معنی ہیں جن کا مطلب بظاہر نہایت ہی سلیس معلوم ہوتا ہے مگر ذرا غور کے ساتھ پڑھنے سے ان کے ایک عجیب اور نہایت ہی لطیف معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق   ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
کیونکر رکھوں اس بت سے جان عزیز   کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
تیرے سرو قامت سے اے قدِ آدم   قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر   بادہ نوشی ہے باد، پیمائی

مرزا کے اشعار میں جہاں الفاظ کی تکرار ہے، نہایت ہی عمدہ واستادانہ ہے:

زبان اہلِ زباں میں ہے مرگِ خاموشی   یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانِ شمع
کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ   ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

جہاں کہیں غلو سے کام لیا ہے بس انتہا کو پہنچا دیا ہے:

عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دُکھتے ہیں آج اس بُتِ نازک بدن کے پاؤں

اس سے زیادہ اور کیا مبالغہ ہو سکتا ہے۔

مرزا کے کلام میں کچھ ایسا خاصہ ہے کہ پڑھنے والے پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ اس کو جتنا پڑھتا ہے، اتنا ہی لطف آتا ہے۔ ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ شاعر گویا خاص اسی

کے جذباتِ دل کی ترجمانی کر رہا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مزید برآں یہ کہ مضمون جتنا دلسوز ہوگا، اتنا ہی زیادہ پُر کیف ہوگا:

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس قدر بلیغ وسیف اشعار کم دیکھے گئے ہیں۔

مرزا الم پرست تھے۔ آلام ومصائبِ زندگی سے ہمیشہ پژمردہ رہتے تھے، اس لیے اکثر اشعار میں اس کا اظہار کیا ہے اور زمانہ کی ناموافقت کی شکایت کی ہے۔

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مُور، آسمان ہے

فی الجملہ مرزا کی شاعری حقیقی معنوں میں جذبات وفطرتِ انسانی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ حسن وعشق کے متعدد دلفریب مناظر اور تصوف والٰہیت، تمدن ومعاشرت، شوخی و ظرافت کے بیشمار رشہ کار نمونے جا بجا پائے جاتے ہیں۔ توحید، تشکر، توکل، تسلیم ورضا، بے ثباتی دنیا، انقلاب زمانہ، غدرِ احباب، عبرت وفا اور خودداری کی بے نظیر مثالیں موجود ہیں، جن کی یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتیں۔ مرزا اپنی طرز کے یکتا شاعر تھے اور ان کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

مرزا کا اردو زباں پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔ انھوں نے ریختہ گوئی کی بہت سی ظاہری

رسوم وقیود کی زنجیروں کو توڑ ڈالا اور اردو شاعری کو ایک حد تک آزاد کر دیا۔ خود بہت سی نئی نئی باتیں اختراع کر کے اس کا میدانِ عمل نہایت وسیع کر دیا۔ مرزا کے کلام میں جو جو خوبیاں ہیں، وہ ان چند الفاظ میں یہاں بیان نہیں کی جا سکتیں۔ دیوان کا ایک ایک شعر خوبیوں سے لبریز ہے۔ ان کے نکات ولطائف بیان کرنے کے لیے موزوں الفاظ نہیں مل سکتے۔ غالب پر جس قدر زبان اردو ناز کرے، بجا ہے۔ ان کو جو قبول عام نصیب ہو، کم ہے اور جتنی شہرت ہو، تھوڑی ہے۔

کاغذی پیرہن وسوختہ قالب غالبؔ
منتہائے نظر عرفیؔ و طالبؔ غالبؔ

شورِ گم گشتہ صحرائے مطالب غالبؔ
جستجو چیختی پھرتی ہے کہ غالبؔ غالبؔ

خار شاہد ہیں کوئی آبلہ پا گذرا تھا
گرد کہتی ہے کہ طوفانِ ہوا گذرا تھا

سعید الدین احمد
علی گڑھ

۲۷ جنوری ۱۹۲۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غزلیات

ردیف الف

(۱)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا   کاغذی ہے، پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ   صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے   سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے   مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

شعر۔۱ پیکر، صورت، جسم۔ اس شعر میں تلازمہ تحریر ونقاشی مدنظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً نقش، شوخیٔ تحریر، کاغذی پیرہن، پیکر تصویر، انسان کی نے بودِ ہستی اور کشاکش حیات کا نقشہ الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ نقوش ہستی کس شوخ نگار کے موئے قلم کے رہین منت ہیں کہ ضیق حیات سے تنگ آ کر اپنے صانع کے فریادی (کاغذی پیراہن) ہیں۔

مرزا صاحب نے ایک خط میں خود اس شعر کی شرح کی ہے۔ لکھتے ہیں: ''ایران میں رسم ہے کہ دادِ خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے، جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ

کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا۔ بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے جو صورت تصویر ہے۔ اس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو، موجب رنج وملال وآزار ہے۔ (عود ہندی)

حاصل شعر کا یہ ہے کہ ہستی خواہ وہ کسی چیز کی بھی ہو اور کسی صورت میں ہی کیوں نہ ہو، باعث تکلیف ورنج ہے، حتی کہ تصویر تک بھی، جو کہ صرف ایک ہستی محض ہے، بزبان حال فریاد کر رہی ہے کہ مجھ کو ہست کر کے کیوں رنج ہستی میں مبتلا کیا، جیسا کہ اس کی کاغذ پیراہنی سے ظاہر ہے۔

شعر۔ ۲ کاوِ کاو: تجسس، کرید، کھود، سخت جانی، مراد انتہائے رنج والم۔ مطلب یہ ہے کہ فرقت کی رات کی سختی اور تکلیف مجھ سے مت پوچھ، بس یہ سمجھ لے کہ ہجر کی رات کا کاٹنا عاشق کے واسطے اتنا ہی مشکل ہے جتنا فرہاد کا شیریں کے لیے پہاڑ کھود کر جوئے شیر کا لانا۔ اس شعر میں شاعر نے اپنے آپ کو کوہکن (فرہاد)، شب ہجر کی تاریکی اور سختی کو کوہ، سپیدۂ صبح کو جوئے شیر سے تشبیہ دی ہے۔

شعر۔ ۳ جذبہ: کشش، شوق، شوق قتل، دم شمشیر، تلوار کی دھار، مطلب یہ ہے کہ میرے اشتیاق قتل میں تلوار اتنی بے اختیار ہو رہی ہے کہ سینہ اس کا باہر کھنچ آیا ہے۔

شعر۔ ۴ آگہی؛ واقفیت مجازاً عقل، مدعا، مطلب۔ مطلب یہ ہے کہ عقل کتنی ہی کوشش کرے کہ وہ میری تقریر کا مطلب سمجھ جائے، لیکن جس طور جستجوئے عنقا لاحاصل ہے، اسی طرح میرے مطالب کا سمجھنا دشوار ہے اور عقل میرے مفہوم کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ مرزا آگے چل کر بھی لکھتے ہیں:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ   کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

شعر۔ ۵ آتش زیر پا، ایک محاورہ ہے جس کے معنی بے قرار ہونے کے ہیں۔ آتش دیدہ، وہ بال جو آگ کی گرمی سے پیچیدہ اور بدبودار ہو گیا ہو اور اس میں زنجیر کے حلقہ کی سی شکل پیدا ہو گئی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ میں قید میں بھی ایسا بے چین اور بے قرار رہتا ہوں کہ میرے زور وحشت اور سوز دروں سے زنجیر کی کڑیاں موئے آتش دیدہ کی مانند کمزور اور بے بود ہو گئی ہیں۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار   صحرا مگر بہ تنگیِ چشم حسود تھا
آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست   ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ   جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز   لیکن یہی کہ ”رفت“ گیا اور ”بود“ تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی   میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ
سر گشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

شعر۔ ۱ قیس: مجنوں، مگر، شاید، بروئے کار آنا، نمایاں ہونا، بہ تنگی چشم حسود، حاسد کی آنکھ کی مانند تنگ۔ حاسد کی تنگ نظری مشہور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سوائے مجنوں کے اور کوئی شخص مرد میدان عشق بن کر صحرا پیمائی پر آمادہ نہ ہوا۔ گویا وہ (جنگل) باوجود اپنی وسعت چشم حاسد کی سی تنگی رکھتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کا اس میدان میں آنا گوارا نہیں کرتا۔ حاصل یہ ہے کہ سوائے مجنوں کے کوئی مرد میدان عشق نہ ہوا۔

شعر۔ ۲ آشفتگی: پریشانی، سویدا، دل پر ایک سیاہ داغ ہوتا ہے۔ آشفتگی کو دود (دھواں) اور سویدا کو داغ سے تشبیہ دی ہے۔ نقش سویدا کیا درست، یعنی داغ دل مٹا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ میری پریشان حالی نے جو کہ عشق حقیقی کی وجہ سے تھی، میرے دل کے داغ کو جو دنیا کی مکروہات میں دل لگانے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا، مٹا دیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اس داغ (دل) کا اصل صرف دھواں تھا، جو میری آشفتگی کی وجہ سے پریشان ہو کر اڑ گیا، اور داغ دل (سویدا) جاتا رہا۔

حسرت موہانی صاحب نے اس شعر کے مطلب کو اس طرح بیان کیا ہے۔ ”دھوئیں سے داغ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آشفتہ خاطری اور پریشانی کے دود سے دل میں داغ سویدا کی صورت قائم ہو گئی۔“

شعر۔ ۳ شاعر کہتا ہے کہ دنیا کی زندگی صرف ایک فریب نظر تھی لیکن جب اسرار کے پردے اٹھا دیے گئے تو اس وقت معلوم ہوا کہ عالم حیات کا سارا نظام محض ایک خواب تھا اور سود وزیاں کی کوئی حقیقت فی نفسہٖ نہ تھی۔ دنیوی نقطۂ نظر سے ہر چیز یا ہر واقعہ یا ہر حادثہ کسی نہ کسی منفعت یا نقصان کا باعث ہوتا ہے اور اسی کے ماتحت انسان اپنی زندگی مقرر کرتا ہے، لیکن اصل حقیقت جب عریاں ہو کر اہل بصیرت کے سامنے آتی ہے تو اس وقت ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری تگ ودو اور ہمارے

تمام معیار غلط اور ناقص تھے، اور حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ خدا کی ذات وصفات وحشر ونشر وسزا وجزا، یہ سب کچھ دنیوی زندگی کے مقررہ نظریات تھے۔ شاعر کہتا ہے کہ اسرار کے پردے اٹھا دیے گئے تو اس وقت یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ سود وزیاں، لین دین، سزا وجزا کا کہیں وجود ہی نہ تھا۔

شعر۔ ۴ غم: عشق۔ مطلب یہ ہے کہ مکتب غم میں میرا سبق یہ ہے کہ رفت گیا اور بود تھا۔ یعنی زمانۂ عیش کبھی تھا اور اب جاتا رہا (طباطبائی)

حسرت صاحب اس کے معنی یوں بیان فرماتے ہیں ''یعنی ہنوز مبتدی ہوں۔ جس طرح لڑکے پہلے آمد نامہ پڑھتے ہیں، کہ رفت کے معنی گیا اور بود کے معنی تھا، وغیرہ۔ لطف یہ ہے کہ رفت وبود دونوں ماضی کے صیغے ہیں جس سے مطلب یہ ہے کہ دل عیش وفراغت سے بالکل محروم ہے۔''

دونوں شاعروں کے مطلب کو ہم آویز کردینے سے مفہوم اور زیادہ دلنشین اور لطیف ہو جاتا ہے، یعنی درسِ غم میں مبتدی بھی ہوں اور گذشتہ حسرتوں کا ماتم گسار بھی۔

شعر۔ ۵ داغ، عیوب، برہنگی، فقدان محاسن۔ خیال یہ ہے کہ انسان اور حیوان ایک ہی سطح پر ہیں، جو چیز انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہے، اخلاق حسنہ اور تزکیۂ باطن ہے۔

انسان، انسانیت کی کسی منزل پر کیوں نہ ہو، جہالت اور بربریت کی کشاکش سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ بالفاظ دیگر، محاسن اخلاق سے کسی نہ کسی حد تک عاری ہوتا ہے۔ اس کلیہ کو مدنظر رکھ کر اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جب تک انسان پر انسانیت کا اطلاق ہوسکتا ہے، اس وقت تک وہ اپنے آپ کو ان کمزوریوں سے محفوظ نہیں رکھتا جو اس کی عین فطرت ہیں۔ یہ معائب اسی وقت دور ہوسکتے ہیں کہ جب انسان لباس زندگی کو چاک کردیتا ہے (یعنی کفن پوش ہو جاتا ہے)

طباطبائی صاحب اس کا مطلب اس طرح بیان فرماتے ہیں: ''یعنی مرجانے سے ہی عیب برہنگی مٹا نہیں'' تو ہر لباس میں ننگ ہستی دوجود تھا۔ ننگ وجود ہونے کو ''برہنگی سے تعبیر کیا ہے، صرف لفظ کا تشابہ مرحوم کے ذہن کو اس طرف لے گیا۔''

شعر۔ ۶ سرگشتہ: حیران، تیشہ، بسولا، کلہاڑی۔ کوہکن نے جب اپنی معشوقہ شیریں کے مرنے کی

خبر سنی تو اس نے اپنے آپ کو اسی تیشہ سے، جس سے وہ نہر کھود رہا تھا، مار ڈالا۔ یہ شعر فرہاد پر طنزاً کہا گیا ہے کہ اس کو رسوم وقیود کی پابندی، جو کہ دیوانگی وآزادی کے خلاف ہے، اس قدر تھی کہ اس نے اپنے آپ کو تیشہ ہی سے مارا اور اس کے بغیر نہیں مرا۔ گویا کہ وہ رسوم وقیود کا سرگشتہ (دیوانہ) تھا نہ کہ شیریں کا۔

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا
دوست دار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا
سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا
حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر، یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا، تم نے بارہا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

شعر۔ ۱ ہم نے مدعا پایا۔ یعنی ہم مطلب سمجھ گئے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کا یہ کہنا ہے کہ اگر مجھ کو دل مل گیا تو میں تم کو واپس نہیں دوں گا، یہ دلالت کرتا ہے کہ آپ نے دل پالیا ہے اور یہ سب باتیں آپ صرف میرے چھیڑنے کی غرض سے کہہ رہے ہیں اور دینا مدنظر نہیں۔

شعر۔ ۲ درد کی دوا۔ دردزندگی کی دوا، یعنی عشق۔ درد بے دوا، عشق۔ مطلب یہ ہے کہ عشق کی وجہ سے مجھ کو زندگی کا مزہ حاصل ہوگیا (کیونکہ شاعر کے خیال میں بغیر عشق کے زندگی بیکار ہے) اور درد زندگی جاتا رہا، گویا عشق نے درد زندگی کے دور کرنے میں ایک دوا کا کام کیا، گرچہ وہ (عشق) بذات خود ایک دردِ بے دوا ہے۔

شعر۔ ۳ دشمن، رقیب، دوست دار دشمن، یعنی رقیب کا خیر خواہ۔ اعتماد دل معلوم، یعنی دل پر بھروسہ جاتا رہا۔ (کیونکہ وہ دشمن کا دوست معلوم ہوتا ہے)۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے آہ ونالہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ دل بھی ہمارا ساتھی نہیں، ورنہ محبوب تک رسائی

حاصل کر کے میری خلش کی پوری ترجمانی کرتا۔ بالفاظ دیگر، میرے آہ و نالے۔ نارسا ہیں اور یہ نارسائی ان کی مجبوریوں کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ان کی دوست داری دشمن کا ثبوت ہے۔

اس شعر کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ چونکہ معشوقہ خیر خواہ دشمن ہے، اس لیے دل کو اس پر اعتماد نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آہ بے اثر ہے اور نالہ نارسا ہے کیونکہ وہ صدق دل سے نہیں نکلتے۔

شعر۔ ۴ عاشق اپنے تجربہ کی بنا پر کہتا ہے کہ محبوب سادہ و بیخود ہے اور اس طور پر ایک حد تک سہل الحصول ہے۔ لیکن جب عاشق محبوب کی اس ظاہری تغافل شعاری کو دیکھ کر رسائی پیدا کرنا چاہتا ہے، اس وقت اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہی سادگی و بیخودی، پرکاری و ہوشیاری کا دوسرا نام ہے اور محبوب تک پہنچنا بے حد دشوار (جرأت آزما) ہو جاتا ہے۔

حسرت صاحب اس کے معنی اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ ’’اہل حسن کی ظاہری سادگی سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے مشتاقوں کی جرأت کو آزمائیں، یعنی یہ دیکھیں کہ ان کو سادہ سمجھ کر ارباب اشتیاق جرأت گستاخی تو نہیں کرتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس قسم کی سادگی کو درحقیقت پرکاری، اور بیخودی کو ہشیاری سمجھنا چاہیے۔

شعر۔ ۵ غنچہ اور دل کی تشبیہ عام ہے مطلب یہ ہے کہ غنچہ کو، جو کہ رنگ میں سرخ ہوتا ہے، دیکھ کر ہم کو اپنا خون گشتہ اور گم شدہ دل یاد آ گیا۔ یا یہ کہ آمد بہار سے ہمارا جنون تازہ ہو گیا۔

شعر۔ ۶ مطلب یہ ہے کہ ہم کو دل کا صرف اس قدر حال معلوم ہے کہ ہم نے اس کو اکثر تلاش کیا لیکن نہیں ملا، مگر برخلاف اس کے تم کو بارہا ملا۔ یعنی بالفاظ دیگر مجھے دل کی حقیقت تو معلوم نہیں صرف اس کی ایک کیفیت معلوم ہے۔ یعنی یہ کہ وہ میرے قبضہ اور تصرف سے ہمیشہ آزاد، اور تمھارا گرویدہ رہا۔

شعر۔ ۷ آپ، یعنی ناصح۔ شور اور نمک میں رعایت لفظی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ناصح کی نصیحت نے میرے زخم عشق پر بجائے مرہم کے، نمک کا کام کیا (یعنی اور تکلیف پہنچائی) یعنی جتنی وہ مجھ کو عشق سے باز رہنے کی نصیحت کرتا تھا۔ اتنی ہی مجھ کو زیادہ اذیت ہوتی تھی۔ ایسی حالت میں کوئی میرے ناصح سے دریافت کرے کہ انھوں نے مجھ کو نصیحت کر کے کیا فائدہ اٹھایا۔

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا　　آتشِ خاموش کے مانند، گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں　　آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا　　میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں　　کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار　　اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

شعر۔ ۱ بے محابا: بلا پس و پیش۔ بے خوف، مجازاً ایک لخت۔ مطلب یہ ہے کہ میرا دل سوز نہاں (آتش عشق) سے چپکے چپکے اِس طرح جلا کیا کہ کسی کو بھی خبر نہ ہوئی۔ آتش خاموش، بمعنی سلگتی ہوئی آگ، جو دور سے بجھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

شعر۔ ۲ آگ: یاس و ناکامی کی آگ، یعنی مجھ کو اتنی ناکامی و ناامیدی ہوئی کہ دل میں جو جو خواہشیں تھیں، وہ سب جاتی رہیں، یہاں تک کہ ذوقِ وصل و یادِ یار تک بھی جو ایک حد تک غیر فانی سمجھے جاتے تھے، باقی نہیں رہے۔

مولانا طباطبائی نے آگ سے آتش رشک مراد لی ہے یعنی ’’رشک رقیب کی آگ ایسی تھی کہ معشوق کو دل سے بھلا دیا اور اس کا غیر سے ملنا دیکھ کر ذوقِ وصل جاتا رہا۔ گھر سے دل مراد ہے۔ میر تقی لکھتے ہیں:

عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں　　لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پھک گیا

شعر۔ ۳ مطلب یہ ہے کہ برخلاف دیگر ہستیوں کے میری ہستی عدم سے بھی بالاتر ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو کیوں میری آہ آتشیں عالم ہستی میں پہنچ کر بال عنقا کو جلایا کرتی۔ یا بالفاظ دیگر، میری آہ آتشیں کی خصوصیات صحرائے نیستی میں بھی پہنچ کر باقی رہتی ہیں۔ اس لیے میری ہستی وادی عدم تک پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ بال عنقا کو جلاتی ہوئی صحرائے عدم سے گزر کر ایک دوسرے عالم تک پہنچتی ہے۔ حاصل یہ کہ میری ہستی مافوق العدم ہے اور یہ ایسی صورت ہے جہاں تخیلات کی بھی گنجایش نہیں ہوتی۔

شعر۔۴ عرض کیجیے: بیان کیجئے۔ جوہر اندیشہ: سوچنے اور فکر کرنے کا جوہر۔ عرض وجوہر میں رعایت لفظی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنے جوہر اندیشہ کی گرمی کیا بیان کروں، کیونکہ وہ تو اس درجہ شدید ہے کہ صرف وحشت کا اندیشہ (خیال) ہی ہوا تھا کہ اس کی گرمی سے صحرا جل گیا۔ وحشت کی حالت میں صحرانوردی لازم آتی ہے لیکن خود میرے اندیشۂ وحشت میں اس بلا کی حدت تھی کہ اس میں میری جولانگاہِ وحشت ایک مشت خاکستر ہو کر رہ گئی۔

شعر۔۵ چراغاں، اس روشنی کو کہتے ہیں جو کسی جلسہ عام یا خوشی کے موقع پر کی جاتی ہے اور اس معروف معنی کے علاوہ زمانہ سلف کی ایک سزا کا نام بھی ہے جس میں ملزم کے سر میں چند گہرے زخم کردیے جاتے تھے اور ان میں موم بتی روشن کردی جاتی تھی۔ کارفرما کام لینے والا، حاکم۔ یہاں داغوں کی بہار کو چراغاں کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل ہی جو کہ داغوں کی بہار کا کارفرما تھا، نہیں رہا ورنہ اگر وہ ہوتا تو میں تجھ کو ان داغوں کی بہار دکھاتا۔

کارفرما سے مراد مخاطب بھی ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ اے کارفرما، میرا دل موجود نہیں ورنہ میں تم کو داغوں کی بہار دکھاتا۔ کیا کروں یہ چراغاں یعنی داغوں کی بہار اس کے گم ہوجانے سے ختم ہوگئی۔ مرزا کا ایک دوسرا شعر ہے:

دکھادوں گا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے   مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

شعر۔۶ تپاک، ظاہراً میل جول لیکن اصل میں گرم جوشی کو کہتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اب مجھے صرف افسردگی اور مایوس الحالی کی تمنا ہے اس لیے کہ میرے تمام ولولے اور جذبات دنیا والوں کی منافقت اور ریاکاری کی وجہ سے افسردہ ہوچکے ہیں۔ لہٰذا میری صرف یہ تمنا ہے کہ میرا رفیق وہمدم صرف میرا محزوں ومایوس دل ہو۔ افسردگی اور گرم جوشی میں تضاد ہے۔

ایک دوسرے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ دنیا والوں کی گرم جوشی، جو منافقانہ اور جھوٹی ہوتی ہے، اس کو دیکھ کر اس قدر اس سے نفرت پیدا ہوگئی ہے کہ میں اپنے دل میں کسی قسم کی گرم جوشی نہیں چاہتا بلکہ اس کے بجائے افسردگی کی آرزو رکھتا ہوں تاکہ یہ مضمون صفت مطلق میرے نزدیک نہ آنے پائے۔

شوقِ ہر رنگ، رقیبِ سرو ساماں نکلا   قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب   تیر بھی سینۂ بسمل سے پُرافشاں نکلا
بوے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل   جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا
دلِ حسرت زدہ، تھا مائدۂ لذتِ درد   کام یاروں کا بہ قدر لب و دنداں نکلا
تھی نو آموزِ فنا، ہمت دشوار پسند   سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالبؔ
آہ، جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

شعر۔۱ شوق، عشق۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ قیس کی تصویر ہمیشہ عریاں کھینچی جاتی ہے۔ رقیب، سروسامان، سروسامان کا دشمن، ہر رنگ، ہر حال میں۔ مطلب یہ ہے کہ عشق ہر حالت میں سروسامان کا دشمن ہے۔ عشق کے واسطے مال واسباب کی مطلق ضرورت نہیں۔ مجنوں کی مثال دیکھیے کہ اس کی تصویر تک بھی عریاں کھینچی جاتی ہے۔

شعر۔۲ مرزا صاحب نے خود ایک مکتوب میں اس شعر کے معنی بیان فرمائے ہیں۔ لکھتے ہیں ”یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نئی نکالی ہے، جیسا کہ اس شعر میں:

نہیں ذریعہ راحت جراحت پیکاں مجھے   وہ زخم تیغ ہے جس کو دل کشا کہیے

یعنی زخم تیر کی توہین بہ سبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین بہ سبب ایک طاق سا کھل جانے کے۔ زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی، یعنی زائل نہ کیا تنگی دل کو۔ پُرافشاں بمعنی بیتاب اور یہ لفظ تیر کے مناسب حال ہے۔ معنی یہ کہ تیر تنگی دِل کی داد کیا دیتا، وہ تو خود ضیق مقام سے گھبرا کر پُرافشاں اور سراسیمہ نکل گیا۔

شعر۔۳ اس شعر میں مرزا صاحب نے کیسی خوش اسلوبی سے مختلف چیزوں سے ایک متحدہ خاصیت اخذ کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خواہ پھولوں کی مہک ہو، خواہ عشاق کی فغاں ہو اور خواہ چراغ کا دھواں ہو، غرض کہ تمام چیزیں تیری ستم شعاریوں کے باعث تیری محفل سے پریشان نکلیں۔

شعر۔۴ مائدہ: دسترخوان۔ بقدر لب ودندان، بقدر استعداد وحیثیت۔ مطلب یہ ہے کہ میرا دل

حسرت زدہ (حسرتوں کا مارا ہوا) درد کی لذتوں کا ایک دسترخوان تھا، جس پر انواع و اقسام کے درد چنے ہوئے تھے۔ میرے دوستوں میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق ان لذات درد سے اپنا حصہ لیا۔

شعر۔۵ ”درس فنا“ نہایت مشکل سمجھا جاتا ہے، لیکن اے ہمت دشوار پسند، یہ تو بڑی مشکل ہوئی کہ نو آموزی ہی کی حالت میں اس کی آسانی تجھ پر کھل گئی اور اب تیرے طے کرنے کے لیے اس سے بھی زیادہ سخت مرحلہ درکار ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ میری ہمت دشوار پسند کے لیے فنا سے بالاتر کوئی مرتبہ چاہیے، کیونکہ فنا اسے ایک آسان مرحلہ ثابت ہوا۔“ (حسرت)

بعض نسخوں میں اے نو آموز فنا کی بجائے ہے نو آموز فنا“ اور ”تھی نو آموز فنا“ بھی ہے۔

شعر۔۶ مطلب یہ ہے کہ گریہ نے میرے دل میں ایک ایسا شور برپا کر رکھا ہے کہ آنسو کا جو قطرہ باہر نہ نکلا تھا اور اندر رہ گیا تھا، وہ اب طوفان ثابت ہوا۔

دھمکی میں مرگیا، جو نہ باب نبرد تھا   عشقِ نبرد پیشہ، طلب گارِ مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا   اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں   مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب   اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی، کشمکش اندوہ عشق کی   دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے   زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شعر۔۱ باب: لایق باب نبرد۔ لڑائی کے قابل یعنی مرد میدان عشق۔ عشق نبرد پیشہ عشق جو ہمت و شجاعت کا طلب گار ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص کہ مرد میدان عشق نہ تھا، وہ منزل عشق کی ابتدا ہی میں دشواریوں کی تاب نہ لا سکا۔ عشق نبرد پیشہ کو تو کسی مرد (بہادر شخص) کی تلاش تھی۔

شعر۔۲ قاعدہ ہے کہ فرط خوف سے اور ہنگامۂ نزع سے سب کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ شاعر کا

بیان ہے کہ مجھ کو اپنی زندگی میں موت کا خوف اس درجہ غالب تھا کہ اس کی وجہ سے چہرہ پر مردنی چھائی رہتی تھی۔

شعر۔۳ مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا۔ یعنی جبکہ میں ایک ناتجربہ کار بچہ تھا اور میرے خیالات غیر مربوط اور غیر مسلسل تھے چونکہ عہد طفلی میں خیالات میں پختگی اور تسلسل نہیں ہوتا اس لیے خیال کا فرد فرد ہونا کہا ہے۔ نسخہ ہائے وفا، غزلیات وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ میں بچپن ہی سے غزلیات و عشقیہ مضامین لکھنے کا عادی تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔

تازہ نہیں ہے نشۂ فکر سخن مجھے
تریاکی قدیم ہوں دودِ چراغ کا

عہد طفولیت یا ایام نو آموزی سے قطع نظر بھی کر لیا جائے، تو بھی اس شعر کا مفہوم مشرح اور واضح رہتا ہے۔ یعنی ابھی میں عشق حقیقی کی اصلی اور انتہائی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ مجھ پر دنیائے آب و گل کا رنگ غالب تھا اور میری محبت کا مرکز متعین نہیں ہو چکا تھا۔ حسن و عشق کے مظاہر مجازی میرے لیے جاذب نظر تھے۔ لیکن اب میں ان منتشر مساعی کو ایک مرکز پہ لا رہا تھا، یعنی معشوق حقیقی کی پرستاری کے لیے آمادہ ہو رہا تھا۔

حسرت صاحب اس کے معنی اس طرح بیان فرماتے ہیں ”یعنی ابتدا ہی سے میں بندۂ عشق وفا ہوں جب کہ خیالات میں پختگی اور جمعیت بھی نہیں آئی تھی۔“

شعر۔۴ گرد تھا، ہیچ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل تو دل سے لے کر جگر تک ایک دریائے خون ہے، لیکن کسی زمانہ میں اسی رہ گزر میں وہ بہاریں تھیں کہ اس کے آگے جلوہ گل بھی ہیچ نظر آتا تھا، یعنی آج کل تو ہمارا دل و جگر رنجیدہ و مغموم ہے، لیکن ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب یہی رشک صد بہار تھا۔

شعر۔۵ اندوہ، رنج و غم۔ شاعر کہتا ہے کہ اندوہِ عشق کی کشمکش سے کبھی نجات نہیں مل سکتی۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ دل ہی، کہ جس کے اندر یہ سب کشمکش ہے، جاتا رہے تو دل کے جانے کا غم پیدا ہو جائے گا، یعنی عشق کی کشمکش برابر قائم رہی۔ اگر عشق کے غم و حسرت کا گہوارہ دل جاتا رہا، تو اب یہ کشمکش ہے کہ دل جاتا رہا۔

شعر۔۶ چارہ سازی، علاج۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دوست میری وحشت کا کوئی علاج نہیں

کر سکے۔ اگر مجھ کو قید بھی کر لیا تو کیا۔ میرا خیال تو اس صورت میں بھی بیابان نورد تھا۔

شعر۔۷ مطلب صاف ہے۔ لاش کا بے کفن ہونا، اسد خستہ جان کی آزادی پر دال ہے۔

شمار سبحہ، مرغوب بتِ مشکل پسند آیا　　تماشائے بہ یک کف بُردن صد دل پسند آیا
بہ فیض بے دلی، نومیدیِ جاوید آساں ہے　　کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیر گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

شعر۔۱ شمار سبحہ۔ تسبیح کے دانوں کا شمار کرنا یعنی پڑھنا۔ بت مشکل پسند، معشوق جس کو کہ مشکلات مرغوب ہوں۔ مرغوب آیا، پسند آیا۔ بیک کف بردن صد دل، ایک ایک وار میں سو سو دل قابو میں کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو تسبیح کے دانوں کا شمار کرنا یا شغل تسبیح کرنا صرف اس وجہ سے پسند آیا ہے کہ اس میں سو دانے ہونے کی وجہ سے ایک وار میں سو سو دل پھانسنے کی مشابہت ہے، جن کو پھانسنا اس کا شعار ہے۔

شعر۔ ۲ ”یعنی دنیا کی طرف سے جو بے دلی اور بے دماغی ہے، اس کی بدولت صدمۂ نوامیدی و یاس کا اٹھا لینا ہم کو سہل ہے۔ ہم کو دنیا سے خود رغبت نہیں۔ کشود کار کی امیدی ہو تو کیا اور نا امیدی ہو جائے تو کیا۔ دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آ گیا۔ یعنی اب کبھی اس کی کشایش نہ ہوگی۔ اس سبب سے کہ کشایش کو اس کا عقدہ ہی رہنا پسند ہے اور پسند اس سبب سے ہے کہ ہمیں پروا نہیں۔ پھر ایسی بے نیازی کشایش کو کیوں نہ پسند آئے۔“ (طباطبائی)

حسرت صاحب اس شعر کے معنی یوں بیان فرماتے ہیں ”کشایش نے اپنا عمل کرنے کے لیے ہمارا عقدۂ مشکل (نومیدی جاوید) پسند کیا اور ہماری مشکل آسان ہو گئی، اس طور پر کہ ہم کو دنیا کی جانب سے جو بے دلی پیدا ہو گئی ہے، اس کے سبب سے صدمۂ نومیدیِ جاوید کا برداشت کرنا آسان ہو گیا، کیونکہ غایت بیدلی کی حالت میں امید اور نا امیدی یکساں ہو جاتی ہے۔“

شارحین نے دو مختلف معنی لکھے ہیں اور اختلاف صرف ”کشایش کو پسند آنے“ پر ہے، یعنی کشایش اگر ایسے عقدہ کو پسند کر لے تو وہ آسان ہو جائے گا یا نہیں۔ غالب کی ندرت خیالی اور

مشکل پسندی ملحوظ رکھتے ہوئے طباطبائی صاحب کے معنی صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی ہماری عقدہ کشائی نہ ہوگی۔

شعر۔۳ بسمل بخوں غلطیدہ، خون آلودہ دل۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو جو سیر گل کی خواہش ہے، اس سے اس کی بے مہری ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ اس کو سیر گل صرف اس غرض سے پسند ہے کہ گل کو سرخ ہونے کی بنا پر بسمل بخوں غلطیدہ سے مشابہت ہے۔

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا　　ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا　　یہ زمرد بھی حریفِ دم افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں　　وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزرگاہ خیالِ مے و ساغر ہی سہی　　گر نفس، جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی　　گوش، منت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے　　ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دم عیسیٰ نہ ہوا

شعر۔۱ یہ شعر لوگوں کے جھوٹے اور نمایشی اخلاق کی شکایت میں لکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لفظ ’وفا‘ لکھا اور بولا تو جاتا ہے، لوگ اس کو گھڑی گھڑی استعمال تو کرتے ہیں لیکن اس کے معنی کا ظہور نہیں ہوتا۔ کوئی شخص بھی اس کو حقیقی معنوں میں استعمال نہیں کرتا۔ پھر خالی استعمال سے کیا تسلّی ہو سکتی ہے۔ اس لیے یہ وہ لفظ ہے جسے کبھی معنی کا شرمندۂ احسان نہ ہونا پڑا۔ اور اصلی مفہوم کبھی ظاہر نہ ہوا۔ ظہور اس کے خلاف ہی ہوتا ہے۔ سعدی لکھتے ہیں:

یا وفا خود نبود در عالم
یا مگر کس دریں زمانہ نہ کرد

شعر۔۲ افعی: سانپ، اژدہا۔ کاکل۔ زلف، سر کے لٹکتے ہوئے بال۔ سبزۂ خط کو زمرد سے اور کاکل کو افعی سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گو کہ مشہور یہ ہے کہ سانپ عکس زمرد سے اندھا

ہو جاتا ہے، مگر یہ عجیب بات خلاف معمول دیکھنے میں آئی ہے کہ تیرا کاکل (سانپ) سبزۂ خط کے زمرد سے مغلوب نہیں ہوا، یعنی خط نکل آنے پر بھی تیری زلف بدستور دلوں کا شکار کیا کرتی ہے۔

شعر۔۳ میں نے چاہا تھا کہ میں مرجاؤں تا کہ اندوہ وفا سے نجات مل جائے، یعنی محبت کے نبھانے میں جن دقتوں اور تکلیفوں کا سامنا ہوتا ہے، ان سے گلوخلاصی حاصل کرلوں۔ لیکن محبوب کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس نے اس خیال سے کہ میرے مرجانے سے اس کی بدنامی ہوگی، ایک تازہ ستم ایجاد کیا اور مجھے مرنے سے باز رکھا۔ میری وفاشعاری یہ ہے کہ اس نئے ستم کو بھی بہ طیب خاطر منظور کرلیا۔

شعر۔۴ گزرگاہ: راستہ جادہ، راستہ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تقویٰ نہیں ہے تو رندی ہی سہی، یعنی کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے۔

شعر۔۵ منّت کش: احسان اٹھانے والا۔ گلبانگ، آواز۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تو (معشوق) مجھ سے وعدۂ (وصل) نہیں کرتا تو میں اس میں بھی خوش ہوں کیونکہ اس صورت میں (وعدۂ وصل کرنے سے) جو تیرا مجھ پر احسان ہوتا، میں اس سے بچ جاؤں گا۔

مرزا ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

درد منّت کشِ دوا نہ ہو
میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

شعر۔۶ محرومیِ قسمت: بدنصیبی۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنی بدنصیبی اور بےبسی کی کس سے شکایت کروں۔ میں تو ایسا بدقسمت ہوں کہ میں نے (تکلیف سے تنگ آکر) موت کی دعا مانگی تھی، (جو بغیر مانگے بھی مل جاتی ہے لیکن) وہ بھی مقبول نہیں ہوئی۔

شعر۔۷ اس شعر میں انتہائی ناتوانی کا اظہار کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ اعجاز تھا کہ آپ قم باذن اللہ کہہ کر مُردے کو زندہ کردیا کرتے تھے۔ اور آپ کے دَمِ مبارک سے بیماروں کو شفا ہوجاتی تھی۔ کچھ پڑھنے کے واسطے اپنے لبوں کو حرکت دینی پڑتی ہے۔ اسی خیال کو شاعر کے تخیل نے ایک نئے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میری ناتوانی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ لب ہلانے کا صدمہ ہی میرے مارڈالنے کو کافی ہوگیا۔ چنانچہ میں دمِ عیسیٰ سے مستفید نہ ہوسکا۔ مومن کا

بھی ایک شعر ہے۔

دعا بلا تھی شبِ ہجر میری جاں کے لیے   سخن بہا نہ ہوا مرگ ناگہاں کے لیے

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا   وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا
بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہاے مژگاں کا   کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا
نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کو   لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے   مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ، تیرے جلوے نے   کرے جو پرتوِ خورشید، عالم شبنمستاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی   ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشہ کر   مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں   چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا
ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے   دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ   سبب کیا، خواب میں آکر تبسم ہاے پنہاں کا
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا   قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

شعر۔۱ ستایش: تعریف، ستایش گر، مدح۔ باغ رضواں، بہشت۔ طاق نسیاں، وہ طاق جس میں کچھ رکھ کر بھول جائیں۔ بہشت کو گلدستۂ طاق نسیاں سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم بیخودوں کو ایسی دولت حاصل ہے جس کے سامنے بہشت کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ ہمارے بیخودی کے عالم میں بہشت کی حقیقت ایسی ہے، جیسے کہ اُس گلدستہ کی کہ جس کو طاق پر رکھ کر بھول گئے ہوں۔

شعر۔۲ مژگاں۔ پلک۔ مژگاں کو سوئی سے تشبیہ دی ہے۔ مرجاں، مونگا، اور یہ چونکہ سرخ ہوتا ہے اس لیے دانۂ تسبیح مرجاں کو قطرۂ خون سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مژگانِ یار کی کاوش کیا بیان

کروں۔ اس کی کاوشوں سے تو میرا ہر قطرۂ خونِ دل سفتہ ہو کر مونگے کی تسبیح کا دانہ بن گیا ہے۔

شعر۔۳ سطوت، رعب، دبدبہ، نیستاں، وہ جنگل جہاں بانس کے درخت پیدا ہوتے ہیں۔ نے بانسری۔ اس میں سے نالہ کی طرح آواز نکلتی ہے، مطلب یہ ہے کہ قاتل کے رعب سے میرا نالہ بند نہ ہو سکا۔ کیونکہ وہ تنکا جو کہ میں نے اظہار عجز کے واسطے دانتوں میں لیا تھا، وہ بھی نے بن کر نالہ کرنے لگا۔ دانتوں میں تنکا لینا ترجمہ ہے۔ فارسی محاورہ، ریشہ در دندان گرفتن بمعنی اظہار عجز کرنا۔

ہجومِ نالہ حیرت عاجز عرض ایک فغاں ہے   خموشی ریشۂ صد نیستاں ہے خس بدنداں ہے

شعر۔۴ داغِ دل کو غم اور اس کے نالۂ پُرشرر کو سرو چراغاں کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر زمانہ نے فرصت دی اور مجھ کو کوئی موقع ملا تو میں دکھا دوں گا کہ میرے ہر داغ دل کے بیچ سے ایک سرو چراغاں اُگے گا۔ یعنی ہر داغ سے اتنے نالہ ہائے پرشرر نکلیں گے کہ ان کی روشنی سے سرو چراغاں کا سماں بندھ جائے گا۔

شعر۔۵ شبنمستاں: وہ جگہ جہاں شبنم گری ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے کہ خورشید کے نکلنے پر شبنم غائب ہو جاتی ہے، اسی طرح سے تیرے جلوہ سے آئینہ کی جلا (جس کی وجہ سے اس میں عکس پڑتا ہے) اُڑ گئی۔ اس شعر میں معشوق کو خورشید سے شبنمستاں کو آئینہ خانہ سے اور آئینہ کی جِلا کو شبنم سے تشبیہ دی ہے۔

اس شعر کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جس طرح آفتاب کے طلوع ہونے سے شبنمستاں جگمگا اٹھتا ہے، اسی طرح آئینہ خانہ میں تیرے جلوہ کے عکس سے آب و تاب پیدا ہو گئی ہے۔

شعر۔۶ مطلب یہ ہے کہ ہماری تعمیر (خلق) ہی میں ہماری فنا کا راز مضمر ہے۔ یعنی ہمارا نیست ہونا ہی ہمارے فنا ہو جانے کا ثبوت ہے۔ جیسے کہ خرمن کا وجود میں آنا ہی اس کی غارت گری کا باعث ہے، کیونکہ نہ وہ وجود میں آتی اور نہ اس پر بجلی گرتی۔ گویا دہقان کا خونِ گرم ہی خرمن کے حق میں بجائے تعمیر کے ہیولیٰ برق کا کام دیتا ہے۔

نعمت خاں عالی نے اس مسئلہ کو اس طرح قلم بند کیا ہے

دار و نفسم آمد و رفت از پئے کشتن   ہر لحظہ بمن می کشد ایں تیغ دو دم را

طباطبائی صاحب نے اس کے معنی نہایت خوبی کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

”یعنی میں وہ دہقان ہوں جس کی سرگرمی خود اسی کے خرمن کے لیے برق کا کام کرتی ہے۔ یعنی خرمن کو جلائے ڈالتی ہے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حرارت غریزی، جو کہ باعث حیات ہے، خود وہی ہر وقت تحلیل و فنا بھی کر رہی ہے۔“

شعر۔۷ ویرانی تماشہ کر یعنی ویرانی دیکھیے۔ گھر میں گھاس اُگ آنا ویرانی کی علامت ہے کہ اس کا کوئی خبر گیر نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میرے گھر کی ویرانی ملاحظہ کیجیے کہ اس میں ہر سو سبزہ اُگا ہوا ہے اور اب دربان کا کام صرف گھاس کھودنے کا رہ گیا ہے۔ خودرو گھاس کو سبزۂ بیگانہ بھی کہتے ہیں۔ دربان کا کام تھا کہ وہ غیر شخص کو مکان میں آنے سے باز رکھے۔ لیکن اب ویرانی کا یہ عالم ہے کہ بجائے اس کے کہ کوئی شخص مکان میں آئے، ہر چہار طرف سبزہ اُگا ہے اور دربان کا صرف یہ فرض رہ گیا ہے کہ وہ اس سامان ویرانگی (سبزہ) کو دور کرے۔

شعر۔۸ خون گشتہ: خون ہوئی ہوئی۔ چراغ مردہ: بجھا ہوا چراغ۔ چراغ کی لو کو زبان سے تشبیہ دی ہے۔ چونکہ چراغ بجھا ہوا ہے اور اس میں لو نہیں، اس لیے اپنے آپ کو بے زبان بتا کر چراغ مردہ سے تشبیہ دی ہے۔ اسی طرح خون گشتہ آرزوؤں کو، گورِ غریباں سے مشابہت دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گور غریباں میں بجھے ہوئے چراغ کو دیکھ کر فوراً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ نہ معلوم مدفونین کی (جو کہ اس قدر بیکس ہیں کہ ان کی قبر پر کوئی چراغ جلانے والا بھی نہیں) کیسی کیسی آرزوؤں کا خون ہوا ہوگا۔ گویا اس کی خاموشی میں لاکھوں خون گشتہ آرزوئیں پنہاں ہیں۔ اسی طرح میری خاموشی اور بے زبانی میں لاکھوں خون گشتہ آرزوئیں پنہاں ہیں۔

شعر۔۹ اس شعر میں پرتوِ خیالِ یار کو حضرت یوسف علیہ السلام کے پرتو سے اور اپنے دل افسردہ کو بر بنائے تنگی حجرۂ زنداں کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی تک میں اپنے محبوب کو بالکل نہیں بھولا ہوں، بلکہ ابھی اس کی یاد کا ایک پرتو باقی ہے یعنی وہ کچھ کچھ یاد ہے۔ جس طریقہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کا پرتو ان کے حجرۂ زنداں میں رہ گیا تھا، اسی طرح میرے دل کے حجرہ میں بھی محبوب کے خیال کا پرتو باقی ہے۔

شعر۔۱۰ اس شعر کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ عاشق کو سوتا ہوا مراد کیا جائے اور

دوسرے یہ کہ معشوق کو سوتا ہوا مانا جائے۔ پہلی صورت میں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عاشق معشوق کو خواب میں ہنستا دیکھتا ہے اور چونکہ عشاق بہت ہی مشکوک خاطر ہوتے ہیں، اس لیے اس نے یہی نتیجہ نکالا کہ اس (معشوق) کے ہنسنے کی وجہ یہی ہے کہ آج وہ غیر کی بغل میں محوِ خواب ہے۔ محبوب کو خواب میں ہنستے دیکھ کر غالب نے یہ شاعرانہ توجیہ کی ہے کہ وہ آغوشِ رقیب میں محوِ استراحت ہے اور یہ تبسم ہائے پنہاں اسی عالم کیف و سرور کے نتائج ہیں۔

دوسری حالت میں جیسا کہ مولانا طباطبائی صاحب لکھتے ہیں، اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ''رقیب کی بغل میں جو چپکے چپکے تو ہنس رہا ہے، مجھے وہ ہنسی خواب میں دکھائی دیتی ہے اور اسی ہنسی کا انداز دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ اس انداز کی ہنسی وصل ہی کے وقت ہوتی ہے۔ ورنہ تو میرے خواب میں آ کر میرے ساتھ تبسم پنہاں کرے، میرے ایسے نصیب کہاں۔'' لیکن یہ توجیہ قابل ترجیح نہیں۔

شعر۔ ۱۱ لہو پانی ہوا ہوگا، یعنی لہو پانی بن کر آنسوؤں کی راہ نکل گیا ہوگا، یعنی انتہائی کرب و مصیبت کا عالم رہا ہوگا۔ سرشک۔ آنسو۔ سرشک آلودہ۔ آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے غم میں معلوم نہیں کتنے حرماں نصیبوں کا خونِ جگر پانی (آنسو) بن کر آنکھ کے راستہ سے نکل گیا ہوگا، تب کہیں جا کر تیری مژگاں آنسوؤں سے نم ہوئی ہیں۔ یا یہ کہ تیری مژگاں کو سرشک آلود، دیکھ کر۔ معلوم نہیں کتنے عشاق کا لہو پانی ہوا ہوگا۔

شعر۔ ۱۲ جادہ: راستہ۔ جادۂ راہ فنا کو شیرازہ اس وجہ سے کہا گیا کہ تمام چیزیں فنا کے ایک رشتہ میں منسلک ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عالم موجودات کے تمام اجزا پریشان ہیں لیکن جو شیرازہ ان سب ''اجزائے پریشاں'' کو منسلک کیے ہوئے ہے، وہ ان کی صفت مشترک، یعنی فانی ہونا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ میں خیال کرتا ہوں (نظر میں ہے) یا میرے عقیدہ کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ یہ صرف اجزائے عالم کی صفت، فنا پر ٹھہری ہے، جو شیرازہ کی مانند اُن میں مشترک ہے اور ان کے اتصال کا باعث۔

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا   حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے   کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

شعر۔ ۱ یک بیاباں ماندگی۔ کثرت ماندگی، (تھکن) ذوق، شوقِ صحرانوردی۔ حباب، پانی کا بلبلہ۔ رفتار کو موج اور نقش قدم کو حباب سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کثرت ماندگی سے میرا ذوق صحرانوردی کم نہیں ہو سکتا۔ میرا نقش قدم موجۂ رفتار کا حباب بنا ہوا ہے کہ جس طریقہ سے کہ حباب کا ذوق رفتار کبھی کم نہیں ہوتا۔ بلکہ مٹ مٹ کر بھی ہر وقت موج کے ساتھ چلنے پر مستعد رہتا ہے۔ اسی طریقہ سے کثرت ماندگی سے میرا ذوق صحرانوردی بھی زائل نہیں ہو سکتا۔

شعر۔ ۲ ناک میں دم آنا، جی بیزار ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے تو مجھ کو چمن سے محبت تھی لیکن اب وفور عشق سے بے دماغی کا یہ حال ہے کہ بوئے گل سے بھی جی بیزار ہوتا ہے۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی   عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی   جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

شعر۔ ۱ سراپا رہن عشق، ہمہ تن مبتلائے عشق۔ ناگزیر ناچار، لاعلاج۔ بالضرور ناگزیر الفت ہستی یعنی (فطرتاً) محبت زِندگی بھی ناگزیر ہے۔ افسوس حاصل کا، یعنی خرمن کے نقصان کا (جو کہ بجلی کے پوجنے کا نتیجہ ہے)۔ مطلب یہ ہے کہ ادھر تو مبتلائے عشق ہوں، فنا کر دینا جس کا خاصہ ہے اور ادھر اپنی زندگی بھی عزیز ہے، جو کہ متقضائے فطرت ہے پس میری مثال اس دہقان کی سی ہے جو بجلی کو پوجتا بھی ہو اور برق کے گرنے سے خرمن کی بربادی پر متاسف بھی ہو۔

شعر۔ ۲ ظرف، حوصلہ۔ تشنہ کامی، پیاس۔ ساحل کی کجی کو اس کے خمیازہ (انگڑائی) سے تعبیر کیا ہے کیونکہ خمیازہ (طلب نشہ) کی حالت میں آدمی بھی ٹیڑھا بینگا ہوا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ساقی دریا کی سی حیثیت رکھتا ہے تو مجھ میں بھی ساحل کی سی استعداد ہے۔ میرا حوصلہ بھی اتنا بڑھا ہوا ہے کہ میں (شراب کے) دریا کے دریا پی سکتا ہوں۔ حاصل یہ کہ ساقی مجھ کو جتنی شراب پلا دے گا، میں اتنی ہی پینے کو تیار ہوں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے   یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز   میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں   طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا
ہیں، بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے   ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز   ناخن پہ قرض اس گرۂ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

شعر۔١ نوا، آواز، حجاب۔ اوٹ۔ پردہ۔ پردہ یعنی باجے کا جس میں سے راگ پیدا ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ راز کے نغموں سے تو ہی خود نا آشنا ہے، ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں، وہ بھی پردہ ساز کی طرح آمادہ ترنم ہیں اور اسرار الٰہی کی خبر دے رہے ہیں۔ عرفی شیرازی کا بھی ایک شعر ہے:

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ   ایں ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

شعر۔٢ رنگ شکستہ عاشق اور معشوق دونوں کی طرف منسوب ہو سکتا ہے۔ اگر عاشق کا رنگ شکستہ ہے تو وہ لکھتا ہے کہ میرا رنگ دیدنی ہے اور چونکہ اے محبوب، یہ تیری وجہ سے ہے، اس لیے تجھے اپنے اس کارنامہ پر ناز کرنا چاہیے۔

دوسری طرف رنگ شکستہ، معشوق کی طرف راجع ہے۔ عاشق کہتا ہے، محبوب تیرا یہ رنگ قابل دید ہے اور تجھے اپنے انداز محبوبی کو بر سر کار لانا چاہیے۔

شعر۔٣ مطلب یہ ہے کہ تو غیر کی طرف تیز تیز (خشم آلودہ) نگاہوں سے دیکھ رہا ہے مگر ہم اس سے بھی محروم ہیں، یعنی عاشق از راہ رشک اپنے معشوق کا رقیب کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا بلکہ یہی چاہتا ہے کہ وہ جو کچھ کرے، خواہ وہ غصہ ہی کیوں نہ ہو، سب اسی کے ساتھ کرے۔ کسی طریقہ سے بھی غیر کی مداخلت پسند نہیں۔

شعر۔۴ صرفہ، فائدہ، طعمہ، لقمہ، جانگداز۔ جاں کو پگھلانے والا۔ مطلب یہ ہے کہ آہ کے ضبط کرنے میں میرا فائدہ ہے، ورنہ میں تو نفس جانگداز کا ایک ہی لقمہ ہوں۔ یعنی ایک ہی آہ میں میرا کام تمام ہو جاوے گا۔

شعر۔۵ یعنی شراب میں اس قدر جوش ہے کہ اس کی وجہ سے شیشہائے شراب اچھل رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرش کا ہر کونہ کہ جس پر شیشہ رکھا ہوا ہے، شیشہ باز کا سر ہے۔

شعر۔٦ گرہ نیم باز یعنی دل جو پہلے بھی لذت کاوش سے بہرہ مند ہو چکا ہے مگر اچھی طرح نہیں۔ دل کی گرہ سے تشبیہ عام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا دل نیم، باز ناخن سے کاوش کا اس طرح تقاضہ کر رہا ہے، جیسے کہ گویا ناخن ابھی اس کا مقروض ہے۔

شعر۔٧ تاراج، لوٹنا۔ غارت کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ اسد کے سینہ کو، جس میں کہ بہت سے راز پوشیدہ تھے، کاوشِ غم ہجراں نے غارت کر دیا۔

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا   رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا
شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا   اس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا
گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب   آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا
گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید   پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا
ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال   خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا
منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں   زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا   جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
کیوں اندھیری ہے شب غم؟ ہے بلاؤں کا نزول   آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا
کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال   نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

شعر۔١ گنجینۂ گوہر، مراد بزم شہنشاہ (بہادر شاہ ظفر) مصرعہ ثانی دعائیہ ہے کہ الٰہی بزم شہنشاہ کے در کو ہمیشہ کھلا رکھیو یعنی آباد رکھیو۔ اور اس کا فیض جاری رکھیو۔

شعر۔٢ انجم رخشندہ، چمکتے ہوئے ستارے۔ اس تکلف سے، اس شان سے۔ ستاروں کو بت کدے میں جو چراغ روشن ہوتے ہیں، ان سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ رات

ہوئی اور ستارے چمکنے لگے۔

شعر۔۳ دشنہ۔ خنجر۔ جنوں میں فصد کھولنا مفید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ دیوانہ ہوں لیکن میں دھوکہ میں نہیں آسکتا۔ گو کہ ظاہرہ فصد کھولنے کے لیے نشتر رکھا ہے مگر اصل میں در پردہ آستین میں (میرے مار ڈالنے کے واسطے) خنجر چھپا ہوا ہے۔ دیوانہ بکار خود ہشیار۔

شعر۔۴ پری پیکر کھلا، معشوق بے تکلف ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ گو میں اس کی باتیں اور اس کا بھید نہ سمجھ سکوں مگر میرے لیے تو یہی بہت بڑی بات ہے کہ اس نے مجھ سے بے تکلفی سے باتیں کیں۔

شعر۔۵ مطلب یہ ہے کہ معشوق کے حسن کے تصور ہی میں وہ برکات خوبیاں ہیں جو حسن عمل (نیک کام کرنے) میں ہیں۔ منقول تو یہ ہے کہ صرف نیک کام کا ثمرہ بہشت ہے، مگر میری قبر میں تو میرے تصور حسن معشوق ہی کی وجہ سے بہشت کا دروازہ کھل گیا ہے۔ گویا خیال حسن معشوق اور حسن عمل ہم صفات ہیں۔

اس میں غالب نے ایک نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی میں توحید کا معتقد ہوں گو زندگی میں حسن عمل سے بے بہرہ رہا۔ اس وجہ سے قبر میں وہ برکات حاصل ہیں جو صرف ان روحوں کو حاصل ہوتی ہیں جنھوں نے دنیا میں نیک کام کیے ہیں۔

شعر۔۶ وہ عالم ہے، یعنی ایسی کیفیت طاری ہے، مطلب یہ ہے کہ معشوق کے منہ پر نقاب پڑا ہوا تھا تاہم ہم پر اس کے نادیدہ حسن کی ایسی کیفیت طاری تھی کہ ہم نے کبھی دیکھی ہی نہ تھی۔ گویا خود نقاب اس کے چہرہ پر اس کی زلف سے زیادہ زیب دیتا تھا۔

شعر۔۷ اس شعر میں معشوق کی شوخی کا اظہار کیا ہے کہ اول تو اس نے اپنے دروازہ پر رہنے کی اجازت دے دی، لیکن فوراً ہی جبکہ میں نے اپنا بستر (قیام کے واسطے) کھولا ہی تھا، وہ اپنی بات سے پھر گیا (یعنی مکر گیا)۔

شعر۔۸ اختر، ستارہ۔ مطلب یہ ہے کہ شب غم جو تاریک ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ بلائیں نازل ہو رہی ہیں، اس لیے ان کا تماشہ دیکھنے کی غرض یا خوفنا کی کی وجہ سے ستاروں نے اپنی آنکھیں سطح ارض کی طرف سے سے موڑ کر آسمان کی طرف کرلی ہیں۔

شعر۔۹ مرزا صاحب کو مسافرت میں وطن سے کئی لوگوں کے مرنے کی خبر پہنچی، تو انھوں نے یہ شعر کہا۔ غربت بمعنی مسافرت۔ حوادث جمع حادثہ کی۔ رواج ہے کہ موت کی خبر عموماً کھلے خط میں روانہ کیا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ کو مسافری میں کیونکر آرام مل سکتا ہے، جبکہ حوادث کا یہ حال ہے کہ اکثر خطوط میں جو کہ وطن سے آتے ہیں، موت اور رنج والم ہی کی خبریں لکھی ہوتی ہیں۔

شعر۔۱۰ معراج کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب کہ میں ایسے بزرگ اور مہتم بالشان ہستی یعنی حضرت رسول اللہ ﷺ کی امت میں ہوں جن کے لیے گنبد بے در (یعنی آسمان) کھل گیا اور جنھیں قرب باری تعالیٰ نصیب ہو، تو پھر میرے کام کیسے رک سکتے ہیں۔ کامیابی میرے لیے یقینی ہے۔

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوّالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا
واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یاں سرِ پُر شور بے خوابی سے تھا دیوار جُو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفان تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

شعر۔۱ زہرہ، پتہ، دلیری و شجاعت۔ زہرہ آب ہونا، ہیبت زدہ ہونا۔ پتہ پانی ہونا، جوّالہ کودنے والا، گردش کرنے والا۔ مطلب یہ ہے کہ رات کو میرے سوز دل کی بجلی میں یہ تاثیر تھی کہ اس کے اثر سے ابر کا پتہ پانی ہوا جاتا تھا اور اس پانی میں جو بھنور پڑتے تھے، وہ شعلۂ جوالہ معلوم ہوتے تھے۔

شعر۔۲ پنبۂ بالش، تکیہ کی روئی۔ کفِ سیلاب، سیلاب کے جھاگ۔ عناں گیر خرام۔ بالغ حرکت۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو کرم کرنے اور میرے گھر آنے میں عذرِ بارش حائل تھا۔ مگر یہاں میری یہ حالت تھی کہ (ان کے فراق میں) روتے روتے میرے گریہ سے ایسا سیلاب بہا کہ

میرے تکیہ کی روئی اس کا جھاگ معلوم ہوتی تھی۔ معشوق نے بارش کا تو بہانہ کیا لیکن میری حالت کو نہ دیکھا، جو اس کے نہ آنے سے زار ہو رہی تھی۔

ایک لطیف نکتہ اس شعر میں یہ بھی ہے کہ جو چیز (بارش) اس کے لیے مانع خرام تھی، وہ فی الحقیقت کوئی چیز نہ تھی۔ بلکہ یہ میرے ہی آنسوؤں کی جھڑی تھی جو اس کے فراق میں آنکھوں سے رواں تھی، اس لیے محبوب کو اسی وجہ سے آنا چاہیے تھا، نہ یہ کہ اس نے اپنا آنا اور بھی ملتوی کر دیا۔

شعر۔۳ خود آرائی، اپنا بناؤ سنگار۔ اس شعر میں لفظ تار میں ایہام ہے۔ موتی کی رعایت سے دوسرے مصرعہ میں (قطرہ) اشک لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ واں معشوق کو اپنے بناؤ سنگار کے واسطے موتی پرونے کا خیال تھا لیکن یہاں ہماری یہ حالت تھی کہ ہجومِ اشک سے تار نگہ بھی نہیں ملتا تھا۔ یعنی جس طریقہ سے زیادہ موتی پرونے سے دھاگہ چھپ جاتا ہے، اسی طریقہ سے میرے تار نظر میں اس کثرت سے آنسوؤں کے موتی پروئے گئے کہ تار نظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یعنی بند ہو گیا تھا خلاصہ یہ کہ ان کی تو آرائش میں گزرتی تھی، مگر ہمارا ان کے مارے روتے روتے یہ حال تھا کہ بینائی بھی جاتی رہی تھی۔

شعر۔۴ خوں ناب، صاف خون۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے یہاں اس کثرت سے گل بچھے ہوئے تھے کہ ان کے عکس سے نہر میں چراغاں معلوم ہوتا تھا۔ مگر ہمارے یہاں آنکھوں کی پلکوں سے برابر خون جاری تھا۔ پلکوں پر خون کے قطروں کو گل سے مشابہت دی ہے۔

شعر۔۵ دیوار جو۔ دیوار کا متلاشی (ٹکرانے کے واسطے) فرق، مانگ، سر۔ مطلب یہ ہے کہ میرا سرِ پُرشور، اس کے ہجر میں نیند نہ آنے کی وجہ سے دیوار کا متلاشی تھا مگر وہ (فرق ناز) کمخواب کے تکیہ کا سہارا لے کر سو رہا تھا۔ (یعنی میری حالت کی اس کو بالکل خبر نہ تھی) بیخوابی اور کمخواب کی رعایت ملحوظ رہے۔

شعر۔۶ یعنی یہاں تو ہماری یہ حالت تھی کہ ہماری تپش نفس (آہ) سے بزم بیخودی کی شمع روشن ہوتی تھی لیکن واں ان کی محفل میں گلوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے یہاں تو رنج والم کا سامنا تھا مگر معشوق گرمی محفل سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ احباب سے معشوق مراد ہے۔

شعر۔۷ موج رنگ کا طوفان تھا، یعنی وہاں طرح طرح سے رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں۔

سوختن کا باب تھا، یعنی مصدر سوختن گردانا جا رہا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ وہاں تو نئے نئے رنگ سے خوشیاں منائی جا رہی تھیں مگر یہاں ہم جلے جاتے تھے۔

شعر۔۸ اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا۔ اس طرح سے (جیسا کہ آیندہ غزل میں منظوم ہے)۔ سوز خواں، ہوا۔ کاوشِ ناخن، مراد کاوشِ غم۔ یہاں سے شاعر نے دوسری غزل کی طرف گریز کیا ہے۔

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر، گو بیتاب تھا
مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا
نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ، وقف بستر سنجاب تھا
کچھ نہ کی اپنے جنوں نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا
آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک، تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا
یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظار صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا
میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیل گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

شعر۔۱ سپند، کالے دانے کو کہتے ہیں جو نظر بد دور کرنے کے لیے جلاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ رات میرا نالہ اس قدر بے اثر تھا کہ میری تسکین کرنے کی بجائے اس نے باوجود اپنی بیتابی کے رقیب کی بزم وصل کے لیے سپند بن کر اس کی محفل کو نظر بد سے بچانے کی خدمت انجام دی۔

شعر۔۲ مقدم سیلاب، سیلاب کی آمد۔ نشاط آہنگ، مسرور، خوش۔ ساز صدائے آب، جلترنگ، باجا۔ مطلب یہ ہے کہ سیلاب جو کہ خانۂ عشق کے ڈبونے اور تباہ کرنے کی غرض سے آیا ہے، اس کے آنے سے (عاشق کا) دل کیسا کیسا مسرور ہے اور خانۂ عشق سے، جو کہ غرق آب ہے (بجائے رنج و اندوہ کی آواز کے) جلترنگ کے نغمے نکلتے ہیں، گویا عشاق اپنی تباہی اور خانہ بربادی کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ آہنگ اور صدائے آب کی رعایت ملحوظ رہے۔

شعر۔۳ خاکستر نشینی۔ خاک پر بیٹھنا۔ اندیشہ۔ خیال۔ سنجاب ایک جانور کا نام ہے جس کے پوست سے پوستین بناتے ہیں اور جس کا رنگ خاکی ہوتا ہے۔ اسی رعایت سے خاکستر نشینی کو وقف

بسترِ سنجاب کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں جن ایام میں خاک نشین تھا، مجھ کو اپنی قناعت کی وجہ سے اسی خاک نشینی میں اتنا آرام ملتا تھا کہ گویا میرا پہلوے خیال بسترِ سنجاب کے لیے وقف ہو گیا ہے۔ اس شعر میں شاعر نے اپنی قناعت پر اظہارِ امتنان کیا ہے کہ اپنی قناعت کی وجہ سے مجھ کو خاک پر بسترِ سنجاب کی مانند آرام پہنچتا تھا۔

شعر۔۴ کچھ نہ کی۔ کچھ نہ کر سکا۔ جنون نارسا۔ عشق ناتمام۔ روکش۔ مقابل۔ مطلب یہ ہے کہ میرے جنون نارسا سے کچھ نہ ہو سکا، یعنی چونکہ میرا عشق ناتمام تھا، اس لیے اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ورنہ اس دنیا کا ذرہ ذرہ خورشید عالمتاب کو شرماتا تھا۔ حاصل یہ ہے کہ یہ میری ہی ناقص محبت کا نتیجہ تھا کہ میں کچھ نہ کر سکا، ورنہ بساطِ فطرت کا ہر ذرہ اپنی عظمت و سطوت کے اعتبار سے آفتاب کا ہم پہلو تھا، اور میں اس سے نفع اندوز ہو سکتا تھا۔

شعر۔۵ باب، کتاب کا ایک حصہ، مراد۔ منبع، سرچشمہ۔ بابِ مہر و وفا، وہ باب جس میں مہر و وفا کا ذکر ہو۔ مطلب یہ ہے کہ معلوم نہیں کہ آج تجھ کو کیا ہو گیا ہے کہ اپنے اسیروں (شیدائیوں) کی طرف اتنی لاپروائی برت رہا ہے، حالانکہ کل تک تیرا دل مہر و وفا کا گہوارہ تھا۔

شعر۔۶ دیدۂ بے خواب۔ کھلی ہوئی آنکھیں جو نا آشنائے خواب ہوں۔ حلقہ دام کو دیدۂ بیخواب سے تشبیہ دی ہے کیونکہ دیدۂ بیخواب کی طرح حلقہ دام بھی کھلا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تو اپنے عاشق سے کیوں اتنا غافل ہو گیا۔ کیا تجھ کو وہ دن یاد نہیں رہا جبکہ تیرے دام کا ہر حلقہ انتظارِ صید (عاشق) میں ایک دیدۂ بیخواب بنا ہوا تھا، یعنی تو کسی نہ کسی عاشق کے شکار کے واسطے ہر وقت منتظر رہتا تھا۔

شعر۔۷ یعنی رات میں نے غالب کو روک ہی لیا، ورنہ تم دیکھتے کہ اس کے کثرتِ گریہ کی وجہ سے پانی کا ایسا طوفان آتا کہ آسمان اس پر جھاگ کی طرح تیرتا پھرتا۔

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب   خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو   توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں   جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال   ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ، غمِ روزگار تھا

شعر۔۱ ودیعت، امانت۔ ایک ایک قطرہ کا دینا پڑا حساب، یعنی جگر کا سارا خون ایک ایک قطرہ کر کے آنکھوں سے ٹپک گیا۔ مطلب یہ ہے کہ "آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے کہ گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مژگانِ یار کی امانت تھی اور ایک ایک قطرہ کا حساب اسی طرح دینا پڑے گا جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے۔" (یادگارِ غالب) یعنی بالفاظِ دیگر میرا خونِ جگر، مژگانِ یار کی امانت تھی، اس لیے مجھے قطرہ قطرہ کا حساب دینا پڑتا ہے یعنی سوائے مژگانِ یار کے کسی اور کی محبت میں خونِ جگر آنکھوں سے رواں نہیں کیا جا سکتا۔

شعر۔۲ ماتمِ یک شہرِ آرزو، ہزاروں آرزوؤں کے خون ہونے کا ماتم۔ یک شہرِ آرزو سے کثرتِ آرزو مراد ہے جیسے کہ "ایک بیابان ماندگی۔" تمثال دار، (تیری) تصویر رکھنے والا۔ مطلب یہ ہے کہ تو نے جو (میرے دل کے) آئینہ کو جس میں کہ تیری تصویر تھی، توڑ ڈالا تو میری سینکڑوں تمناؤں کا خون ہو گیا۔

شعر۔۳ ہوا، خواہش۔ اس لفظ میں ایہام ہے، رہ گزار یعنی رہگذارِ معشوق۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ میں نے سرِ رہگذارِ معشوق کی آرزو میں اپنی جان دی ہے۔ اس لیے میری نعش کو اس کی گلیوں میں گھسیٹتے پھرو تا کہ اسی طرح میری آرزو پوری ہو جائے۔

شعر۔۴ سراب، وہ ریت جو دور سے پانی کی طرح چمکتا ہوا اور پیاسے مسافر کو ایسا معلوم ہو کہ دریا بہہ رہا ہے۔ اس مناسبت سے موجِ سراب کہا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ وفا محض سراب کی مانند ہے کہ جس طریقے سے پیاسے مسافر، سراب سے دھوکہ کھا کر ہلاک ہو جاتے ہیں، اسی طرح اہلِ وفا وفا سے دھوکہ کھا کر تباہ ہو جاتے ہیں۔ گویا کہ دشتِ وفا کے سراب کا ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ، عشاقِ باوفا کا قاتل ہے۔

شعر۔۵ اس شعر کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ غمِ روزگار سے کثرتِ غم مراد لی جائے۔ یعنی غمِ عشق کم ہونے پر بھی بہت زیادہ تھا یا یہ کہ غمِ عشق کے کم ہونے پر تمام دنیا کا غم آ پڑا، اور ہم دنیا کے

طرح طرح کے جھگڑوں میں مبتلا ہو گئے، کیونکہ دوران عشق میں ان سب باتوں کو بھولے ہوئے تھے۔ اسی مضمون کا مرزا کا ایک دوسرا شعر بھی ہے۔

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگی شوق! کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ، از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرتِ قتل گہ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمک داں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

شعر۔۱ انساں ہونا، یعنی حقیقت میں انسان ہونا۔ بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان کام بھی دشوار ہے اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو کہ عین انسان ہے، اس کا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں بلکہ ایک شاعرانہ استدلال ہے جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا۔'' (یادگار غالب)

شعر۔۲ کاشانہ، جھونپڑا، چھوٹا گھر۔ یہ کلمہ تحقیر کا ہے۔ لفظ ٹپکنا گھر اور گریہ کی رعایت سے نہایت خوبی کے ساتھ لایا گیا ہے۔ چونکہ رونا پیٹنا ویرانی کی علامت ہے، اس لیے شاعر کہتا ہے کہ میرے گریہ کی یہ خواہش ہے کہ میں خانہ ویران ہو جاؤں، جیسا کہ اب بھی میرے در و دیوار سے ویرانی ٹپک رہی ہے۔

شعر۔۳ یعنی مجھ کو اپنی دیوانگی شوق (جنون عشق) پر افسوس آتا ہے کہ اس کے تقاضہ سے میں گھڑی گھڑی معشوق کے کوچہ کی طرف جاتا ہوں اور (نارسائی کی وجہ سے) حیران ہو کر چلا آتا ہوں۔

یہ شوق تھا کہ جنوں تھا کہ تیرے کوچہ میں
ہزار بار گئے ہم ہزار بار آئے

شعر۔۴ یعنی اس کا جلوہ حسن جو یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے دیکھو تو جوہر آئینہ بھی شوق تماشہ میں یہ چاہتا ہے کہ مژگاں (آنکھ) بن جائے اور اس کو دیکھے۔ آئینہ سے آئینہ فولادی مراد ہے اس لیے کہ جوہر صرف اسی میں ہوتے ہیں۔

شعر۔۵ عید نظارہ، وہ عید جس میں دیدار معشوق نصیب ہو۔ شمشیر عریاں کو ہلال سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقتل میں عشاق، شمشیرِ معشوق کو عریاں دیکھ کر عید نظارہ جیسی خوشیاں مناتے ہیں۔

شعر۔۶ بصد رنگ گلستاں ہونا، فرط مسرت سے باغ باغ ہونا۔ یہ شعر غالب کے مہملات میں سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شاعر اپنے محبوب کو مخاطب کر کے طنزاً کہتا ہے کہ اے محبوب تو خوش ہو کہ ہم نامراد مر گئے۔

شعر۔۷ پارۂ دل، دل کا ٹکڑا، یعنی خود دل۔ زخم تمنا کھانا، تمنا کا پورا ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ میری تمناؤں اور آرزوؤں کا جو خون ہوا ہے وہ میرے دل کے واسطے عین راحت ہے اور میرے زخم جگر کے لیے عرق نمکداں ہونا ایک خاص لذت کا باعث ہے (کیونکہ عشاق کو تکلیف ہی مرغوب ہے) دونوں مصرعوں میں فعلُ 'ہے' محذوف ہے۔

شعر۔۸ مطلب یہ ہے کہ افسوس جبکہ میرا کام تمام کر لیا، اس وقت اس نے جفا سے توبہ کی۔ کاش اس کو ذرا دیر پہلے ہی رحم آیا ہوتا۔ زود پشیماں کا استعمال طنزیہ ہے۔ حافظ شیرازی کا ایک شعر ہے:

آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

شعر۔۹ کیونکہ عشاق کا گریبان جنون عشق سے بار بار چاک ہوتا ہے۔

مولانا آزاد مرحوم ''آب حیات'' میں لکھتے ہیں ''مرزا صاحب کو ایک آفت ناگہانی کے سبب چند روز جیل خانہ میں اس طرح رہنا پڑا جیسے حضرت یوسف کو، زندان مصر میں، کپڑے میلے ہو گئے تھے۔ جوئیں پڑ گئیں تھیں۔ ایک دن بیٹھے ان میں سے جوئیں چن رہے تھے۔ ایک رئیس

وہاں عیادت کو پہنچے۔ پوچھا کیا حال ہے آپ نے یہ شعر پڑھا

ہم غمزدہ جس دن سے گرفتارِ بلا ہیں   کپڑوں میں جوئیں بخیہ کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن وہاں سے نکلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا کرتا وہیں پھاڑ پھینکا اور اس موقع پر یہ شعر پڑھا ”ہائے اس الخ۔“

شب، خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا   تامحیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا   جادہ اجزائے دو عالم کا شیرازہ تھا
مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے   خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن   دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا
نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ یک دیوانِ بے شیرازہ تھا

شعر۔۱ شوق ساقی، ساقی کی آمد کا شوق۔ رستخیز اندازہ۔ قیامت کی مانند۔ محیط بادہ، وہ خط کہ جہاں تک شراب بھری ہو۔ خمیازہ، انگڑائی۔ یہ شعر غالب کے مہملات میں سے ہے لیکن تاویل کو بہت کچھ گنجائش ہے۔ جو کچھ اس کے معنی ہو سکتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ رات کو ساقی کی آمد کے خمار شوق نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ہر چیز حتی کہ شراب تک بھی خمیازہ کش معلوم ہوتی تھی۔ گویا کہ شراب خانہ میں صورت خانہ خمیازہ کی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ ساقی کو مخاطب بھی کہہ سکتے ہیں یعنی شب خمار شوق اے ساقی رستخیز اندازہ تھا......

شعر۔۲ دو عالم دشت، اضافت مقلوبی ہے یعنی دشت دو عالم۔ دونوں عالم کو وحشت کی رعایت سے ایک دشت قرار دیا ہے اور مصرعہ اول میں دشت دو عالم کو درس کی رعایت سے دفتر کہا ہے۔ جادہ جادۂ وحشت۔ مطلب یہ ہے کہ جادۂ وحشت پر جو کہ دشت دو عالم میں سے ہو کر گزر رہا تھا، تھوڑی سی دور چلنے سے دونوں عالم کے راز اس طرح فاش ہو گئے کہ گویا وہ (جادۂ وحشت) ایک شیرازہ تھا کہ اس میں وہ سب منسلک تھے۔ حاصل یہ کہ اسرار الٰہی کو بذریعہ عقل دریافت نہیں کر سکتے بلکہ ان کا پتہ جب ہی چل سکتا ہے جب کہ نشۂ معرفت میں سرشار ہو کہ عقل و شعور سے

دست بردار ہو جائیں۔

شعر۔۳ مجنوں کو صحرا گرد دیکھ کر اس کے گھر کا پتہ دیا ہے۔ یعنی اس کا گھر تو صحرا تھا جس میں کہ کوئی دروازہ نہیں ہوتا، جو کہ واردان کے واسطے حائل ہو۔ تو پھر بہ تقاضائے وحشت، لیلیٰ وہاں کیوں نہیں جا سکی۔

شعر۔۴ استغنا۔ لاپروائی۔ حنا، مہندی، غازہ۔ گلگونہ ایک قسم کی سرخی ہوتی ہے جو عورتیں اپنے منہ پر ملتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ استغنائے حسن کے معنی یہ تھے کہ اس کو کسی دوسری چیز کی حاجت نہ ہوتی۔ یہ جو معشوق نے حنا اور غازہ ہاتھ اور منہ پر لگائے ہیں، اس سے اس کا استغنائے حسن ثابت نہیں ہوتا بلکہ ان چیزوں کا استعمال اس کے استغنائے حسن پر ایک دھبہ ہے اور موجب رسوائی ہے۔

شعر۔۵ دیے اوراق دل بہ باد، یعنی اوراق دل پریشان کر دیے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے نالۂ دل نے میرے دل کے اوراق کو پریشان کر دیا ہے اور یہی دیوان بے شیرازہ، یعنی دلِ پریشان میرے نالہ کی یادگار ہے۔ دل پریشان کو دیوان بے شیرازہ (وہ دیوان ہے کہ جس کی جلد ٹوٹ گئی ہو اور اوراق منتشر ہو گئے ہوں) سے تشبیہ دی ہے۔

مرزا صاحب، چودھری عبدالغفور خاں صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”بندہ پرور میرا کلام کیا نظم کیا نثر کیا اردو کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو (غدر میں) ان کے لاکھوں روپے کے گھر لٹ گئے جن میں ہزاروں روپے کے کتب خانہ بھی گئے۔ اس میں مجموعہ ہائے پریشان بھی غارت ہوئے ہیں۔ میں خود اس مثنوی کے واسطے خون و جگر ہو رہا ہوں۔ ہائے وہ کیا چیز تھی“۔ اس واقعہ کو اس شعر کے مضمون کی بنا ٹھہراتے ہوئے مولوی محمد مہدی صاحب نے رسالہ اردو میں اس شعر کے معنی یوں بیان فرمائے ہیں۔

”شاعری کی یادگار ایک دیوان بے شیرازہ (اوراق لخت دل) تھا، جسے خود اس نے برباد کر دیا۔“

دوست، غم خواری میں میری سعی فرماویں گے کیا   زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک   ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماویں گے کیا
حضرتِ ناصح گر آویں دیدہ و دل فرشِ راہ   کوئی مجھ کو یہ تو سمجھادو کہ سمجھاویں گے کیا
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں   عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی   یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں   ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبراویں گے کیا
ہے اب اس معمورے میں قحطِ غم الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھاویں گے کیا

شعر۔۱ یعنی دوست کتنی ہی کوشش کریں مگر میری تکلیف دور نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے جو میرے ناخن کاٹ دیے ہیں، اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ کیونکہ جب تک کہ زخم بھرے گا، اس وقت تک میرے ناخن پھر نکل آئیں گے اور میں (جنون سے) پھر زخم کو کرید ڈالوں گا۔

شعر۔۲ شاعر معشوق سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ تمھاری بے توجہی حد سے گزر گئی کہ تم میرا حال دل کبھی متوجہ ہوکر نہیں سنتے۔ میں تو اپنا حال دل بیان کرتا ہوں اور آپ تجاہل عارفانہ سے فرماتے ہیں کہ کیا، یعنی کیا فرمایا۔ بندہ پرور آخر یہ باتیں کب تک قائم رہیں گی؟ یہ تو حد سے زیادہ بے نیازی ہے۔

شعر۔۳ دیدہ و دل فرش راہ۔ یہ ایک محاورہ ہے بمعنی نہایت عزت و گرم جوشی کے ساتھ استقبال کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حضرت ناصح آنا چاہتے ہیں تو نہایت شوق سے آئیں۔ لیکن ان کا آنا بالکل عبث اور بے سود ہے، کیونکہ میرا عشق تو ایک ایسے درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ جہاں ان نصیحتوں اور بازداشتوں سے مطلقاً کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا (تو پھر ان کے آنے اور نصیحت کرنے سے کیا فائدہ)

شعر۔۴ یعنی جبکہ تیغ و کفن ہر دو چیزیں موجود ہوں گی تو میرے قتل کرنے میں کوئی عذر نہ کر سکیں گے۔

منم آں سیر ز جاں گشتہ کہ با تیغ و کفن   با در خانۂ جلّاد غزلخواں رفتم

شعر۔۵ یعنی اگر ناصح نے قید کر دیا ہے تو کرنے دو۔ کہیں ایسا کرنے سے جنون عشق جاتا ہے۔

مرزا صاحب کو چوسر اور شطرنج کی بہت عادت تھی۔ اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ شرط باندھ کر کھیلتے تھے۔ کوتوال شہر کو چونکہ مرزا صاحب سے کچھ رنجش تھی، اس لیے مرزا صاحب کو اسی گناہ میں قید کروادیا۔ غالباً اسی واقعہ پر مرزا صاحب نے یہ شعر لکھا ہے۔

شعر۔۶ اس شعر میں فاعل 'ہم' محذوف ہے مطلب صاف ہے۔

شعر۔۷ معمورہ۔ بستی مجازاً دہلی۔ مطلب یہ ہے کہ جبکہ دہلی میں غم الفت کا قحط ہے (یعنی جبکہ معشوقوں کی کمی ہے) تو پھر اس میں ہم کیسے رہ سکتے ہیں کیونکہ غم الفت ہی ہماری خوراک اور ہماری زندگی ہے اور جب غم ہی کھانے کو نہیں تو ہمارا دہلی میں رہنا محال ہے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا   اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا   کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا   کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر اُستوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو   یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح   کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا   جسے غم سمجھ رہے ہو، اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے   غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے   مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ہوے مر کے، جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا؟   نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا   جو دوئی کہ بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا
یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان، غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

شعر۔۱ یعنی ہماری قسمت میں ہی وصال یار نہ لکھا تھا۔ اچھا ہوا کہ موت آ کر نجات تو مل گئی ورنہ اگر زندگی اور باقی ہوتی تو وہ بھی اسی انتظار (معشوق) میں بسر ہوتی۔

شعر۔۲ تو یہ جان جھوٹ جانا یعنی تو یہ سمجھ کہ ہم نے (تیرے وعدہ) کو جھوٹا سمجھا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تیرے وعدہ کرنے پر ہم زندہ رہے، تو تجھ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم نے تیرا اعتبار ہی نہیں کیا کیونکہ اگر ہم اس کو سچ سمجھتے تو مارے خوشی کے مر جاتے اور شادی مرگ ہو جاتی۔

شعر۔۳ نازکی، نزاکت۔ جانا، یعنی ہم نے جان لیا۔ مطلب یہ ہے کہ تیرا عہد بودا (کمزور) بندھا تھا ورنہ اگر وہ مضبوط ہوتا تو تجھ جیسا نازک شخص کبھی بھی اس کو نہیں توڑ سکتا تھا، پس تیری عہد کی کمزوری تیری نزاکت ہی سے ظاہر ہے۔

شعر۔۴ تیر نیمکش۔ وہ تیر جس کے چھوڑنے کے لیے کمان پوری نہ کھینچی گئی ہو۔ مراد تیر مژگاں۔ معشوق نیم کش اس لحاظ سے کہ معشوق نے ترچھی چرائی ہوئی نظر سے دیکھا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ تیری مژگان کے تیر نیمکش کی (جو کہ میرے جگر میں اٹک کر رہ گیا تھا) لذت کوئی میرے دل سے پوچھے۔ کیوں کہ اس کے اٹکے رہنے سے تو ایک عجیب لطف پیدا ہو گیا ہے۔ اگر وہ جگر کے پار ہو جاتا تو یہ لطف خلش باقی نہ رہتا۔ چونکہ عشاق کو جتنی تکلیف زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی لطف آتا ہے، اس لیے جگر میں رہ جانے والے تیر کو پار ہو جانے والے تیر پر ترجیح دی ہے۔

شعر۔۵ یعنی دوستی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ (عشق سے باز رہنے کی) نصیحت ہی کی جاوے، بلکہ میرے دوستوں کو یہ چاہیے تھا کہ میری تکلیف کے دور کرنے کو (معشوق سے رسائی ہونے) میں مدد کرتے۔

شعر۔۶ یعنی اگر کسی طرح عاشق کا غم (عشق) پتھر میں شرار (چنگاری) بن کر نہاں ہوتا تو اس کی رگوں سے بھی ہمیشہ خون ٹپکتا رہتا۔ مطلب یہ کہ پتھر جیسی سخت چیز بھی غم عاشق کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

شعر۔۷ یعنی غم اگرچہ جان گھلانے والا ہے، لیکن اس سے رہائی بھی دشوار ہے کیونکہ اگر ان کو غم عشق نہ ہوتا تو ہمارا دل غم دنیا میں مبتلا ہو جاتا۔ غرض کسی طرح غم سے نجات مل جاتی۔

شعر۔۸ یعنی شبِ غم بہت بُری بلا ہے۔ میں کس کس کے سامنے اس کا رونا روؤں۔ اس گھڑی گھڑی کی تکلیف سے تو یہ بہتر تھا کہ ایک مرتبہ موت ہی آجاتی تا کہ نجات مل جاتی۔ اسی مضمون کا ایک اور بھی شعر ہے۔

یہ سسک سسک کے مرنا غم ہجر میں ستم ہے   کوئی ظلم مجھ پہ ہوتا مگر ایک بار ہوتا

شعر۔۹ یعنی میرے مرنے کے بعد چونکہ نہ کوئی جنازہ اٹھانے والا تھا اور نہ کسی کو میرے مزار کا خیال تھا تو اس وجہ سے جو میری رسوائی ہوئی اور دنیا کو میری لاوارثی اور بے کسی کا پتہ چلا۔ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ کاش میں کہیں دریا ہی میں ڈوب جاتا تا کہ یہ صورت ہی پیش نہ آتی۔ اور میری رسوائی نہ ہوتی۔

شعر۔۱۰ دوچار ہوتا، دکھائی دیتا۔ مرزا صاحب نے اس شعر میں شاعرانہ اور فلسفیانہ دونوں حیثیتوں سے مسئلہ وحدت خداوندی کو نہایت صاف صاف ظاہر کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خدا ہر لحاظ اور ہر حیثیت سے یکتا و بے مثل اور بے چون و چگوں ہے۔ اس لیے اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا وگرنہ اگر اس میں دوئی کا شائبہ ہوتا، تو ضرور کہیں نہ کہیں دکھائی دیتا۔ مظاہر اور نوا میں فطرت میں ہر جگہ یکسوئی اور یکسانیت ہے۔ تنقیص اور تضاد نہیں پایا جاتا۔ یہی فاعلیت کی یکتائی کی دلیل ہے۔

شعر۔۱۱ یعنی غالب تو نے ان مسائل تصوف کو اس خوبی سے بیان کیا ہے، کہ اگر تو شراب خوار نہ ہوتا تو تجھ کو ہم ولی سمجھتے۔

کہتے ہیں کہ جب بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے یہ مقطع سنا تو فرمایا کہ ”بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے“۔ اس پر مرزا نے فوراً کہا۔ ”حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں، یہ اس لیے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔“

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا   نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا   کہاں تک اے سراپا ناز، کیا کیا
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں   شکایت ہائے رنگیں کا گِلا کیا
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں   تغافل ہائے تمکیں آزما کیا
فروغِ شعلۂ خس، یک نفس ہے   ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا
نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے   تغافل ہائے ساقی کا گِلا کیا
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے   غمِ آوارگی ہائے صبا کیا
دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر   ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
محابا کیا ہے، میں ضامن ادھر دیکھ   شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا
سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن   شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ ۔ شکیبِ خاطر عاشق بھلا کیا
یہ، قاتل، وعدۂ صبر آزما کیوں یہ، کافر، فتنۂ طاقت ربا کیا

بلائے جاں سے غالب اس کی ہر بات
عبادت کیا اشارت کیا ادا کیا

شعر۔۱ نشاط کے معنی امنگ کے ہیں۔ نشاط کار یعنی کام کرنے کی امنگ۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے، اسی قدر کام میں زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے۔ پس اگر موت نہ آیا کرتی اور ابدالاباد تک زندہ رہنا ہوتا تو جینے میں کوئی مزہ نہیں آتا۔ کیونکہ نہ تو یہ جوش و سرگرمی ہوتی اور نہ دنیا میں یہ چہل پہل نظر آتی۔ (یادگارِ غالب)

شعر۔۲ تجاہل پیشگی، تجاہل شعاری۔ مطلب یہ ہے کہ تجاہل (عارفانہ) کرنے سے آخر تمھارا کیا مطلب ہے۔ اے سراپا ناز (معشوق) تم کب تک میرا حال سن کر کیا کیا کروگے؟

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

شعر۔۳ نوازشہائے بیجا، اغیار پر مہربانی۔ شکایت ہائے رنگیں، وہ شکایتیں جو بطور محبت ادا کی جاویں۔ عاشق معشوق سے خطاب کرتا ہے کہ تم میری شکایت ہائے رنگیں کا کیوں گلہ کرتے ہو جبکہ رقیب کے ساتھ تمھاری اس قدر بیجا عنایتیں ہیں۔

شعر۔۴ نگاہ بے محابا۔ نگاہ بے تکلف و بے حجاب۔ تغافل تمکین آزما، چشم پوشی جو کہ صبر آزمانے کی غرض سے کی جاوے۔ مطلب یہ ہے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ بے تکلفانہ و بے محابانہ میری طرف دیکھیں۔ میرا صبر آزمانے کے لیے چشم پوشی کیسی؟

شعر۔۵ ہوس، عشق کاذب اور چونکہ یہ ناپائیدار ہوتا ہے اس لیے اس کو شعلۂ خس سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رقیب بوالہوس کی جھوٹی محبت، شعلۂ خس کی طرح ایک دم میں فنا ہو جانے والی ہے۔ بھلا اس بوالہوس کو ناموس وفا کا کیا خیال ہوسکتا ہے (یعنی اس سے ہرگز وفا نہیں ہوسکتی)۔ یہ شعر رقیب پر طنزاً کہا ہے۔

ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے اس کی وفا کچھ بھی نہیں چار دن کی چاندنی ہے اور کیا کچھ بھی نہیں

شعر۔۶ یعنی اگر ساقی نے شراب پلانے میں تغافل کیا (یعنی شراب نہ پلائی) تو ہم کو اس کی کوئی شکایت نہیں۔ کیونکہ ہم تو (صرف صورت ہی دیکھ کر یا بوجہ عشق کے) اس درجہ بے خود ہوگئے ہیں کہ گویا ہمارا ہر سانس بحر بیخودی کی ایک موج بنا ہوا ہے۔ پس جب ہم کو بغیر شراب کے ہی اس درجہ بیخودی حاصل ہے، تو پھر شراب نہ ملنے کی شکایت کیسی۔ کیونکہ شراب کا جو مقصد تھا، حل ہوگیا۔

شعر۔۷ عطر پیراہن، یعنی عطر پیراہن یار۔ مطلب یہ ہے کہ اگر صبا پیراہن یار کی خوشبو پریشان کر رہی ہے تو کیا کرے، ہم کو کیا غم ہے کیونکہ ہم کو تو اس کے سونگھنے کا دماغ ہی نہیں۔ ہماری بلا سے کچھ ہی ہو۔

شعر۔۸ انا البحر، میں دریا ہوں۔ ہمارا پوچھنا کیا، یعنی ہم بہت بڑی چیز ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر قطرہ کا دل ایک ساز (باجا) بنا ہوا ہے جس سے انا البحر کی آواز نکلتی ہے یعنی چونکہ پانی کا ہر قطرہ دریا میں مل کر دریا بن جاتا ہے، اس وجہ سے ہر قطرہ دریا ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اسی طرح ہم کو بھی اپنے مبدا کے ساتھ عینیت کا دعویٰ ہے، وہ دریا ہے اور ہم اس کے قطرے ہیں۔ پس جب ہم واجب الوجود کی عین ذات بن گئے تو پھر ہمارا پوچھنا کیا ہے۔ یہ وہی منصوری خیال ہے۔

شعر۔۹ محابا۔ خوف۔ مطلب یہ ہے کہ تو بے محابا و بے خوف میری طرف دیکھ۔ اگر تیرے، میری طرف دیکھنے سے میرا خون ہو جاوے گا تو میں ضامن ہوں کہ تجھ سے کچھ بھی خوں بہا (تاوان) نہ لیا جاوے گا۔ کیونکہ قتیل نگاہ کا خوں بہا کیا۔ اگر تلوار سے قتل کرتا تو البتہ مجرم تھا۔ شیفتہ مرحوم لکھتے ہیں:

فنائے عاشقاں عینِ بقا ہے دیت زنداں کی کیسی خوں بہا کیا

شعر۔۱۰ جنس وفا یعنی عشاق۔ غارت گر جنس وفا، معشوق لوگ۔ شکستِ قیمتِ دل۔ مراد شکستِ دل۔ مطلب یہ ہے کہ اے معشوق سن تو جو یہ کہتا ہے کہ شکست دل کی آواز نہیں سنی، اس لیے تجھ کو اس کی شکستگی کی خبر نہیں۔ کیا کہیں شکست دل میں بھی آواز ہوتی ہے، جو تجھے سنائی دیتی۔ اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ اگر تجھ کو شکست دل کی صدا اچھی معلوم ہوتی ہے تو تو میری دل شکنی کرنے اور اس کی صدا سننے میں ہرگز دریغ نہ کر، کیونکہ میں تیری دلجوئی کے مقابلہ میں شکست دل کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔

شعر۔۱۱ جگرداری، استقلال، صبر۔ مطلب یہ ہے کہ صبر واستقلال کا کس نے دعویٰ کیا ہے (یعنی کسی نے نہیں کیا)۔ بھلا عاشق، کا صبر (معشوق کے مقابلہ میں) حقیقت ہی کیا رکھتا ہے یعنی بالکل ناچیز ہے حاصل یہ کہ عاشق معشوق کے روبرو صبر واستقلال قائم رکھنے کا ہرگز دعویٰ نہیں کرسکتا۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں:

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا   کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

شعر۔۱۲ قاتل اور کافر دونوں صفات معشوق میں ہیں۔ شاعر اپنے معشوق سے کہتا ہے کہ اے ظالم معشوق تو ایسا وعدہ کیوں کرتا ہے جس میں مجھ کو صبر کرنا پڑے۔ تیرے نزدیک تو یہ وعدہ صبر آزما ٹھہرا۔ (یعنی ایک معمولی سی بات ہے) لیکن میرے نزدیک تو یہ فتنۂ طاقت رہا (طاقت زائل کرنے والا) ہے۔

شعر۔۱۳ مطلب صاف ہے

درخور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تیری یکتائی کا
رو برو کوئی بت آئنہ سیما نہ ہوا

کم نہیں نازشِ ہم نامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار، بُرا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے، وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

نام کا میرے ہے، جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ہر بنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

شعر۔۱ درخور قہر وغضب، معشوق کا قہر وغضب برداشت کرنے کے قابل۔ مطلب یہ ہے کہ جب کہ کوئی ہماری طرح معشوق کے غصہ کو برداشت نہیں کرتا تو پھر اگر ہم اپنے آپ کو لاثانی خیال

کریں تو بالکل بجا ہے۔

شعر۔۲ خودبیں، وہ شخص جو کہ اپنی بات کے مقابلہ میں دوسروں کی بات کو ہرگز پسند نہ کرے۔ وا، کھلا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ میری آزادی اور خود بینی کی یہ حالت ہے کہ اگر کعبہ شریف بھی جاؤں اور اس کا دروازہ بند پاؤں تو واپس چلا آؤں گا۔ اس شعر میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ اس میں شاعر نے اپنی آزادگی اور خود بینی کے پردے میں کعبہ کی عظمت و بزرگی دکھائی ہے کہ وہ ایسی رفیع بارگاہ ہے کہ اس کا دروازہ کبھی بند ہی نہیں ہوتا۔

شعر۔۳ سیما، پیشانی۔ روبرو، مقابل۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی آئینہ سیما تیرے مقابلہ پر نہ آیا، بلکہ سب نے تیرے حسن یکتا کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

شعر۔۴ چشم خوباں کو بیمار باندھتے ہیں۔ پس مطلب یہ ہے کہ تیرا بیمار اچھا نہ ہو تو کیا حرج ہے کیونکہ اس کو بیمار ہونے میں تو تیری چشم کی ہمنامی کا فخر حاصل ہے۔

شعر۔۵ سینہ کا داغ یعنی تنگِ سینہ ہے۔ خاک کا رزق ہے، یعنی خاک میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے وہ قطرہ جو کہ دریا تک نہیں پہنچتا، مٹی میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے اور اس سے مٹی پر ایک داغ کی سی صورت بن جاتی ہے۔ اسی طریقہ سے جو نالہ میرے لب تک نہیں پہنچتا، وہ ضبط کرنے سے میرے سینہ کا داغ بن جاتا ہے۔

شعر۔۶ میرے نام کا، میرے حصہ کا۔ مطلب یہ ہے کہ سخت سے سخت تکلیف میری قسمت میں لکھی تھی۔ دوسرا مصرعہ صاف ہے۔

شعر۔۷ نہ ٹپکے، یعنی ضرور ٹپکے۔ بن مو، بال کی جڑ۔ دم ذکر، ذکر کرتے وقت۔ مطلب یہ ہے کہ عشق کا ذکر کرتے وقت یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کی المناک داستان کو سن کر ہر بال کی جڑ سے خون ناب نہ ٹپکنے لگے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو گویا افسانۂ عشق اور قصہ امیر حمزہ میں کوئی فرق ہی نہ رہا۔

شعر۔۸ عارف کی دیدۂ بینا کی تعریف کرتے ہیں کہ وہ لڑکوں کا کھیل نہیں ہے کہ اس کو قطرہ میں دریا اور جزو میں کل دکھائی نہ دے۔

شعر۔۹ اڑیں گے پرزے۔ یعنی خوب سزا دی جاوے گی۔ تماشہ نہ ہوا۔ سزا نہیں دی گئی۔

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سرپنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

شعر۔۱ جنوں جولاں، جنون رکھنے والا۔ جولاں، (کودنا)۔ سرپنجۂ مژگانِ آہو کو پشت خار سے تشبیہ دے کر اپنی وحشت اور بے سروسامانی کا اظہار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ میں اتنی وحشت ہے اور میں ایسا گدائے بے سروپا ہوں کہ میرے پاس پشت خار تک نہیں اور میں پشت خار کا کام سرپنجۂ مژگانِ آہو سے لیتا ہوں۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ عالم وحشت میں رم کرکے میں آہو سے بھی آگے نکل جاتا ہوں اور آہو کی آنکھیں اس طور پر میرے لیے پشت خار کا کام دیتی ہیں۔

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا
نہ ہو حسنِ تماشہ دوست رسوا بے وفائی کا
نہ مہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
زکوٰۃ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو۔ کاسہ گدائی کا
نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا
تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا
وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ، باعث ہے میری رنگیں نوائی کا
دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو، زنجیرِ رسوائی
عدم تک، بے وفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا
نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

شعر۔۱ پئے نذر کرم، درگاہ کریم میں نظر گزارنے کے لیے۔ شرم نارسائی کا، شرم نارسائی کی طرف سے۔ صد رنگ۔ سینکڑوں طرح سے۔ مطلب یہ ہے کہ خداوند کریم کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لیے میری شرم نارسائی (نارسا ہونے کی شرم) کی طرف سے جو تحفہ ہے، وہ میری پرہیزگاری کا دعویٰ ہے، جس کا سینکڑوں طرح (کے گناہوں کے ہاتھ) خون ہو چکا ہے۔

شعر۔۲ حسن تماشہ دوست، وہ حسن جو کہ اپنی نمایش کو پسند کرے۔ رسوا بیوفائی کا یعنی رسوائے بے وفا۔ مطلب یہ ہے کہ جو یہ خواہش ہے کہ لوگ اس کے حسن کو دیکھیں تو اس پر اس نمایشِ حسن

کی وجہ سے عاشق سے بے وفائی کرنے کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس کے دیکھنے والوں کی سینکڑوں نظریں گویا مہریں ہیں جو اس کے دعویٰ پارسائی کو ثابت کر رہی ہیں۔ یعنی چونکہ معشوق صدہا نظروں کے سامنے ہے جو کہ اس کی نگراں ہیں، اس لیے نظارگی سے اس کی پارسائی ثابت ہوتی ہے، نہ کہ بے مہری۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ طنزاً کہا گیا ہو۔

شعر۔۳ جلوۂ بینش، معشوق۔ مہر آسا، سورج کی مانند۔ مطلب یہ ہے کہ اے معشوق تو اپنے حسن کی زکوٰۃ دے تاکہ فقیر کا کاسۂ گدائی اس کے گھر کا ایسا چراغ بن جاوے جو آفتاب کا مقابلہ کرنے لگے۔

شعر۔۴ ’’شاعر کہتا ہے کہ تو نے ایک مشتاقِ قتل کو بے جرم سمجھ کر اس لیے قتل نہیں کیا کہ خونِ بے گناہ اپنی گردن پر نہ لے مگر اب تیری گردن پر بجائے خونِ بے گناہ کے حق آشنائی کا رہے گا، کیونکہ وہ تو اس بات کا مقتضی تھا کہ تو قتل کرے۔‘‘ (یادگار غالب)

شعر۔۵ مطلب یہ ہے کہ زبان کی تمنا اس شکر میں محو ہے کہ اس کو نعمت بے زبانی عطا ہوئی، کیونکہ بے زبان ہونے کی وجہ سے اس کو بے دست و پائی کے شکوہ کے تقاضہ (یعنی بے دست و پائی کا شکوہ کرنے) سے نجات مل گئی اور وہ معرض صبر و تسلیم میں آ گئی۔

اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زبان کی تمنا متقاضی تھی کہ اپنے دست و پائی کا شکوہ کرکے ان کو رحم کرنے کی ترغیب دے، مگر چونکہ ان کو میری بے زبانی دیکھ کر خود بخود رحم آ گیا، اس لیے تمنائے زبان، بے زبانی کا شکر ادا کر رہی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے اس کا مقصد حل ہو گیا۔

شعر۔۶ جلوۂ چمن یعنی فصل بہار۔ رنگیں نوائی، خوش الحانیِ (نفس)۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ فصل بہاری میری رنگین نوائی اور رنگتِ گل، دونوں کا سبب ہے، اس لیے میرا نفس نکہت گل سے کم نہیں کیونکہ علت دونوں کی ایک ہے، یعنی چمن کا جلوہ۔

شعر۔۷ پیغارہ، طعنہ۔ مطلب یہ ہے کہ تیری بے وفائی کی شہرت، جو تجھ کو رسوا کرنے والی ہے، ایک معشوق سے گزر کر دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچی۔ اس طرح ہر طعنہ زن معشوق دہن (مجموعی حالت میں) تیرے لیے زنجیر رسوائی ہے، یعنی ہر ایک دہن طنز گفتار زنجیر رسوائی، کا لک حلقہ ہے اور چونکہ معشوق کے دہن کو عدم باندھتے ہیں، اس لیے اس کے دہن میں بے

وفائی کا ذکر ہونا گویا تیری بے وفائی کے چرچے کا عدم تک پہنچ جانا ہے۔ زنجیرِ رسوائی سے مراد بہت بدنام ہونا ہے۔

شعر۔۸ ستمہائے، یعنی اے غالب تو اپنے خط کو زیادہ طول نہ دے۔ صرف مختصراً اتنا لکھ دے کہ میں تیرے ستمہائے جدائی کے بیان کرنے کی حسرت رکھتا ہوں۔

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے اس سے جو میں یہ بھی کہوں وہ بھی

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہوجائے گا
بے تکلف داغِ مہ، مُہرِ دہاں ہوجائے گا
زہرہ، گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہوجائے گا
لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہوجائے گا
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے، کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہوجائے گا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہوجائے گا
گر نگاہِ کرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے، خوں رگ میں نہاں ہوجائے گا
باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہوجائے گا
وائے، گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہوجائے گا

فائدہ کیا ؟ سوچ۔ آخر تو بھی دانا ہے، اسد
دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہوجائے گا

شعر۔۱ اندوہ، غم۔ داغِ مہ۔ داغ محبوب۔ (مہ صفت) داغ کو باعتبار سیاہی اور مشابہت کے مُہر سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میں نے شب فرقت کے اندوہ کو بیان کر کے اپنی طبیعت کے بخارات نہ نکال دیے تو یقیناً محبوب کی جدائی کا داغ میرے واسطے مُہر خاموشی بن جائے گا (یعنی باعث مرگ ہوجائے گا)۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم لکھتے ہیں۔ ''عاشق چاند کو دیکھتا ہے۔ چاند کے مشاہدہ سے معاً یہ خیال اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ اگر میں نے راز الفت اور درد فرقت کو چھپایا تو میں دیوانہ ہوجاؤں گا اور کوئی اتنا بھی نہ جانے گا کہ میرے جنوں کا باعث کیا ہے۔ میرے غم خواروں اور میرے محبوب تک کو خبر نہ ہوگی۔ گویا یہ مہتاب، جس کی روشنی میرے دل میں مانیا (جنون) کا تلاطم پیدا کر رہی ہے، میرے لیے مُہر وہاں ہوجائے گی۔

شعر۔۲ زہرہ، پتہ۔ پرتوِ مہتاب، چاندنی مطلب یہ ہے کہ اگر شام ہجر کی ہیبت سے ہر چیز کا پتہ پانی پانی ہوتا ہے تو کیا عجب ہے کہ چاندنی کا زہر بھی پانی ہوجائے اور (اس طرح) وہ میرے گھر کے لیے سیلاب بن جائے۔ حاصل یہ ہے کہ شام ہجر اور شب فرقت میں عشاق کے اضطراب و بے چینی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ چیزیں تک بھی کہ جن کی خاصیت مسکن اور نشاط افزا ہوتی ہے، (مثلاً چاندنی) نہایت ہی مہیب شکل میں نظر آنے لگتی ہیں اور سخت تکلیف کا باعث ہوتی ہیں۔

شعر۔۳ اس شعر میں شاعر نے اپنی محبت کو بے لوث اور بے غرضانہ ثابت کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معشوق سو رہا ہے۔ اس وقت چونکہ وہ بیہوشی کی حالت میں ہے، اس لیے وہ بوسہ لے سکتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی دوستی بالکل سچی دوستی ہے، جو ان تمام باتوں سے بالاتر ہے، اس لیے وہ اپنے اس خیال سے باز رہتا ہے کہ فضول اس کو بدگمانی کا کیوں موقع دیا جائے۔ بعض شارحین نے عاشق کو سوتا ہوا مان کر اس شعر کی شرح لکھی ہے۔

شعر۔۴ یعنی ہم کو یہ نہیں معلوم تھا کہ صرف امتحان ہی میں دل کھو بیٹھیں گے۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ یہ تمام عمر کی عشق بازی کے واسطے کافی ہوگا۔ صرف وفا یعنی جو وفاداری (عشق بازی) کی تمام مہمات کے واسطے کافی ہو۔

شعر۔۵ سب کے دل میں ہے جگہ تیری، یعنی تو سب کو پیارا ہے، اس لیے اگر تو مجھ پر مہربان ہوگیا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ساری دنیا مجھ پر مہربان ہوگئی۔

شعر۔۶ نظرِ کرم، نظر عتاب۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تیری نظر عتاب ضبط کرنے کی تعلیم دیتی رہی تو اس (نظر عتاب) کے خوف سے خون رگ میں اس طرح نہاں ہوجائے گا کہ جس طرح شعلہ خس میں پنہاں ہے، یعنی ہم کو ضبط کرنے کی پوری طاقت حاصل ہوجائے گی۔

شعر۔۷ حال، یعنی حال زار۔ مطلب یہ ہے کہ میری حالت ایسی زار و خستہ ہے کہ ہر چیز کو اس پر رونا آتا ہے۔ اس لیے تو مجھ کو باغ میں نہ لے جا، کیونکہ میری حالت کو دیکھ کر ہر ایک پھول کی آنکھ میں آنسو بھر آئیں گے اور اس طرح تجھ کو بجائے سیر و تفریح کے، اُلٹا حزن و ملال ہوگا۔ گل چونکہ

سرخ ہوتا ہے، اس لیے گلِ تر کو چشم خوں فشاں کہا ہے۔

شعر۔۸ مطلب صاف ہے۔ ذوق مرحوم کا بھی ایک شعر ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے   مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

شعر۔۹ یعنی اے اسدؔ تو تو خود سمجھ دار ہے۔ تو ہی خیال کر کہ نادان کی دوستی سے کیا فائدہ؟ اس سے دوستی کرنے میں تو خود اپنا نقصان ہے۔ مثل مشہور ہے ”نادان کی دوستی جی کا زیان۔“

درد منت کش دوا نہ ہوا   میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو   اک تماشہ ہوا گِلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں   تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب   گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی   آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟   بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا، لہو نہ تھا   کام گر رُک گیا، روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے   لے کے دل دل ستاں روانہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

شعر۔۱ یعنی اگر مجھ کو صحت نہ ہوئی تو کوئی حرج نہیں کیونکہ میں دوا کے احسان سے بچ گیا۔

شعر۔۲ گلا، شکایت۔ قاعدہ ہے کہ چار آدمیوں کو مخاطب کر کے کسی کا گلا کیا کرتے ہیں مگر چونکہ عاشق کو از راہ رشک یہ ہرگز منظور نہیں کہ اس کے رقیب کسی حالت میں بھی معشوق کے یہاں آئیں، اس لیے گلا کرتے وقت جب معشوق اُن کو بلاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرا مقصود تو صرف یہ ہے کہ میں آپ کی عدم توجہی کی شکایت کروں۔ اس میں رقیبوں کو جمع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو یہ گلا نہ ہوا بلکہ ایک قسم کا تماشہ ہوا۔

شعر۔۳ جب تو نے ہی ہم کو قتل نہ کیا تو پھر کون کرے گا۔

شعر۔۴ یعنی لب معشوق میں کس قدر شیرینی ہے کہ رقیب بوالہوس بھی جو کہ لذتِ عشق سے محروم ہے گالیاں (جن کا مزہ تلخ کہا جاتا ہے) کھا کر بے مزہ (ناراض) نہیں ہوا:

دشمن پسِ دشنام بھی ہے طالبِ بوسہ   محوِ اثرِ لذت دشنام نہ ہوگا

شعر۔۵ اس سے مدارات اور مفلسی کا اظہار ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ پہلے میرے پاس ایک بوریا تو تھا۔ لیکن اب جبکہ ان کے آنے کی خبر مشہور ہے تو شومیِ قسمت سے وہ بوریا بھی نہیں رہا۔

شعر۔۶ ”کہتا ہے کہ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے، بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔“ (یادگار غالب)

مولوی عبدالباری صاحب آسیؔ نے اپنی شرح میں اس کے معنی اس طرح بیان فرمائے ہیں ”مطلب یہ ہے کہ خدا، جس کی میں نے عبادت کی، کیا وہ نمرود تھا اور کیا اس کی خدائی، نمرود کی خدائی تھی کہ میرا بھلا نہ ہوا۔“

شعر۔۷ پہلے حق کے معنی سچ اور دوسرے حق کے معنی فرض کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم نے خدا کی راہ میں جان بھی دے دی تو بھی ہم سے پورا پورا فرض ادا نہیں ہوا، کیونکہ جان اسی کی دی ہوئی تھی اگر اس کی راہ میں دے بھی دی تو کیا ہے۔ کسی کی دی ہوئی چیز کا واپس کر دینا کوئی ذاتی ایثار نہیں۔

شعر۔۸ کام جب رک جاتا ہے تو روا نہیں ہوتا۔ (یعنی پھر مشکل سے چلتا ہے) اسی لحاظ سے چاہیے تھا کہ اگر زخم دب جاتا ہے تو لہو روا نہیں ہوتا۔ لیکن میرے حق میں ایسا نہیں ہے۔ زخم کے دب جانے پر بھی لہو جاری ہے۔ (حسرتؔ)

شعر۔۹ روانہ۔ روا قافیہ اور نہ ردیف ہے۔ ایسے قافیہ کو قافیۂ معمولہ کہتے ہیں۔

شعر۔۱۰ صاف ہے۔

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا   گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسُخ مکتوب   مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی   دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیر باغ نہ دو   مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں   کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا
دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے   ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا
نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے   مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا
فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسؔد
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

شعر۔۱ شوق کو، یعنی اضطراب شوق کو۔ دل میں بھی یعنی باوجود وسعتِ دل کے۔ گوہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا، یعنی اضطراب دریا گوہر میں سما گیا۔ گوہر کو دل اور اضطراب شوق کو اضطرابِ دریا سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل میں اضطرابِ شوق کو اس کی وسعت کے مطابق جگہ نہ ملنے کی وجہ سے اس کا جوش وخروش جاتا رہا گویا کہ اضطرابِ دریا گوہر میں سما گیا کہ اب تلاطم باقی نہ رہا۔

شعر۔۲ پاسخ مکتوب، خط کا جواب۔ مطلب یہ ہے کہ میں یہ تو ضرور جانتا ہوں کہ تو میرے خط کا جواب نہیں دے گا مگر کیا کروں، خامہ فرسائی کے شوق سے مجبور ہوں۔ اسی مضمون کا میر حسن مرحوم کا بھی ایک شعر ہے:

گرچہ دل کو ہے یقیں خط تو نہیں لکھنے کا وہ   میؔر تقاضہ شوق کا لکھنے سے کب رہتا ہے باز

شعر۔۳ حنائے پائے خزاں۔ خزاں کے پانو میں لگی ہوئی مہندی۔ زینتِ خزاں، بہار کی ناپائیداری کی طرف بھی اشارہ ہے۔ کلفت، تکلیف، رنج۔ مطلب یہ ہے کہ اول تو بہار کی کوئی حقیقت ہی نہیں، لیکن اگر مان بھی لیا جاوے کہ واقعی وہ کوئی چیز ہے تو اس کو محض ایک زینتِ خزاں کہنا چاہیے کیونکہ انجام کار خزاں ہی ہے۔ اسی طریقہ سے دنیا کا عیش بھی محض نمایشی اور عارضی ہے۔ ہمیشہ اس کا انجام کلفتِ خاطر یعنی تکلیف و رنج ہی ہوتا ہے۔

شعر۔۴ خندہ گل کو بیجا اس لیے کہا ہے کہ وہ دانستہ یا ازراہ تعجب نہیں ہنستا۔ پس گویا اس کا خندہ بیجا و بے محل ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ میں غمِ فراق یار میں مبتلا ہوں، اس لیے مجھ کو ایسی سراسیمگی کی حالت میں سیر باغ کی تکلیف مت دو۔ مجھ کو پھولوں کی بیجا ہنسی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

شعر۔۵ بُنِ مو، بال کی جڑ۔ محرمی، واقفیت۔ قربت۔ محرمیِ حسن کو ترستا ہوں یعنی، حسن ازلی کے دیدار سے محروم ہوں۔ مصرعہ ثانی میں لفظ اگرچہ نا محذوف ہے مطلب یہ ہے اگرچہ میرے ہر ایک بال کی جڑ چشم بینا بنی ہوئی ہے لیکن پھر بھی میں ابھی تک حسن ازلی کے دیدار سے محروم ہوں۔ حاصل یہ ہے کہ انسان سراپا چشم بینا ہو کر ہی کیوں نہ دیکھے لیکن اس کو دیدار حسن (شاہدِ حقیقی) ہرگز حاصل نہ ہوگا۔

شعر۔۶ مطلب یہ ہے کہ ہم نے حسن کے تقاضے کی نوبت ہی نہ آنے دی، بلکہ اپنے دل کو پہلے سے ہی اس کی ناز و ادا پر قربان کر دیا۔

شعر۔۷ حسرت دل کو دریا کے جمع اور آنسوؤں کو جو حسرتِ دل سے نکلتے ہیں، دریا کے خرچ سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری حسرت دل کا میرے گریہ سے اندازہ نہیں لگانا چاہیے کیونکہ وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس شعر میں بھی مصرعہ ثانی میں لفظ ''اگرچہ'' محذوف ہے۔ یعنی اگرچہ میری آنکھوں کی راہ آنسوؤں کا دریا جاری ہے، لیکن پھر بھی وہ آنسو میری حسرتِ دل کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے۔

شعر۔۸ اس کو، یعنی معشوق کو۔ اس کی، یعنی فلک کی۔ کارفرما، یعنی ستم پیشہ معشوق۔ مطلب یہ ہے کہ اسدؔ ظالم فلک کو دیکھ کر مجھ کو اپنا معشوق یاد آتا ہے، کیونکہ وہ بھی ایسا ہی ظالم ہے۔

چرخ کو، کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں   کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا   خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

شعر۔۱ نفس پرور، ساکت، منجمد۔ خود مرزا صاحب نے ایک خط میں اس شعر کی شرح کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ اس مطلع میں خیال تو دقیق نظم کیا گیا ہے لیکن لطف زیادہ نہیں۔ قطرہ جو ٹپکنے میں بے اختیار ہے، افراط حیرت سے ٹپکنا بھول گیا۔ برابر بوندیں جو تھم کر رہ گئیں تو پیالے کا خط اس تاگے

کی صورت بن گیا جس میں موتی پروئے گئے ہوں۔

شعر۔۲ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو جو میرے عشق کا اعتبار ہوگیا ہے، تو وہی میری خانہ خرابی کا باعث ہے، کہ آہ تو رقیب نے کی لیکن چونکہ اس کو رقیب کے عشق پر اعتبار نہ تھا اور مجھ ہی پر اعتبار تھا کہ سوائے میرے کوئی عاشق نہیں، اس لیے وہ مجھ ہی پر خفا ہوا کہ یہ ضرور اسی کا کام ہے۔ خانہ خرابی یا تو اس لیے کہ کوئی کرے اور کوئی بھرے یا اس لیے کہ رقیب سمجھا کہ معشوق مجھ سے ناراض ہے اور اس سے خوش۔

جب، بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا   تپشِ شوق نے ہر ذرّے پہ اک دل باندھا
اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیٔ ناز   جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا
یاس و امید نے یک عربدہ میدان مانگا   عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا
نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضمون غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

شعر۔۱ محمل، کجاوہ۔ ہودہ اونٹ کا۔ مطلب یہ ہے کہ جب معشوق سفر کے لیے تیار ہوا تو عاشق کی تپشِ شوق نے ہر ہر ذرّہ میں جہاں جہاں کہ اس کا گزر تھا، ایک دل باندھ دیا۔ یعنی عاشق معشوق کے رخصت ہونے کی وجہ سے مضطرب ہوا۔ ذرہ پر دل باندھنا اس وجہ سے کہا ہے کہ شاعر کو دل کا اضطراب دکھانا منظور ہے اور ذرہ چمکتا ہوا مضطرب معلوم ہوتا ہے۔

شعر۔۲ اہلِ بینش، اہلِ نظر۔ حیرت کدہ، مراد آئینہ۔ جب آئینہ میں عکسِ یار موجود ہے تو اس میں شوخیِ ناز کی بھی موجودگی شامل ہے۔ شاعر آئینۂ فولادی کے جوہرِ سبز کو متحرک دیکھ کر متاثر ہوتا ہے اور اس کو شاعرانہ رنگ میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ آئینہ میں تصویرِ معشوق موجود ہے اور یہ جو ہم اس کے جوہرِ سبز میں حرکت دیکھتے ہیں، وہ اگر چشمِ بصیرت سے دیکھا جائے تو طوطیِ بسمل ہے، جو معشوق کی شوخیِ ناز کو دیکھ کر اس قدر تڑپ رہا ہے۔

شعر۔۳ یاس۔ ناامیدی۔ عربدہ۔ لڑائی، جنگ۔ عجزِ ہمت، پست ہمتی۔ دلِ سائل کو ایک طلسم اور جنگ گاہ یاس و امید قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پست ہمتی کی وجہ سے دلِ سائل ایک طلسم

میدان کارزار بنا ہوا ہے، جس میں یاس (سوال کے قبول نہ ہونے کی) اور امید (سوال کے مقبول ہونے کی) میں جنگ ہوا کرتی ہے اور ایک دوسرے پر غالب آنا چاہتی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ پست ہمت لوگ ہمیشہ امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں۔

شعر۔۴ ذوق، یعنی ذوقِ سخن۔ مطلب یہ ہے کہ میرے ذوقِ سخن میں وہ تشنگی ہے کہ اگرچہ میں نے دریا کو بھی ساحل بنا دیا لیکن پھر بھی میری تشنگیِ ذوق کی حالت کما حقہ بیان نہ ہوسکی۔

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں   گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں   وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

شعر۔۱ یعنی ساقی نے زبردستی کیوں نہ پلا دی ہے

اگر فسردہ ایم صبا را چہ میشود   رہ گم نہ کردہ بوئے گلے تا دماغ ما

شعر۔۲ یعنی اب وہ دن نہیں جبکہ دل و جگر اپنے اپنے ٹھکانے پر تھے۔ اب تو وہ دونوں کسی کے تیر نگاہ سے چھدے پڑے ہیں۔

اب ہیں اک تیر میں سفتہ جگر و دل دونوں   گئے وہ دن کہ تھا بیمار سے بیمار جدا

شعر۔۳ درماندگی، مصیبت۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ جب مشکلات نے نہیں گھیرا تھا اُس وقت تو ان کو رفع کرنے کی طاقت تھی، لیکن اب جب کہ مصیبت میں مبتلا ہوں تو ان سے بچنے کی قوت نہیں ہے۔

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا   بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے   کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا
بعد یک عمرِ ورع بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

شعر۔۱ یعنی ہمارا گھر جو کہ ہماری کثرتِ گریہ سے دریا ہو رہا ہے، اگر ہم روتے بھی نہیں تو وہ

بیابان ہوتا۔ بہر حال اس کی ویرانی و بربادی نہیں جاتی۔ مرزا دوسری جگہ لکھتے ہیں:

غالب کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے　　　خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

شعر۔۲ مطلب یہ ہے کہ تنگیٔ دل کی شکایت کرنی فضول ہے کیونکہ اگر وہ تنگ نہ ہوتا تو پریشان ہوتا۔ لہٰذا ہم کو دونوں حالتیں مساوی ہیں۔

شعر۔۳ ورع، پرہیزگاری۔ بار، باری۔ رضواں، داروغۂ بہشت۔ مطلب یہ ہے کہ کاش رضواں ہی میرے معشوق کا دربان ہوتا۔ کیونکہ اس کے دربان ہونے میں یہ تو امید تھی کہ اگر نیکی و پرہیزگاری سے عمر بسر کی جاتی تو وہ اندر جانے کی اجازت تو دے دیتا، لیکن معشوق کا دربان تو کمبخت ایسا ہے کہ لاکھ کوشش کیجیے مگر کسی طرح بھی اندر نہیں جانے دیتا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بے بس تو غم کیا سر کے کٹنے کا　　　نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدت کہ غالبؔ مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر یک بات پر کہتا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

شعر۔۱ "بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلے مصرعہ کے معنی تو ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرعہ سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہیے کہ میں کیا چیز ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہوتا، کیونکہ پہلے مصرعہ میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔" (یادگار غالب)

شعر۔۲ زانو پر دھرا ہوتا، یعنی بے حس و حرکت ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ جب مجھ کو غم کا احساس ہی نہیں رہا تو پھر مجھ کو سر کے کٹنے کا کیا غم۔ اگر میرا سر کٹتا نہیں تو بے حس و حرکت زانو پر دھرا ہوتا، بات ایک ہی ہے۔

شعر۔۳ یعنی اگرچہ غالبؔ کو مرے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا، مگر پھر بھی ہم کو اس کی بحث و تمحیص کی عادت بار بار یاد آتی ہے۔

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار، باغ کا　　　یاں جادہ بھی، فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بے مے، کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی　　　کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل　　　کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
تازہ نہیں ہے، نشۂ فکرِ سخن مجھے　　　تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا
سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے　　　پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا
بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار　　　یہ مے کدہ خراب ہے مے کے سراغ کا
باغ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خم کدہ کس کے دماغ کا

شعر۔۱ جادہ۔ بٹیا۔ فتیلہ، بتی۔ مطلب یہ ہے کہ موسم بہار میں ہر جگہ پھول ہی پھول کھلے نظر آتے ہیں۔ ذرا بھی جگہ ان سے خالی نہیں یہاں تک کہ بٹیا تک بھی جہاں آمد و رفت کی وجہ سے گھاس تک نہیں اُگتی ہے، لالہ کے پھولوں کی کثرت سے لالہ کے داغ کا فتیلہ بنی ہوئی ہے۔

شعر۔۲ آشوب، شور و غوغا، گھبراہٹ، فتنہ۔ آگہی: ہوشیاری۔ آشوب آگہی: افکار دنیوی۔ اس رعایت سے کہ ہوش کی حالت میں افکار دنیوی میں مبتلا ہونا ضروری ہے۔ عجز حوصلہ، پست ہمتی۔ ایاغ، جام شراب۔ مطلب یہ ہے کہ شراب نوشی کے بغیر کسی شخص کو بھی افکار دنیوی سے نجات نہیں مل سکتی۔ لیکن یہاں ساقی نے ایسی پست ہمتی سے کام لیا ہے کہ جام میں بھی خط کھینچ دیا ہے۔ یعنی پورا ایک پیالہ بھی شراب نہیں دی بلکہ صرف ایک خط مقررہ تک بھر دی ہے۔ (اگرچہ ضرورت زیادہ کی تھی)

شعر۔۳ یعنی بلبل جو عشق گل میں ترانہ گا رہی ہے، تو پھول اس پر ہنس رہے ہیں۔ گویا عشق، خلل دماغ کا ہی دوسرا نام ہے کیونکہ اکثر جس شخص کے دماغ میں خلل ہوتا ہے لوگ اسی پر ہنسا کرتے ہیں۔

شعر۔۴ تریاکی: افیونی۔ مجازاً نشہ کرنے والا۔ دود چراغ، فکر کلام روشن۔ مطلب یہ ہے کہ نشۂ فکر سخن مجھے کوئی نیا نہیں ہے۔ بلکہ میں ہمیشہ سے اس نشہ (فکر کلام روشن) میں سرشار رہتا ہوں۔ مرزا پہلے ہی لکھ چکے ہیں:

تالیف نسخہائے وفا کر رہا تھا میں　　　مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

شعر۔۵ بند: قید۔ عدو ہے فراغ کا: آزادی کا دشمن ہے۔ یعنی آزاد رہنا پسند نہیں کرتا اور کہیں کہیں جا کر پھنس جاتا ہے۔

شعر۔٦ میکدہ مراد آنکھ۔ مے، مراد خون دل۔ سراغ، تجسس و تلاش۔ مطلب یہ ہے کہ آنکھ سے چونکہ خون دل اشک بن کر نکلنا بند ہوگیا، اس لیے موجِ نگاہ (تار نظر) خشکی کی وجہ سے غبار بن گئی ہے۔ گویا کہ میکدۂ چشم میں مے (اشک خون دل) کی جستجو میں خاک اڑ رہی ہے۔

شعر۔٧ بساط: فرش۔ نشاط دل، سرور دل، دلکی خوشی۔ خم کدہ۔ شراب خانہ۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے ہی حسن کا باغِ شگفتہ میرے سرور دل کا باعث ہے، نہ کہ ابر بہار۔ وہ (ابر بہار) ہرگز میری فرحت کا باعث نہیں ہوسکتا۔

وہ، مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں، میں جب سے کہ گریباں سمجھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام
رُخ پہ ہر قطرۂ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلہ سوزاں سمجھا

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا، اس قدر آساں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اُس کو وفادار، اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

شعر۔١ عنوان، سرنامہ، سرخی، دیباچہ۔ مطلب یہ ہے کہ میری پیشانی پر جو سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں، ان سے میرے غمِ پنہاں کا حال میرے یار نے اس طرح معلوم کرلیا جیسے کہ خط کی سرخی کی بے ربطی سے مضمون خط معلوم کرلیا کرتے ہیں۔

شعر۔٢ اس شعر کی شرح خود مرزا صاحب نے اردوئے معلیٰ میں لکھی ہے۔ لکھتے ہیں۔ پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ آئینہ، عبارت فولاد کے آئینہ سے ہے۔ ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں اور ان کو کون صیقل کرتا ہے۔ فولاد کی جس چیز کو صیقل کروگے، بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی، اس کو الف صیقل کہتے ہیں۔ جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اب اس مفہوم کو سمجھیے۔ مصرعہ :

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یعنی ابتدائے سن تمیز سے مشق جنوں ہے۔ اب تک کمال فن حاصل نہیں ہوا۔ آئینہ تمام صاف نہیں ہوگیا ہے۔ بس وہی ایک لکیر صیقل کی موجود ہے چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاک جیب آثار جنوں میں سے ہے۔

شعر۔٣ شرح بمعنی کھولنا۔ یہ لفظ ''تنگ'' کی رعایت سے لایا گیا ہے۔ شرح و تنگ میں صنعت تضاد ہے۔ اسی طرح لفظ گرفتاری، بہ رعایت ''زنداں'' لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب تو میری گرفتاریِ خاطر کے وجوہ کی توضیح مجھ سے مت پوچھ۔ میرا دل دنیوی قصوں اور جھگڑوں میں پھنس کر ایسا تنگ ہوا کہ میں اس کو زنداں سمجھنے لگا ہوں کیونکہ زنداں تنگی (جا) کو ہی کہتے ہیں:

زندگی کشمکشِ رنج و محن میں گزری
چار دیوارِ عناصر کو زنداں سمجھا

(یاسؔ عظیم آبادی)

شعر۔٤ قطرۂ عرق، پسینہ کی بوند۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق اتنا بدگمان ہے کہ وہ اپنی اس بدگمانی کی وجہ سے سرگرم خرام بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ چلنے پھرنے سے جو پسینہ آجاتا ہے تو وہ اس کے ہر ہر قطرہ کو دیدۂ حیران عاشق سمجھتا ہے۔ قطرۂ عرق اور دیدۂ حیران میں تشبیہ ظاہر ہے۔

شعر۔٥ عجز کو خس سے، خس کو رگ نبض سے اور بدخوئی کو شعلۂ سوزاں سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے جان لیا کہ وہ (یعنی محبوب) میرے عجز کرنے سے اور بھی بدخو ہوجائے گا گویا میں نے نبض خس (اپنے عجز) سے یہ تشخیص کرلیا (معلوم کرلیا) کہ اس میں ضرور تپشِ شعلۂ سوزانِ (تندخوئی معشوق) نہاں ہے۔ یعنی اگر میں عاجزی کروں گا تو معشوق کی بدخوئی بڑھے گی اور اس کی تپش مجھ کو جلا دے گی۔ حاصل یہ کہ میری عاجزی اور بھی میری ہلاکت کا باعث ہوگی۔

شعر۔٦ شبستان، رات بسر کرنے کی جگہ۔ مطلب یہ ہے کہ جب سفر عشق میں کمزوری اور درماندگی کی وجہ سے آرام لینے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ہر قدم میں سایہ ہی کو آرام گاہ سمجھا۔ اس شعر میں شاعر نے اپنی کمال مجبوری ظاہر کی ہے اور اپنی یاس و ناامیدی ہی سے تسکین آرام طلب کیا ہے۔ یعنی عشق کا سخت سفر اور پھر اس پر اپنا ضعف درماندگی، سایہ کا اپنے آرام کے لیے تلاش کرنا اور اس کے نہ ملنے پر (یعنی ہر طرح مایوس ہونے پر) مجبوراً خود اپنے سایہ کو شبستاں سمجھا۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مرحوم نے اس شعر کے معنی اس طرح بیان فرمائے ہیں۔ "عاشق سفرِ عشق میں اس درجہ خستہ جان اور مضمحل ہوگیا ہے کہ قدم قدم پر ضعف سے لغزش ہوتی ہے اور آگے بڑھنے کا یارا نہیں۔ اس ادنیٰ مضمون کو وسعتِ تخیل اس طور پر ادا کرتا ہے کہ جس طرح تشنہ لب مسافر کو سراب دریائے آب معلوم ہوتا ہے۔ شکستہ روح اور مجروح بدن عاشق کو، اپنے سایہ پر خوابگاہ منزل کا گمان ہوتا ہے۔ ہر لحظہ خیال کرتا ہے کہ مقام مقصود پالیا اور ہر لحظہ چونکتا ہے کہ نہیں۔ ہنوز دشت ناپیدا کنار کے عین وسط میں ہے۔"

شعر۔۷ مژۂ یار کو پیکان قضا سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا دل مرتے مرتے وقت تک مژۂ یار کے پیکان سے نکلنے کی کوشش کرتا رہا۔ گویا اس نے مژگانِ معشوق جیسے تیرِ قضا سے رہائی پائی۔ ایک معمولی سی بات سمجھی، جو اس نے ایسے ناممکن میں ہاتھ ڈالا۔

شعر۔۸ لفظ کافر میں صنعت ایہام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسدؔ تم نے اس بے وفا کو وفادار سمجھ کر کیوں دل دیا، کیوں کہ اس کو وفادار سمجھنا تو ایسی ہی غلطی ہے جیسی کہ کافر کو مسلمان سمجھنا۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا   دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز   پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی   پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا
عذر واماندگی اے حسرتِ دل   نالہ کرتا تھا ، جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی   کیوں ترا راہ گزر یاد آیا؟
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی   گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
آہ، وہ جرأتِ فریاد کہاں؟   دل سے تنگ آکے، جگر یاد آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال   دلِ گم گشتہ، مگر، یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں، اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

شعر۔۱ عاشق کہتا ہے کہ مجھ کو پھر اپنا دیدۂ تر یاد آیا، یعنی گریۂ عشق میں جو رونے کی لذت تھی وہ پھر یاد آئی اور دل وجگر میں فریاد کی خواہش پیدا ہوئی کہ نالہ کروں اور روؤں، لیکن یارائے گریہ نہیں، اس لیے کہ دل وجگر کا سارا خون آنسوؤں کی راہ پہلے ہی بہا چکا تھا۔ شارحین نے دیدۂ تر سے معشوق کا دیدۂ تر مراد لیا ہے۔ یعنی مجھ کو پھر معشوق کا دیدۂ تر یاد آیا اور اس کی وجہ سے میرا دل وجگر فریاد کرنے کا آرزومند ہوا لیکن یہ معنی زیادہ لطیف نہیں۔

شعر۔۲ "دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی (اس کو قیامت کہا ہے) اور جو اس کے چلے جانے کے بعد رو رو کر یاد آتی ہے، اس میں جو کبھی کبھی وقفہ ہو جاتا ہے اس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔" (یادگار غالب)

شعر۔۳ پہلے مصرعہ میں لفظ "دیکھو" محذوف ہے، نیرنگ نظر۔ معشوقِ شوخ۔ مطلب یہ ہے کہ میری تمنا (وصل معشوق) کی سادگی ذرا ملاحظہ کیجئے کہ گو ایک مرتبہ اس کو معشوق کی طرف سے ناکامیابی اور مایوسی ہو چکی ہے لیکن پھر وہی یاد آتا ہے۔ یا یہ کہ جس نے مجھ کو تباہ کر کے ایسی خستہ حالت پر پہنچا دیا، میری آرزوئیں پھر اسی نیرنگ نظر کو یاد کرتی ہیں۔

شعر۔۴ عذر واماندگی کے بعد "قبول کر" محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حسرت دل اس بات کی متقاضی تھی کہ نالہ کیا جائے، اس لیے میں نالہ کرنے والا ہی تھا کہ جگر یاد آگیا کہ ایسا نہ ہو کہ (نالہ کے صدمہ سے) وہ شق ہو جائے۔ اس سبب سے میں چپ ہوگیا۔ اے حسرتِ دل میرے اس عذر واماندگی کو قبول کر۔

شعر۔۵ یعنی ہماری زندگی یوں بھی کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتی، فضول تیرا رہگزر کیوں یاد آیا کہ اس کو یاد کر کے ہم مر گئے۔

حسرت صاحب اس کے معنی اس طرح بیان فرماتے ہیں۔ "جب کامگاری ممکن ہی نہیں تو تیرا رہگزر بیکار ہی یاد آتا ہے۔ یعنی جب وہاں بھی بحالت ناکامیابی بسر ہوگی تو یاد آنا عبث ہے۔ یوں بھی زندگی کسی نہ کسی طور پر گزر رہی جاتی۔"

شعر۔۶ کیا ہی لڑائی ہوگی، یعنی خوب لڑائی ہوگی۔ اس بنا پر کہ وہ کہے گا کہ بہشت اچھی ہے اور میں کہوں گا کہ نہیں میرے معشوق کا گھر اچھا ہے۔ مرزا ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

کم نہیں جلوہ گری میں تیرے کوچہ سے بہشت   یہی نقشہ ہے مگر اس قدر آباد نہیں

شعر۔۷ یعنی جگر میں فریاد کرنے کی دل سے زیادہ طاقت تھی لیکن اب افسوس اس میں بھی نہیں۔

شعر۔۸ گم گشتہ، کھویا ہوا۔ مگر شاید۔ مطلب یہ ہے کہ شاید کھوئے ہوئے دل کو ڈھونڈھنے کی غرض سے خیال اس کے کوچہ کی طرف چلا ہے کیونکہ وہیں دل کے کھوئے جانے کا احتمال ہے۔

شعر۔۹ ''اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں، وہ اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے۔ یعنی خوف معلوم ہوتا ہے (کہ چلو گھر کو لوٹ چلیں) مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر کو ہی سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہیں ہوگی، مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔ گھر یاد آنے میں صنعت ایہام ہے۔'' (یادگار غالب)

شعر۔۱۰ سر یاد آیا، یعنی اپنے ہی سر میں مار لیا۔ یا یہ کہ مجھ کو یہ خیال گزرا کہ ممکن ہے کہ میں بھی مجنوں کی طرح جنونِ عشق میں مبتلا ہو جاؤں اور لڑکے میرے سر پر بھی اسی طرح سنگ زنی کریں اور اس خیال سے اس کو پھینک دیا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس شعر کے معنی نہایت توضیح سے لکھے ہیں۔ '' کہتے ہیں کہ جب مجنوں کا شباب عشق تھا، میرا وقت طفلی تھا۔ تمام شہر کے بچے مجنوں کو پتھر سے مارا کرتے تھے کہ اقتضائے بچپن ہے۔ میں نے بھی ایک بار دیگر ہم عمروں کی طرح اس ستم زدہ کو نشانہ سنگ بنانے کی غرض سے پتھر اٹھا لیا۔ دم زدن میں اپنی تمام آیندہ زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میں آگے آگے ہوں اور اطفال شہر پیچھے پیچھے اور خشت و سنگ کی بارش کر رہے ہیں۔ یعنی سرشت عشق طفلی کی نافہمی سے آزاد ہے۔ گو لڑکپن کا زمانہ تھا لیکن پہلے ہی سے کج روی پر ضمیر عاشقی نے متنبہ کر دیا۔ ایک روایت ہے کہ منصور کو انا الحق کہنے کے باعث لوگ اسے سنگ سے سرزنش کیا کرتے تھے۔ ایک دن شبلی کا بھی اس راہ سے گزر ہوا۔ شبلی نے شاید از راہ مزاح ایک پھول منصور کی جانب پھینک دیا۔ منصور کو حد درجہ ملال ہوا۔ کیونکہ شبلی جو خود عاشقان خدا سے تھے، منصور کے معاملہ سے واقف تھے۔ ضرور ہے کہ جب مرزا نے مجنوں پر پتھر اٹھایا ہوگا تو مجنوں نے شکایتاً مڑ کر ان کی طرف دیکھا ہوگا۔''

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ اس میں کچھ شائبہ خوبیِ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریِ زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا؟ بات کرتے، کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا
یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا نالہ کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا
پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو، غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

شعر۔۱ عناں گیر: باگ پکڑنے والا۔ مجازاً روکنے والا۔ مطلب یہ ہے کہ تم کو آنے میں جو دیر ہو گئی ہے تو کیا کسی نے روک لیا تھا۔ آخر تاخیر کی کیا وجہ ہے؟ بدگمانی کا اظہار کیا ہے۔

شعر۔۲ خوبیِ تقدیر: طنزاً کہا ہے۔ مراد بدبختی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارا کوئی قصور نہیں۔ خود میری قسمت میں ہی تباہی لکھی تھی۔

شعر۔۳ فتراک شکار بند، نخچیر، شکار۔ مطلب یہ ہے کہ تجھ کو یاد ہوگا کبھی تیرے شکار بند میں کوئی شکار پھنسا تھا۔ بس میں وہی ہوں۔

شعر۔۴ یعنی قید میں تیری زلف کی یاد کے علاوہ کچھ تھوڑی سی تکلیف زنجیر کی بھی تھی (گو، قید کی تکلیفِ یاد، زلفِ معشوق کی بے چینی کے مقابلہ میں بالکل حقیر تھی) وحشی، بمعنی دیوانہ الفت۔

شعر۔۵ اس مطلب کو کہ وہ جو آن کی آن میں اپنا ذرا جلوہ دکھا کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو اس سے کیا تسلی ہو سکتی ہے۔ اس طرح بیان کیا ہے ''بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا؟'' ان کو لازم تھا کہ وہ مجھ سے گفتگو بھی کرتے، کیونکہ مجھ کو بات کرنے کی بھی تمنا تھی۔

شعر۔۶ میرے اس کو یوسف کہنے پر اگر وہ خاموش رہا تو بہت ہی خیریت ہوئی، ورنہ اگر وہ بگڑ جاتا کہ میں نے اس کو اس کے کمتر سے تشبیہ دی (یا جیسا کہ بعض شارحین کی رائے ہے کہ میں نے اس کو غلام بنایا) تو وہ بالکل حق بجانب تھا۔ واقعی میں اس غلطی پر قابل سزا تھا

وہ یوں ہی ایک تو اے دل نام سے یوسف کے چڑتے ہیں
ایک تم ہو کہ یوسف کہہ کے، ثانی اور کہتے ہو

شعر۔۷ طالب تاثیر بھی تھا: بے اثر تھا۔ مصرعہ ثانی میں نالہ سے پہلے لفظ: غیر، محذوف ہے۔ باقی مطلب صاف ہے۔

شعر۔۸ یعنی لوگ یہ کہتے ہیں کہ فرہاد نے جو رقیب کے لیے کوہکنی کی، وہ عیب ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ کوہکنی اس کا پیشہ تھا۔ اور پیشہ شرعاً یا اخلاقاً عیب نہیں ہے، اس لیے ہم اس کو اپنی جماعت سے خارج نہیں کر سکتے۔

شعر۔۹ یعنی اگر پاس آنا پسند نہ تھا تو نہ آیا ہوتا۔ دور سے ہی ایک تیر (نگاہ) لگایا ہوتا۔

شعر۔۱۰ شوخیِ طبع، ملاحظہ طلب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے جرم (گناہ) کے ثبوت کے لیے کسی شہادت کی ضرورت ہے۔ صرف فرشتوں کا لکھنا کافی نہیں۔ ہم محض ان کے لکھنے پر کیوں پکڑے جاتے ہیں؟

شعر۔۱۱ ریختہ: اردو

لب خشک در تشنگی مردگاں کا
زیارت کدہ ہوں، دل آرزدگاں کا
ہمہ ناامیدی، ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریب وفا خوردگاں کا

شعر۔۱ تشنگی: آرزوئے شوق۔ در تشنگیِ مژگاں: وہ لوگ جو کہ آرزوئے شوق میں مرگئے۔ مصرعۂ اوّل میں لفظ 'ہوں' محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ تشنگی (آرزوئے شوق) میں مرگئے ہیں ان کا لبِ خشک ہوں (یعنی ان میں بہت بڑا رتبہ رکھتا ہوں) اس لیے دل آزردہ لوگوں کی زیارت گاہ ہوں۔ اس شعر میں اپنی ناکامی کا اظہار کیا ہے۔

شعر۔۲ ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی: سراسر یاس و بدظنی۔ فریب وفا خوردگاں: وفا کا فریب کھائے

ہوئے لوگ۔ میں دل ہوں فریب وفا خوردگان کا: یعنی جس طرح کہ وفا کا فریب کھائے لوگوں کا دل سراپا یاس اور بدگمانی ہوتا ہے، اسی طرح میں بھی سراپا یاس اور بدگمانی بنا ہوا ہوں۔

تو دوست کسی کا بھی، ستم گر، نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں
یعنی سبق شوق مکرّر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل
آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

شعر۔۱ مطلب یہ ہے کہ اے ظالم معشوق، تو کسی کا بھی دوست نہیں۔ تیرا ظلم صرف مجھی تک محدود نہیں، بلکہ دوسروں پر بھی ہے اور ان پر مجھ سے بھی زیادہ ہے۔

شعر۔۲ نخشب: ایک مصنوعی چاند کو کہتے ہیں جس کو کہ مقام نخشب میں حکیم نخشبی مشہور بہ ابن مقنع نے سیماب وغیرہ سے تیار کیا تھا۔ یہ چاند دو مہینہ تک برابر ایک کنویں سے نکلتا رہا لیکن اس کی روشنی چار فرسنگ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ اس کے، یعنی معشوق کے۔ اس شعر سے سورج کو اس لحاظ سے کہ حسن و معشوق کے۔ مقابلہ میں ناقص الخلقت ٹھہرایا ہے، ماہ نخشب سے تشبیہ دی ہے۔

شعر۔۳ بالکل نیا، اچھوتا اور باریک خیال ہے اور نہایت صفائی اور عمدگی کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے اسی کے موافق اس کی تائید غیب سے ہوتی ہے اور ثبوت یہ ہے یہ قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے، اگر اس کی ہمت، جب کہ وہ دریا میں تھا، موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو اس کو جیسا کہ ظاہر ہے یہ درجہ، یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا، حاصل نہ ہوتا۔ (یادگار غالب)

(یعنی اس قطرہ نے ہمت کی۔ بادل بنا۔ برسا۔ پیا گیا۔ جب جا کر کہیں آنسو بنا)

شعر۔۴ قامت یارکو اکثر فتنۂ قیامت سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں قامت یار کو دیکھنے سے پیشتر فتنۂ قیامت کا معتقد نہ تھا لیکن جب سے کہ قامتِ یار کو دیکھا ہے مجھ کو فتنۂ قیامت پر بھی اعتقاد ہو گیا ہے۔

شعر۔۵ سادہ دل ''میں'' کی صفت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق جو میرے اظہار شوق سے آزردہ ہو گیا ہے، تو میں سادہ دل اس سے خوش ہوں کیونکہ اس حالت میں مجھ کو اظہار شوق کا دوبارہ موقع ملے گا۔ اس لیے کہ اگر یار آزردہ نہ ہوتا تو اظہار شوق کی تکرار کی ضرورت نہ ہوتی۔

شعر۔۶ ''کہتا ہے کہ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اتنا فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہو گیا ہے، مگر ابھی ہمارے دامن کا پلّہ تک نہیں بھیگا۔'' (یادگارِ غالب)

شعر۔۷ سمندر: ایک جانور بہ شکل موش کے ہوتا ہے جو کہ آتشکدہ میں، جب کہ ایک مدتِ دراز تک برابر آگ جلتی رہتی ہے، پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر آگ سے باہر نکلے تو فوراً مر جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آتشکدہ ایک عرصے سے جب کہ سمندر کا وجود بھی نہ تھا، میرے داغِ جگر سے آتش مزاجی کی تحصیل وصول کرتا تھا۔

حاصل یہ کہ میری آتش مزاجی کو وہ درجہ حاصل تھا اور اس میں اس بلا کا سوز تھا کہ آتشِ آتشکدہ اور سمندر وغیرہ یہ تمام آتشی چیزیں سب اسی سے پیدا ہوئی ہیں۔ تحصیل اور جاگیر میں رعایت لفظی ہے۔

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا   رشتۂ ہر شمع، خارِ کسوتِ فانوس تھا
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا   کس قدر یارب! ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا
حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو   دل بہ دل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا
کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں   جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

شعر۔۱ ناموس: عصمت، حرمت۔ رشتۂ شمع۔ تاگہ جو کہ موم بتی میں ہوتا ہے۔ کسوت: لباس فانوس: چراغ دان جس پر باریک کپڑا لگا ہوتا ہے۔ اسی رعایت سے کسوتِ فانوس کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رات، جب کہ معشوق عصمت و حرمت کی محفل خلوت میں بزم افروز تھا، اس وقت شمع اس کے دیدار سے بے چین و بے قرار تھی، گویا کہ اس کا رشتہ اس کے واسطے خار پیراہن ہو گیا تھا۔

شعر۔۲ مشہد: شہادت گاہ۔ ہلاک حسرت پابوس تھا، پابوسی معشوق کی حسرت میں مر گیا۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کو معشوق کی پابوسی کی کس قدر حسرت تھی کہ گو وہ اسی حسرت میں ہلاک ہو گیا مگر اس کی یہ تمنا نہ گئی کیونکہ اس کے مشہد سے جو کوسوں تک مہندی اُگ آئی ہے، تو اس سے اس کی حسرتِ پابوسی ظاہر ہوتی ہے کہ ممکن ہے کہ معشوق پاؤں میں مہندی لگائے اور اس طرح پابوسی نصیب ہو۔

اسی مضمون کا مرزا صاحب کا ایک فارسی شعر بھی ہے:

لالہ و گل دمد از طرف مزارش پسِ مرگ   تا چہا در دل غالب ہوس روئے تو بود

شعر۔۳ حاصل الفت: محبت کا نتیجہ۔ جز شکست آرزو: سوائے اس کے کہ آرزوؤں کا خون ہو۔ دل بدل پیوستہ: معشوق کے دل سے (عاشق کا) دل ملا ہوا اور دل سے دل ملنا بمعنی محبت کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ محبت کا نتیجہ مایوسی ہوتا ہے، گویا عاشق و معشوق کا دل مل جانا ایسا ہے جیسا کہ لب افسوس کا بن جانا۔

شعر۔۴ کیموس: نام اس صورت غذا کا جو وہ دوسرے مطبخ میں درمیان جگر کے پخت ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بیماری غم کی فراغت کا حال کیا بیان کروں۔ اس بیماری میں تو جو کچھ غذا کھاتا ہوں، وہ بلا کسی صورت اختیار کیے (یعنی یہ کہ پہلے کیلوس بنے اور پھر صورت کیموس بننے کے بعد کہیں جا کر خون بنے) ابتدا ہی میں خون بن جاتی ہے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے   صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
قاصد اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے   اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

شعر۔۱ یعنی وہ آئینہ میں اپنی صورت دیکھتے ہی خود اپنے اوپر فریفتہ ہو گئے۔ پس ان کا یہ غرور کہ ہم کسی پر عاشق ہی نہیں ہو سکتے، مٹ گیا۔

شعر۔۲ عاشق ازراہِ رشک یہ نہیں چاہتا کہ اس کا معشوق اپنے ہاتھ سے کسی غیر کو قتل بھی کرے اس

لیے کہتا ہے کہ اگر قاصد نے اب تک میرا پیغام پہنچا دیا تو اس وجہ سے اس بچارے غریب کو کیوں قتل کرتے ہو۔ اس میں اس کی تو کوئی خطا نہیں۔ پیغام تو میں نے بھیجا ہے، اس لیے مجھ کو قتل کر لیجیے۔

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا   جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے   ہوں شمع کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں   شایانِ دست و خنجر قاتل نہیں رہا
بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے   یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن   غیراز نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار   لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں   حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا
بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

شعر۔۱ نیاز: نیازمندی، احتیاج۔ جس دل پہ ناز تھا: اس وجہ سے کہ وہ ناز برداری یار کا متحمل ہو سکے گا۔ مطلب یہ ہے کہ بیوفائی کے صدمے اٹھاتے اٹھاتے اب وہ دل ہی نہیں رہا جو ناز برداری یار کا متحمل ہو سکتا تھا اور جس کے بل بوتے پر ہم عشق کی نیازمندی کا دعویٰ کیا کرتے تھے۔ حاصل یہ ہے کہ اب ہم اس قابل نہیں رہے کہ عشق کر سکیں۔

شعر۔۲ شمع کشتہ: بجھی ہوئی شمع۔ درخورِ محفل: محفل کے لایق۔ محفل سے مراد دنیا ہے۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔۳ شایان: قابل۔ قاتل: معشوق۔ مطلب یہ ہے کہ میری حالت اب ایسی غیر اور نازک ہو گئی ہے کہ قاتل کو مجھ پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ایسے زندہ درگور کو قتل کرنا اس کے شایانِ شان نہیں۔ اس لیے مجھ کو مرنے کی اب کوئی دوسری فکر کرنی چاہیے:

آں شکارم من کہ ہم لایق بہ کشتن نیستم   شرم می آید مرا ازانکس کہ صیادِ من است

شعر۔۴ بروئے شش جہت، یعنی ہر چیز کے لیے۔ یاں یعنی زمانہ کے یاں، مطلب یہ ہے کہ

جس طرح آئینہ قبولِ عکس میں کسی ناقص و کامل چیز کا امتیاز نہیں کرتا بلکہ اس میں ہر چیز کا عکس آ جاتا ہے، اسی طرح زمانہ بھی ناقص و کامل کا امتیاز نہیں کرتا بلکہ سب کو ایک لکڑی ہانکتا ہے۔ اس شعر میں زمانہ کی شکایت کی ہے۔

شعر۔۵ وا کر دیے: کھول دیے: بند۔ بندش۔ غیراز نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا، یعنی سب پردے تو اٹھ چکے ہیں صرف نگاہ (کا پردہ) حائل ہے (جو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتی)۔

شعر۔۶ رہین: وہ شے جو گرو رکھی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ گو میں مبتلائے مصیبت زمانہ اور ستم زدہ رہا، لیکن تب بھی تجھ کو نہیں بھولا۔

شعر۔۷ ہوائے کشتِ وفا: وفا کی آرزو۔ حاصل اول کے معنی نتیجہ اور دوم کے معنی پائی ہوئی چیز۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ کو وفا کی آرزو جاتی رہی، کیونکہ اس کا نتیجہ سوائے حسرت حاصل کچھ نہیں ہوتا۔

شعر۔۸ یعنی اسدؔ مجھ کو ظلمِ عشق سے تو خوف نہیں معلوم ہوتا، لیکن بات دراصل یہ ہے کہ وہ دل جوان تمام مظالم کو برداشت کیا کرتا تھا، اب نہیں رہا۔

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف   عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا؟
ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے   گردشِ مجنوں، چشمک ہائے لیلیٰ آشنا
شوق، ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز   ذرۂ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا
میں اور ایک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے   عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیے   میرا زانو، مونس اور آئینہ تیرا آشنا
ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار   سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل ناآشنا
کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

شعر۔۱ یعنی رشک کی وجہ سے، جو مجھ کو ہے، غیروں سے محبت کرتے ہوئے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے، تو عقل مجھ کو سمجھاتی ہے کہ افسوس کرنا فضول ہے کیونکہ وہ بے مہر کسی کا بھی دوست نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ کہ وہ (غیر کو) محبت دکھلاتا ہے وہ صرف ظاہری واز راہ تصنع ہے، ورنہ وہ دراصل غیر کا بھی دوست نہیں۔

شعر۔۲ نیرنگ: طلسم۔ مجازاً، دُنیا چشمک: آنکھ سے اشارہ کرنا، ساغر سے گردش کے معنی لیے ہیں اور ساغر کی رعایت ہی سے میخانۂ نیرنگ کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے کہ گردشِ مجنوں، لیلیٰ کے اشارہ کی پابند تھی (یعنی جو وہ اشارہ کرتی تھی مجنوں وہی کرتا تھا) اسی طریقہ سے دنیا کا ذرہ ذرہ بھی ساغر میخانۂ نیرنگ بنا ہوا ہے اور ساقیِ ازل کی جنشِ ابرو پر موجودات کی حرکت کا مدار ہے۔

مولانا عبدالباری صاحب اس شعر کا مطلب اس طرح بیان کرتے ہیں۔ ''دنیا کا ذرہ ذرہ بوقلمونی اور دگرگونی کے میخانہ کا ایک ساغر ہے جو انسان کو حیران اور بیخود بنا دیتا ہے۔ دیکھیے جو گردش، مجنوں کے لیے گردش، یعنی تکلیف دہ ہے، وہی گردش لیلیٰ کی آنکھوں میں بھلی معلوم ہوتی ہے اور ان کو پیاری ہے۔''

شعر۔۳ شوق: عشق۔ ارباب عجز: عشاق۔ مطلب یہ ہے کہ عاشقوں کے لیے عشق ہی ان کی نازش کا سامان مہیا کرتا ہے، یعنی ان کا سرمایۂ ناز عشق ہے اور وہ عشق ہی پر ناز کیا کرتے ہیں کیونکہ اس کی بدولت ذرّہ، صحرا ہو جاتا ہے اور قطرہ، دریا:

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے   مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کردیا

شعر۔۴ یعنی تو ہمیشہ بناؤ سنگار میں مشغول رہتا ہے، اس لیے تیری نظر تو ہر وقت آئینہ پر لگی رہتی ہے، لیکن میں ہمیشہ تیری جدائی کی فکر میں سر بہ زانو رہتا ہوں۔ اور چونکہ آئینہ کو زانو سے مشابہت ہے، اس لیے ہم دِونوں برابر ہیں۔ ایک دوسرے سے شکایت کی گنجایش نہیں۔

شعر۔۵ میں کے بعد لفظ 'ہوں' محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں ایک ایسا وحشی دل رکھتا ہوں جو عافیت (آرام) سے نفرت کرتا اور آوارگی کو جس میں کہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پسند کرتا ہے۔

شعر۔۶ مطلب یہ ہے کہ اجزائے بہار سبزہ، صبا اور گل، سب ایک شیرازۂ وحشت میں بندھے ہوئے ہیں۔ یعنی سب میں وحشت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ سبزہ کو بیگانہ، صبا کو آوارہ اور گل کو نا آشنا سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔

شعر۔۷ یہ شعر فرہاد پر طنزاً کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوہ کن (فرہاد) کا عشق سچا نہ تھا بلکہ وہ صرف ایک نقاش تھا جو کہ پتھروں سے کاٹ کر شیریں کا بت بنایا کرتا تھا۔ شاعر طعن سے کہتا ہے کہ کہیں پتھروں سے سر پھوڑنے، یعنی پتھروں کے بت بنانے سے معشوق پیدا ہوا کرتے ہیں۔

طباطبائی صاحب اس کے معنی اس طرح بیان فرماتے ہیں ''یعنی فرہاد فقط نقاش تھا۔ عاشق صادق نہ تھا۔ نہیں تو تعجب ہے کہ سنگ سے سر مارے اور اس سے معشوق نہ نکل آئے۔''

جناب سید ہاشمی صاحب نے رسالہ اردو میں طباطبائی صاحب کے اس مطلب پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے ''اس شرح سے صاف مطلب سمجھ میں نہیں آتا اور فرہاد کا نقاش ہونا بھی کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔'' مولانا حسرت موہانی مد ظلہم نے اپنی شرح میں اس دشواری کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر بہت تکلف ہو گیا۔ لکھتے ہیں ''کوہکن نے بہت عرق ریزی کی پھر بھی تمثال شیریں کو نہ پیدا کر سکا، نہ کہ خود شیریں کو......'' لیکن جناب حکیم امتیاز الدین صاحب مد ظلہم اس شعر کے جو معنی بیان فرماتے ہیں وہ سب سے الگ۔

جناب ممدوح کے نزدیک یہاں لفظ شیریں، علم نہیں بلکہ اسم صفت اور محض خوئے دل آویز کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور شعر کا مفہوم یہ ہے کہ فرہاد اپنی یادگار میں ایک اچھی تمثال یا مثال کا نقش بنا گیا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ پتھروں سے سر پھوڑ کر محبوب ہاتھ نہیں آسکتا۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا   بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں، یارب   آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے   عرش سے اِدھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا
دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے   بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا
دردِ دل لکھوں کب تک؟ جاؤں ان کو دکھلادوں   انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا   ننگِ سجدہ سے میرے، سنگِ آستاں اپنا
تا کرے نہ غمازی، کرلیا ہے دشمن کو   دوست کی شکایت میں، ہم نے ہم زباں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

شعر۔۱ ''کہتا ہے کہ میں نے جو معشوق کے حسن کی تعریف کی تو جو شخص میرا محرم راز و ہمنشیں تھا، وہی سن کے میرا رقیب بن گیا، کیونکہ اوّل تو ایسے پری وش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ جیسے جادو

بیان کی زبانی۔" (یادگار غالب)

شعر۔٢ مطلب یہ ہے کہ معشوق نے جو بزمِ غیر میں کثرت سے شراب پی کہ شراب نوشی اور خودداری کا امتحان کرے، تو وائے قسمت، کیا ان کے امتحان کا دن بھی آج ہی تھا، جبکہ وہ بزمِ غیر میں تھے۔

شعر۔٣ مطلب یہ ہے کہ کاش ایسا ہوتا کہ ہمارا مکان عرش سے اس طرف ہوتا تا کہ اپنے مکان کی حالت دیکھنے کے لیے ہم عرش پر ایک منظر اور بنا سکتے۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ ہمارا مکان عرش سے بھی اونچا ہے اور اس سے بلند کوئی جگہ بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو اپنی حقیقت و ماہیت کی بالکل خبر نہیں۔ ایک طریقہ سے مرزا نے اس شعر میں اپنی رفعت کا اظہار بھی کیا ہے۔

شعر۔٤ "یعنی خوب ہی ہوا کہ معشوق کے در کا پاسبان ہمارا جان پہچان نکلا۔ اب ہمارے لیے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ہم کو ذلت دے۔ اس کو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے اور یہ ظاہر کرتے رہیں گے کہ یہ ہمارا قدیم آشنا ہے اور ہمارا اس کا قدیم سے یہی برتاؤ ہے۔"

(یادگار غالب)

شعر۔٥ خامہ خوں چکاں اپنا: یعنی میرے قلم سے خون ٹپکنے لگا۔ یا تو لکھتے لکھتے انگلیوں کے فگار ہونے کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ مضمون پُرسوز تھا۔

شعر۔٦ عبث بدلا: فضول بدلا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ نے اس شرم سے کہ مجھ جیسے بدنصیب نے اس پر سجدہ کیا ہے فضول اپنے سنگِ آستاں کو بدلا کیونکہ وہ سجدہ کرتے کرتے خود اپنے آپ گھس جاتا۔

شعر۔٧ غمازی: سخن چینی۔ طعنہ زنی: شکایت۔ مطلب یہ ہے کہ اس خیال سے کہ وہ دوست جا کر نہ کہہ دے کہ میں اس کی شکایت کرتا تھا، میں نے خود دشمن کو بھی دوست کی شکایت میں اپنا شریک بنا لیا ہے۔ (کیونکہ ایسی صورت میں وہ کہنے سے خود بھی ماخوذ ہوتا ہے)

شعر۔٨ "آسمان کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بتلائے ہیں۔ اور اپنی دانائی اور ہنرمندی کس خوبصورتی سے ثابت کی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آسمان اسی شخص کا دشمن ہوتا ہے جو کہ دانا اور ہنرمند ہو، پس چونکہ غالب نے آسمان کو اپنا دشمن بتلایا ہے، اس لیے ایک طریقہ سے اپنے کو دانا اور ہنرمند بتلایا ہے۔" (یادگار غالب)

سرمۂ مفتِ نظر ہوں مری قیمت یہ ہے   کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں اپنا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم   تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں اپنا

شعر۔١ سرمۂ مفتِ نظر ہوں، یعنی میرے کلام کی کوئی قیمت نہیں۔ خریدار، مجازاً سننے والا (کلام کا)

شعر۔٢ یعنی اگر تو نالہ کی اجازت نہ دے گا تو ہم اس کو ضبط کریں گے اور چونکہ دل کا اثر دل پر ہوتا ہے، اس لیے میرے ضبط کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا اثر تجھ پر بھی ہوگا۔ اس لیے تو مجھ کو نالہ کی اجازت دے دے، ورنہ ایسا نہ ہو کہ میرا غمِ پنہاں تیرے چہرے سے ظاہر ہونے لگے۔

غافل، بہ وہمِ ناز خود آرا ہے، ورنہ یاں   بے شانۂ صبا نہیں، طرہ گیاہ کا
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ   صیدِ زدام جستہ ہے اس دام گاہ کا
رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے   شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے   پُرگل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا
جاں، در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسد
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

شعر۔١ غافل: انسان کی طرف خطاب ہے۔ شانہ: کنگھی۔ طرہ: زلف، پیشانی کے بال۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی غفلت کی وجہ سے جو اپنی کارکردگی پر ناز کرتا ہے کہ میں نے یہ کیا اور میں نے وہ کیا تو یہ اس کی سراسر غلطی ہے کیونکہ جس طریقہ سے ایک طرۂ گیاہ (گھاس) بھی ایسا نہیں کہ جس کو (مشاطۂ غیب) صبا شانہ کر کے آراستہ نہ کرتی ہو، اسی طریقہ سے دنیا میں کوئی ایسا کام نہیں جو کہ بغیر مرضی خداوند تعالیٰ کے ہوتا ہو۔ انسان کا اس پر ناز کرنا بالکل بیجا ہے۔

شعر۔٢ بزمِ قدح: محفلِ عشرت جہاں کہ شراب پی جا رہی ہو، مراد دنیا۔ صید زدام جستہ: جال سے نکلا ہوا شکار۔ دام گاہ۔ شکارگاہ یعنی بزمِ قدح۔ مطلب یہ ہے کہ بزمِ مے نوشی سے عیش کی امید نہ رکھ۔ کیونکہ اس محفل کا رنگ (عیش) ایک ایسے شکار کی مانند ہے جو کہ جال سے نکل گیا ہو۔ (یعنی جو کہ قابو سے باہر ہو) حاصل یہ ہے کہ رنگ بزمِ مے نوشی (عیشِ دنیا) ایک فانی و بے ثبات چیز ہے۔ جس پر انسان کا کوئی قابو نہیں۔ اس لیے تو فضول اس کی تمنا مت کر۔

شعر۔ ۳ کیا بعید ہے: یعنی کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں، جو اپنے گناہوں کی وجہ سے شرمندہ ہوں اور اس لیے مارے شرم کے ان کی کوئی معذرت نہیں کرتا تو کیا عجب ہے کہ خداوند کریم میری شرمندگی کو دیکھ کر اپنی رحمت و کرم سے میرے گناہوں کو معاف کر دے۔

شعر۔ ۴ اپنے زخم کو پھول سے مشابہ کر کے اپنے کثرت شوق شہادت کا اظہار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں مقتل کو شوق شہادت میں بڑی خوشی سے جاتا ہوں اور جب کبھی کہ مجھ کو زخم کا خیال آجاتا ہے تو گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ میری نگاہ کا دامن پھولوں سے بھرا ہے، یعنی زخموں سے پھولوں کی طرح تسکین ہوتی ہے۔ مرزا ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

عجب نشاط سے جلاّد کے چلے ہیں ہم آگے
اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

ڈاکٹر عبدالرحمٰن مرحوم لکھتے ہیں۔ ”عاشق کے مقتل کو جانے کا اندازہ ممکن نہیں۔ دامن نگاہ، یعنی بہر کجا کہ می نگرم (جس طرف دیکھتا ہوں) تمام افق زخموں کے خیال کی بہار سے پُر گل ہے۔ یہ گلزار عاشق گلزار خلیل اللہ سے کم نہیں۔“

شعر۔ ۵ ہوا: خواہش۔ دادخواہ یعنی اسدؔ۔ مطلب یہ ہے کہ اے محبوب، اسد کی جان تیری ایک نگاہ کرم کی متمنی ہے اور تیرے اس دادخواہ (اسد) کا وکیل پروانہ ہے۔ یعنی جس طریقہ سے کہ پروانہ شمع کی ایک نگاہ کرم سے جل جاتا ہے، اسی طریقہ سے میں بھی تیری ایک نگاہ کرم سے جل جانے کی تمنا رکھتا ہوں۔ پروانہ وکیل اس لیے ہے کہ وہ معشوق کے سامنے شمع کی نگاہ کرم سے جل جانے کی نظیر پیش کرتا ہے۔ شمع کی نگاہ کے ساتھ تشبیہ عام ہے۔

جَور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا؟ کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا؟
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا؟
ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟
موجِ خوں سر سے گزر رہی کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا؟
پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

شعر۔ ۱ یعنی تم نے ظلم سے تو توبہ کر لی لیکن یہ توبہ کچھ توبہ نہ ہوئی، کیونکہ تم مجھ کو شرمندگی سے منہ نہیں دکھلاتے۔ میرے لیے توبہ بھی ستم ہے لہٰذا تم جور سے باز نہ آؤ۔

شعر۔ ۲ صبر کی تلقین کی ہے مطلب یہ ہے کہ رات دن آسمان گردش میں ہے انقلاب ہوتا رہتا ہے۔ ضرور کوئی نہ کوئی انقلاب ہمارے بھی مناسب حال ہوگا۔ زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

شعر۔ ۳ ”لاگ دشمنی اور لگاؤ محبت۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی۔ اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس لیے کہ اس میں ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے، ہم اس کو دوستی سمجھتے لیکن جب دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں۔ قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے، لاگ اور لگاؤ ایسے دو لفظ بہم پہنچائے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو چہار چاند کر دیا ہے۔“ (یادگار غالب)

شعر۔ ۴ ”نامہ بر کو خط دے کر ہم اس کے ساتھ ساتھ کیوں ہو لیے۔ یا اللہ ہمیں کیا ہو گیا کہ اپنے خط کو آپ پہنچائیں۔ اس سے کمالِ رشک اور جنون کا اظہار دونوں مطلب لیے جا سکتے ہیں۔“ (آسی)

شعر۔ ۵ یعنی خواہ قتل ہی کیوں نہ ہو جاؤں، لیکن آستان یار سے نہیں اٹھوں گا۔

شعر۔ ۶ ”دکھلائیں کیا کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے۔ کہتا ہے کہ عمر بھر تو موت کا انتظار کرتا رہا کہ مر جانے پر کچھ راحت مل جاوے گی۔ اب مر تو گئے ہیں، دیکھیے کیا دکھلاتے ہیں۔ خوشی ملے گی یا وہی رنج کا رنج۔“ (یادگار غالب)

شعر۔ ۷ یعنی ان سے عشق کرتے کرتے یاں تو ساری عمر گزر گئی، وہاں ان کے تغافل کا یہ حال ہے کہ میرا نام سن کر اب بھی پوچھتے ہیں کہ غالبؔ کون ہے؟ اب کوئی بتلائے کہ ہم اس کے اس سوال کا کیا جواب دیں؟

زمردم یار می پرسد کہ حالے کیست طالع بیں کہ عمرم در محبت رفت و کار آخر رسید اینجا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی   چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
حریفِ جوششِ دریا نہیں خود داریِ ساحل   جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

شعر۔۱ لطافت: مجردات۔ کثافت: مادہ۔ چمن کو سبزہ کی مناسبت سے زنگار کہا ہے اور چونکہ آئینہ کو جلوہ دینے کے واسطے زنگار کی ضرورت ہے تو اسی رعایت سے آئنہ بہاری کے ساتھ زنگار چمن ملایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لطافت، بے تعلق کثافت جلوہ گر نہیں ہو سکتی۔ یعنی مجردات کا بغیر مدد مادہ کے جلوہ نہیں ہوسکتا، جس طریقہ سے کہ لطافت آئینہ بہار بغیر کثافت زنگار چمن اپنا جلوہ نہیں دکھا سکتی۔

شعر۔۲ حریف: مدمقابل۔ حریف جوشش دریا نہیں خود داری ساحل۔ یعنی یہ ممکن نہیں کہ دریا بھی طغیانی پر ہو اور ساحل کی خود داری بھی رہ جاوے (یعنی اپنے آپ کو طغیانی سے بچا سکے) مطلب یہ ہے کہ جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل اگر لاکھ کوشش کرے تب بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح جہاں تو ساقی ہو (یعنی جہاں تیرا دریائے مے موجزن ہو) وہاں دعویٰ ہشیاری (یعنی نشہ سے محفوظ رہنے کا دعویٰ) بالکل غلط ہے۔ ساقی کو دریائے موجزن اور اپنے آپ کو ساحل سے تشبیہ دی ہے۔ یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا   درد کا حد سے گزرنا، ہے دوا ہوجانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفل ابجد   تھا لکھا، بات کے بنتے جدا ہوجانا
دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام   مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہوجانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ   اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہوجانا
ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا   باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہوجانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال   ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہوجانا
ہے، مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا   روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہوجانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس   کیوں ہے؟ گردِ رہِ جولانِ صبا ہوجانا

تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل   دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہوجانا
بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہوجانا

شعر۔۱ اس شعر کے معنی مولوی محمد مہدی صاحب نے رسالہ اردو میں نہایت خوبی وتوضیح سے بیان فرمائے ہیں۔ لکھتے ہیں "جب درد حد سے گزر جاتا ہے تو وہی مریض کے لیے دوا ہوجاتا ہے اور مریض کے لیے درد کا دوا ہوجانا یہ ہے کہ فنا کر دیتا ہے اور مریض کو نجات ہوجاتی ہے۔ یعنی وہ قیدِ ہستی سے رہا ہوکر اپنے مبدا سے واصل ہوجاتا ہے اور قطرہ کے لیے یہی باعث مسرت ہے کہ وہ دریا میں فنا ہوجائے۔"

شعر۔۲ قفل ابجد: ایک قفل ہوتا ہے جس پر حروف ابجد لکھے ہوتے ہیں۔ ان حروف کو ایک خاص طور پر ترتیب دینے سے قفل کھل جاتا ہے۔ بات بننا: تدبیر کارگر ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے کہ جیوں ہی کہ حروف ایک خاص طور پر بن جاتے ہیں قفل ابجد کھل جاتا ہے۔ یعنی کڑا الگ ہوجاتا ہے اسی طریقہ سے بدقسمتی سے میری بات بنی ہی تھی کہ مجھ کو تجھ سے علاحدہ ہونا پڑا۔

شعر۔۳ چارۂ زحمت: تکلیف رفع کرنے کے لیے تدبیر۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے کہ گانٹھ کو کھولتے کھولتے اگر دیر ہوجاتی ہے تو وہ گھس کر اور بھی تنگ ہوجاتی ہے اور اس کا کھلنا اور بھی دشوار ہوجاتا ہے۔ اسی طریقہ سے کشمکش چارۂ زحمت عقدۂ دل میں میری عقدۂ دل گھس کر اور بھی تنگ ہوگئی اور اس کا کھلنا بالکل ناممکن ہوگیا۔ اس طرح میرے دل کا رہا سہا بھی کام تمام ہوگیا۔

شعر۔۴ اربابِ وفا: عشاق۔ مطلب یہ ہے کہ عشاق سے اللہ اللہ (کلمہ تعجب) اب اتنی بیزاری اور دشمنی کہ ان پر جفا کرنا بھی گوارا نہیں:

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ   ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

شعر۔۵ یعنی جب روتے روتے میں اتنا ضعیف ہوگیا کہ آنسو نکلنے بند ہوگئے اور ان کی بجائے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس آنے لگے تو اس وقت مجھ کو مسئلہ استحالہ عناصر کا یقین ہوا کہ پانی بھی ہوا ہوجاتا ہے، ورنہ اس سے پہلے میں اس کا قائل نہ تھا۔

شعر۔۶ یعنی جس طریقہ سے گوشت سے ناخن کا جدا ہونا محال ہے، اسی طرح سے تیری انگشت

حنائی کا خیال میرے دل سے مٹنا ناممکن ہے۔

شعر۔۷ یعنی غمِ فرقت میں روتے روتے فنا ہو جانا میرے لیے ایک ایسی معمولی بات ہے یا اس قدر باعث انبساط ہے کہ جیسے ابر بہاری کا برس کر کھلنا۔

شعر۔۸ مطلب یہ ہے کہ اگر نکہت گل (پھولوں کی خوشبو) کو تیرے کوچہ کی آرزو نہیں تو پھر وہ کیوں صبا کے راستہ کی گرد بن جاتی ہے۔ یعنی وہ پھر ہوا میں کیوں شامل ہوتی ہے۔ اس کے ہوا میں مل جانے سے صاف ظاہر ہے کہ اس کو ضرور تیرے کوچہ کی ہوس ہے۔

شعر۔۹ آئینہ فولادی کا سبز (زنگ آلودہ) ہو جانا ایک کرشمہ ہے جس کی تاویل شاعر یوں کرتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ آئینہ کو صیقل پذیر ہونے کی آرزو ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس کرشمۂ آرزو کو دیکھنا کہ آئینۂ فولاد کی ہیئت بدل جاتی۔ اکثر شارحین نے ہوائے صیقل سے برسات کی آب و ہوا مراد لے کر معنی لکھے ہیں، لیکن وہ زیادہ قرین قیاس نہیں۔

شعر۔۱۰ وا: کھلا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ باغ میں رنگ برنگ کے جو پھول کھلے ہوئے ہیں، ان سے دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے آنکھ کو ہر صورت میں کھل جانا چاہیے اور گلہائے رنگارنگ کی سیر کرنی چاہیے۔

ردیف ب

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب   دے بطِ مے کو دلِ دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت وجہِ سیہ مستیِ اربابِ چمن   سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے   سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر   موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب
جس قدر روح بناتی ہے جگر تشنۂ ناز   دے ہے تسکین بدمِ آبِ بقا موجِ شراب
بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر   شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال   ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب
نشے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ   بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل   موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل   رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ، اسدؔ
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

شعر۔۱ ہو بال کشا موج شراب: موجِ شراب اپنا پر کھولے، یعنی دورِ شراب جاری ہو۔ وقت ہوا: برسات آئی اور موسم بہار شروع ہو گیا۔ بطِ مے: صراحی شراب جو بہ شکل بطخ ہوتی ہے۔ دے دل دست شنا۔ تیرنے کی قوت و ہمت عطا کر، تا کہ موجِ شراب رندوں تک پہنچ سکے۔ مطلب یہ ہے کہ موسم بہار آ گیا ہے۔ اس لیے شراب نوشی کا دور شروع ہونا چاہیے۔

شعر۔۲ ارباب چمن: درخت و پودے۔ تاک: انگور کی بیل۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو باغ میں درخت و پودے جھوم رہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہوا چونکہ سایۂ تاک میں ہو کر آتی ہے اس لیے اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے اور وہ تمام ارباب چمن کو بدمست کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم اس کے معنی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ موسم باراں میں ابر باراں کا زور ہے۔ باغ سے تا باغبان، سب شورہ بور ہیں۔ درخت جوششِ شباب سے سبز ہو گئے ہیں گویا سیہ مست رندانِ چمن وجد میں ہیں تمام باغ پر سرور کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ میر حسن لکھتے ہیں:

گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا   انہی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر   نشہ کا سا عالم گلستان پر

مرزا کہتے ہیں کہ نم بارش آلود ہوا، خوشۂ انگور کے مس سے لطیف شراب ہو جاتی ہے۔

شعر۔۳ سر سے گزرے پہ بھی ہے: یعنی اگر نشہ حد سے بھی زیادہ ہو جائے۔ یہ فقرہ ہما کے سر سے گزرنے کی رعایت سے لایا گیا ہے، جو اپنی جگہ پر نہایت ہی خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ یعنی جو کوئی بھی شراب پیتا ہے، وہ بہت ہی خوش قسمت ہے۔ اعتدال کے ساتھ پینے کو تو کیا کہنے۔ اس کی تو کچھ تعریف ہی نہیں ہو سکتی، لیکن افراط سے بھی پی جاوے تو بھی وہ ایسی ہی عمدہ ہے جیسا کہ بال ہما۔

شعر۔۴ یعنی آجکل موسم بہار کی وجہ سے ہوا میں بڑی تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ فیض ہوا، جہاں اس نے بڑی بڑی بنجر اور اسیر زمینوں کو اپنے کرم (تاثیر) سے سرسبز و شاداب کیا ہے، وہاں موج ہستی کو بھی موج شراب بنا دے۔ یعنی اس کے سرور کی وجہ سے تمام عالم میں وجد پیدا ہو جائے۔

شعر۔۵ بہار کو جوششِ دریا سے تشبیہ دی ہے اور اس طوفان طرب (بہار کی) چار قسم کی موجیں ہیں۔ موج گل، موج شفق، موج صبا، موج شراب۔ چونکہ یہ سب چیزیں نشاط افزا اور باعث تفریح ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بہار کا موسم آگیا ہے۔ ہر طرف سرور اور خوشی کے سامان مہیا ہیں۔ چاروں طرف رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ آسمان پر ہر طرف شفق پھولی ہوئی ہے۔ نسیم ادھر ادھر اٹھکھیلیاں کرتی پھرتی ہے۔ اور جا بجا شراب کا دور چل رہا ہے۔

شعر۔۵ روح نباتی: قوت نمو۔ جگر تشنہ: شایق۔ تشنہ کی رعایت سے دم آب بقا لایا گیا ہے۔ ناز سے مراد اینڈنا اور کھینچنا ہے جو کہ لازم فخر و ناز ہے اور نشو و نما کے خواص میں سے ہے۔ آب بقا۔ آب حیات۔ مطلب یہ ہے کہ جس قدر قوت نمو مشتاق ناز ہے، اسی قدر موجِ شراب آبِ حیات بن کر اس کو تسکین دیتی ہے۔ یعنی شراب قوت نمو کے حق میں وہی کام کرتی ہے جو کہ بارش نباتات کے حق میں۔ حاصل یہ کہ شراب سے قوت نمو، جشن اور ناز میں ترقی ہوتی ہے۔

شعر۔۶ شہپر: وہ پر کہ جس کے ذریعہ سے پرند پرواز کرتا ہے۔ رنگ سے بیل پتوں وغیرہ کی سبزی کی طرف اشارہ ہے۔ رنگ کے اڑنے کی رعایت سے الفاظ شہپر رنگ اور بال کشا استعمال کیے گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شراب انگور کی بیل کی رگوں میں خون کی مانند دوڑ رہی ہے اور پتوں وغیرہ میں رنگ بن کر نمودار ہوتی ہے۔

شعر۔۷ موج شراب کو موج گل سے اور ہجوم گل کو چراغاں سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تصورِ موج شراب سے گزرگاہ خیال میں چراغاں کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس طریقہ سے موجِ شراب چونکہ موجِ گل سے مشابہ ہے، اس لیے تصور موج شراب سے موج گل کا خیال پیدا ہوتا ہے اور چونکہ ہجوم گل چراغاں سے مشابہ ہے، اس لیے سبب، در سبب تصور موج شراب سے گزرگاہ خیال میں چراغاں کی سی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔

شعر۔۸ سر نشو و نما: (دماغ کے) نشو و نما کا خیال۔ مطلب یہ ہے کہ شراب کو دماغ کے نشو و نما کا خیال ہے۔ اس لیے وہ نشہ کے پردے میں دماغ کا معائنہ کر رہی ہے۔

شعر۔۹ طوفانی: جوش و خروش کا اظہار کرنے والی۔ مطلب یہ ہے کہ موجِ سبزۂ نوخیز سے لے کر موجِ شراب تک سب ایک ہی رنگ یعنی مستی کے عجیب عالم میں ہیں اور تمام چیزیں یکساں طور پر جوشش فصل بہار کا اظہار کر رہی ہیں۔

شعر۔۱۰ شرح ہے: یعنی پوری پوری حقیقت بتا رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ (موسم گل) بھی مانند ہنگامہ ہستی چند روزہ اور خوشگوار ہے۔ رہبر قطرہ بہ دریا ہے۔ اس لیے کہ شراب میں نشہ اور ایک قسم کی بیخودی ہوتی ہے جو فنا سے مشابہ ہے اور فنا ہو کر قطرہ دریا میں مل جاتا ہے۔ پس رہبر قطرہ بہ دریا۔

مولوی محمد مہدی صاحب اس شعر کے معنی اس طرح بیان فرماتے ہیں۔ ”زندگی میں اپنے مبدا تک رسائی کا ذریعہ معرفت الٰہی ہے۔ اس شعر میں یہی مضمون ہے۔ کہتے ہیں کہ موسم بہار کیا عجب چیز ہے کہ اس سے ہنگامہ ہستی کی شرح ہوتی ہے، یعنی جس طرح خزاں میں تمام اشجار بے برگ و بار ہوتے ہیں اور بہار آتے ہی رنگا رنگ کے پھول کھل جاتے ہیں، درخت ہرے بھرے ہو جاتے ہیں، اسی طرح موجودات ظہور میں آئے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں شراب کی تعریف ہے۔ موجِ شراب کیا اچھی چیز ہے کہ قطرہ کو دریا تک پہنچا دیتی ہے۔ یہاں شراب سے شراب معرفت مراد ہے۔ (از رسالہ اردو)

شعر۔۱۱ مطلب یہ ہے کہ اسد جلوۂ گل یعنی موسم بہار کو دیکھ کر میرے ہوش اڑے جاتے ہیں اس لیے کہ زمانہ (موسم بہار) آگیا کہ پھر دور شراب شروع ہو۔ 'ہوش اڑ جانا' اس مناسبت سے کہا ہے کہ شراب سے بھی ہوش و حواس جاتے رہتے ہیں۔

ردیف ت

افسوس، کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر، انگشت

کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا   خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر، انگشت
لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

شعر۔۱ عقد: سلک، لڑی۔ دنداں کا کیا رزق، یعنی انگشت حسرت بدنداں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ افسوس جن لوگوں کی انگلی سلک گہر کے قابل تھی یعنی جن کو اپنے کمال کی وجہ سے قدرت کو متمول اور خوشحال بنانا چاہیے تھا، وہ سبب افلاس، دندانِ حسرت سے انگلیاں کاٹ رہے ہیں۔ حاصل یہ کہ صاحب کمال، مفلسی و حسرت سے زندگی بسر کرتے ہیں اور نااہل چین و آرام کے ساتھ۔ بعض نسخوں میں بجائے دنداں کے ''دیداں'' ہے۔ اس صورت میں اس شعر کے معنی یہ ہوں گے کہ جن لوگوں کی انگلیاں ان کے کمال کی وجہ سے سلک گہر کے قابل تھیں، ان کو ہنر و کمال کے دشمن، فلکِ کج رفتار نے فنا کر کے کیڑوں کا رزق بنا دیا۔

شعر۔۲ قاعدہ ہے کہ جدا ہوتے وقت اکثر اپنے دوستوں کو چھلّا یا انگوٹھی دیا کرتے ہیں تا کہ اس کی یادگار رہے اور وہ اس نشانی کو دیکھ کر اس کو کبھی نہ بھولے کہ فلاں شخص نے دی تھی۔ پس شاعر کہتا ہے کہ تو نے جو مجھ کو چلتے وقت کوئی چھلّا نہیں دیا اور یہ دکھلایا کہ انگلی خالی ہے، ورنہ ضرور دیتا، تو تیری یہی عنایت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ یا یہ کہ چلتے وقت تیرا چھلّا نہ دینا، بلکہ دینے کی بجائے صرف انگوٹھا دکھا دینا۔ تیرا یہی انداز مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔

شعر۔۳ سخن گرم: موثر کلام۔ کسی چیز پر انگشت حرف رکھنا: یعنی کسی کا عیب نکالنا۔ مرزا صاحب نے نہایت ہی لطیف پیرایہ میں اور نہایت ہی عمدہ تشبیہ کے ساتھ اس خیال کو کہ میں ایسا اچھا کلام لکھتا ہوں کہ اس کی خوبی کی وجہ سے کوئی شخص اعتراض کر ہی نہیں سکتا بیان کیا ہے۔ اپنے خیال کو اتنا گرم بتلانا کہ گرمی کی وجہ سے کوئی اس پر انگشت ہی نہ رکھ سکے، بالکل نرالی تشبیہ ہے۔
مومن کا بھی ایک شعر ہے:

کیا بات میرے حرف پہ انگشت رکھ سکے   ہر خط پہ نکتہ چیں کو ہے وہم و گمانِ تیغ

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت   پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

جگر کو مرے عشق خوں نابہ مشرب   لکھے ہے ''خداوندِ نعمت سلامت''
علی الرغم دشمن شہیدِ وفا ہوں   مبارک مبارک، سلامت سلامت
نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی   تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

شعر۔۱ یعنی اگر کوئی قیامت تک بھی زندہ رہ جاوے تو کیا۔ پھر بھی آخر کو موت ہے۔

ع   جب فنا ٹھہری تو کیا سو برس کیا ایک دن

شعر۔۲ خونابہ: خالص خون۔ مشرب: پینے والا۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ عشق نے میرا خون جگر پیا ہے، اسی لیے وہ اس کو اس القاب سے (یعنی خداوند نعمت سلامت) خطاب کرتا ہے۔

شعر۔۳ علی الرغم: برعکس و برخلاف۔ رغم کے لغوی معنی خاک میں آلودہ ہونے کے ہیں۔ چونکہ کسی کے کام کو خاک میں ملا دینا، گویا اس کے برخلاف کوشش کرنا ہے، اس لیے علی الرغم کے معنی برخلاف لیے گئے ہیں۔ اپنے آپ کو (بیوفا) دشمن کے مقابلہ میں شہید وفا ہونے پر مبارک باد دی ہے۔

شعر۔۴ سروبرگ: سروسامان، مجازاً قوت۔ ادراک: سمجھنا۔ معنی: حقیقت، صورت، ضد، معنی مطلب یہ ہے کہ اگر حقیقت دریافت کرنے کی طاقت نہیں ہے تو تماشائے نیرنگ صورت ہی سہی۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ   یار لائے مرے بالیں پہ اسے، پر، کس وقت

شعر۔۱ یعنی یار کو میرے دوست میرے پاس لائے تو سہی، لیکن بالکل آخری وقت جبکہ میں اس کو پوری نظر دیکھ بھی نہ سکا۔ اسی خیال کو مرزا صاحب نے آگے بھی ایک شعر میں بیان کیا ہے:

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے   خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو، بازارِ دوست   دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست
اے دلِ ناعاقبت اندیش، ضبطِ شوق کر   کون لا سکتا ہے تاب، جلوۂ دیدارِ دوست
خانہ ویراں سازی حیرت، تماشا کیجیے   صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتہ رفتارِ دوست
عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے   کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست
چشمِ ما روشن کہ اس بے درد کا دل شاد ہے   دیدۂ پُرخوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست

غیر، یوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست
تا کہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدار دوست
جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلف عنبر بارِ دوست
چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخی گفتارِ دوست
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجیے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست
یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالب زبس تکرارِ دوست

شعر۔۱ بازار سرد ہے: خریدار کم ہو گئے۔ بازار سرد ہونے کی رعایت سے بجھی ہوئی شمع کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کے چہرے پر خط نکل آنے سے اس کے خریدار کم ہو گئے ہیں اور بازار حسن سرد ہو گیا ہے۔ گویا کہ خط رخسار بجھی ہوئی شمع کا دھواں ہے۔ یعنی جس طریقہ سے کہ شمع گل ہو جانے پر جو صرف دھواں باقی رہ جاتا ہے، اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ اسی طریقہ سے معشوق کی شمع حسن تو گل ہو گئی ہے (یعنی حسن تو جاتا رہا ہے) صرف بچا کچا (دھواں) باقی ہے جس کا کوئی خریدار نہیں۔

شعر۔۲ دل ناعاقبت اندیش: اس لیے کہ تمنائے دیدار معشوق رکھتا ہے جس کی وجہ سے تاب نہیں لاسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اے دل ناعاقبت اندیش تو اپنے معشوق کے دیکھنے کی تمنا مت کر۔ کیونکہ تو اس کے دیکھنے کی ہرگز تاب نہیں لاسکتا۔ یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ اس کا اشارہ قصۂ کوہ طور کی طرف بھی ہے۔

شعر۔۳ خانہ ویراں سازی: گھر کا ویران کرنا، اس کا اجاڑنا۔ تماشا کیجیے: ملاحظہ کیجیے۔ رفتۂ رفتار: رفتار پر مٹا ہوا۔ اپنے آپ کو باعتبار حیرانی و خانہ بربادی، نقش پا سے تشبیہ دی ہے۔

شعر۔۴ مطلب یہ ہے کہ میں اگرچہ بیمار غم یار تھا، لیکن میری موت کا باعث بیداد رشک دشمن ہے کیونکہ مجھ کو از راہ رشک یہ گوارا نہ ہو سکا کہ تو دشمن پر ظلم کرے اور مجھ کو اس لطف سے محروم رکھے، اس لیے اس رشک سے میں مر گیا۔

شعر۔۵ چشم ما روشن: دیدۂ پُر خوں کی سرخی کی رعایت سے کہا ہے اور دل شاد، بہ رعایت ''چشم ما روشن۔'' مطلب یہ ہے کہ ہماری آنکھوں کو خون آلود دیکھ کر چونکہ اس بیدرد کا دل شاد ہوتا ہے اس لیے ہم بھی خوش ہیں، گویا ہماری دیدہائے پُر خون مظہر الم نہیں، بلکہ اسی خوشی کے اظہار میں روشن ہیں اور دوست کی محبت میں میرے لیے ایک لبریز جام مے کی مانند ہیں۔

شعر۔۶ یعنی میرا جو غمِ ہجر یار میں برا حال ہے، تو رقیب میری مزاج پرسی اس طریقہ سے کرتا ہے جیسے کہ گویا میرا بڑا دوست اور غم خوار ہے۔

شعر۔۷ رشک کا یہ حال ہے کہ رقیب کی زبانی، پیامِ وعدہ دوست بھی گوارا نہیں، اس لیے کہ اس سے اس کی معشوق تک رسائی ظاہر ہوتی ہے۔

شعر۔۸ سر کرے ہے: شروع کرے ہے۔ حدیث زلف عنبر بار دوست: دوست کی زلفوں کی باتیں جن سے کہ عنبر کی طرح خوشبوئیں نکلتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک تو مجھ کو پہلے سے ہی ضعف دماغ کی شکایت تھی، اس پر سونے میں سہاگہ یہ ہو کہ اس (رقیب) نے زلف مشک بوئے یار کا ذکر چھیڑ دیا (گویا کہ زلف معشوق کے ذکر ہی میں اتنی خوشبو ہے کہ وہ عاشق کے ضعف دماغ کے لیے مضر ثابت ہوگا)۔

شعر۔۹ صاف ہے۔

شعر۔۱۰ مہربانی طنزیہ کہا ہے۔ شکر یہ دوست اس بنا پر کہ عشاق کو معشوق کی آزار رسانی ہی مرغوب ہے۔

شعر۔۱۱ یعنی یہ غزل محض اس لیے پسند ہے کہ اس کی ردیف میں بار بار معشوق کا نام آتا ہے۔

ردیف ج

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس، کمندِ شکارِ اثر ہے آج

اے عافیت کنارہ کر، اے انتظام چل سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

شعر۔۱ حلقۂ بیروں در: بیروں در کی زنجیر کا حلقہ۔ مجازاً وہ شخص جس کو اندر آنے کی اجازت نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آج باغ میں عجیب انتظام ہے اور اتنی روک ٹوک ہے کہ قمری کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں۔

شعر۔۲ تارِ نفس کو تارِ کمند سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو میری ہر آہ کے ساتھ دل کا ایک ٹکڑا باہر آپڑتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید آج تارِ نفس کی کمند نے اثر کو شکار کر لیا ہے۔ یعنی شاید آج میری آہ میں اثر پیدا ہو گیا ہے۔

شعر۔۳ کنارہ کر اور چل، دونوں کے معنی رخصت ہونے کے ہیں۔ شاعر نے عافیت اور انتظام کو دو ذی روح مانا ہے۔ اور ان سے خطاب کرتا ہے کہ میرے سیلابِ گریہ سے میرے در و دیوار گرنے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے تم چلے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ دب جاؤ:

خراب خانہ دل اور موجِ سیلِ سرشک تم اپنی یاد سے کہہ دو کہ اب یہاں نہ رہے

لو ہم مریض عشق کے بیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج؟

شعر۔۱ تو مسیحا کا کیا علاج یعنی اگر مسیحا سے مریض عشق اچھا نہ ہوا تو ان کی کیا سزا۔ بیمار دار: تیماردار۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ مریض عشق کا علاج مسیحا سے کروانا چاہیے تو لو ہم ایسا ہی کرتے ہیں، لیکن اگر اس سے بھی اچھا نہ ہوا تو پھر مسیحا کی کیا سزا۔ ذوق کا بھی ایک شعر ہے:

بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

ردیف چ

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

کمال گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ برنگِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار، اے دل کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس بہ کوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ
بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعت ناز نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ
مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

شعر۔۱ نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ: ایک سانس بھی انجمنِ آرزو سے باہر نہ گزار۔ یعنی آرزو نہ کر۔ مطلب یہ ہے کہ اگر شراب نہیں ہے تو انتظار ساقی ہی سہی۔ بہر حال امید و آرزو کو منقطع نہ کرنا چاہیے۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ گر نہیں وصل، حسرت ہی سہی

شعر۔۲ شاعر کہتا ہے کہ اے مخاطب۔ میری سرگرمی تلاش دید، یعنی کمال اور فن کے قدردانوں کی تلاش دید کی کوشش کا تو ذکر نہ کر (کیونکہ وہ تو ملتے ہی نہیں) بہتر یہ ہے کہ میرے آئینۂ دل سے تو کانٹے کی طرح جوہر نکال لے۔ یعنی ایسی تدبیر کر کہ میرے کلام کی طاقت ہی مجھ سے سلب ہو جائے۔ شاعر زمانہ کی شکایت کرتا ہے اور یہ دکھاتا ہے کہ اس زمانہ میں اہل کمال کی قدر نہیں بلکہ ناقابل پوچھے جاتے ہیں۔ اس لیے حسرت کے ساتھ وہ کمال کے سلب ہو جانے کی تمنا کرتا ہے۔" (نظامی)

مولوی عبدالباری صاحب اس شعر کا مطلب اس طرح بیان فرماتے ہیں "میری سعی تلاش دید معشوق کی سرگرمی کی حالت نہ پوچھ، گویا حسرت دیدار نے مجھے حیران کر کے آئینہ بنا دیا ہے اور اس آئینہ میں بجائے جوہر کے وہ کانٹے ہیں جو دوڑ دھوپ میں میرے تلووں میں چبھے ہیں۔ تو بجائے حال پوچھنے کے، ان کو میرے تلووں سے کھینچ لے خود ہی تجھ پر میری سعی و کوشش کا حال آئینہ ہو جائے گا۔ گویا صورت بہ بیں حالت مپرس، کا مضمون ہے۔"

شعر۔۳ مطلب یہ ہے کہ اے دل تو جو بستر پر پڑا ہوا معشوق کا انتظار کر رہا ہے، تیرا یہ انتظار صرف آرام کرنے کا بہانہ ہے، ورنہ معشوق نے تو آنے کے واسطے ذرا بھی اشارہ نہیں کیا۔

شعر۔۴ جس طریقہ سے مغربی تہذیب میں جام صحت پیے جانے کی رسم ہے، اس طریقہ سے اس سے ملتی جلتی مشرقی ممالک میں جام شراب پیے جانے کی ایک رسم ہے جو کہ کسی تمنا کے اظہار

کے وقت ادا کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نرگس جو تیری طرف حسرت سے دیکھ رہی ہے، اس لیے تو میرے اس رقیب کی کوری دل وچشم کی خواہش میں جام شراب پی، تاکہ وہ اندھی ہوجائے اور تجھ پر نظر نہ لگے۔

شعر۔۵ ودیعت: امانت۔ نیام: میان، تلوار کا غلاف۔ لفظ نیام سے الف نکالنے سے نیم رہ جاتا ہے یہ لفظی رعایت ہے۔

اگرچہ اکثر شارحین نے اس شعر کا مطلب بیان کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن کوئی بھی اچھی طرح اس کی تہ کو نہیں پہنچا۔ بعض نے تو مطلب کی بھرتی کی ہے۔ جناب سید ہاشمی صاحب نے اس کے معنی سب سے زیادہ صاف اور واضح طور پر بیان کیے ہیں، جو لکھے جاتے ہیں۔

"شعر کا مفہوم صاف طور یہ ہے کہ تو نے جو خنجر جگر میں بھونک دیا ہے، اب ناز کا حق ادا کر اور اسے باہر اس طرح کھینچ لے کہ زخم زیادہ کشادہ اور زخمی کا خاتمہ آسانی سے ہوجائے۔ خنجر بھونکنا، غمزۂ کامل کی شان تھی اور اس طرح کھینچنا، یا پردۂ زخم سے باہر نکال لینا، نیم غمزہ ہے کہ ناز کا حق ادا ہونے میں جو کسر تھی وہ پوری ہوجائے۔ مضمون کو بیان کرنے میں شاعر نے شاعری کا حق ادا کردیا ہے۔" (از رسالہ اردو)

شعر۔۶ صہبا۔ شراب۔ سفرہ: دسترخوان: سمندر۔ ایک جانور ہوتا ہے جو آتش کدہ میں رہتا ہے اور باہر نکلنے پر مرجاتا ہے۔ بروئے سفر کباب دل سمندر کھینچ یعنی دسترخوان پر سمندر کے دل کے کباب لگا۔ قدح: جام دل صہبائے آتش پنہاں: آتش عشق کی شراب۔ مطلب یہ ہے کہ میری آتش عشق کی شراب کے لیے سمندر کے کباب کی ضرورت ہے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ شرابی کو کباب بہت مرغوب ہوتے ہیں۔ چونکہ شراب آتش عشق ہے، اس لیے آتش کی رعایت سے کبابِ دل سمندر (جو کہ آگ کا جانور ہے) طلب کیے ہیں۔

ردیف د

حسن، غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد   بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا   ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے   شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی   ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
در خورِ عرض نہیں جوہرِ بے داد کو جا   نگہِ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد
ہے جنوں اہل جنوں کے لیے آغوشِ وداع   چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق   ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی   کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

شعر۔۱ اہل جفا: معشوق لوگ۔ مطلب یہ ہے کہ حسن کو غمزہ ترغیب دیتا تھا کہ قتل کر، لیکن اب جبکہ میں قتل ہوگیا تو وہ (معشوق) آرام سے ہوگئے، کیونکہ اب میری طرح کوئی عاشق ہی نہیں جس کو وہ قتل کرسکیں۔ لہٰذا حسن غمزہ کی کشاکش سے بچ گیا۔

شعر۔۲ شیفتگی: عاشقی۔ مطلب یہ ہے کہ میرے مرنے کے بعد چونکہ کوئی منصب عاشقی کے قابل نہیں رہا۔ اس لیے معشوق کے ناز وادا معزول ہوگئے۔ منصب کی رعایت سے معزول لایا گیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ چونکہ کوئی عاشق نہیں رہا، اس لئے معشوق ناز وادا بھی نہیں کرتے کیونکہ ان کا سہنے والا اور ان سے متاثر ہونے والا ہی نہیں رہا۔ آتش مرحوم لکھتے ہیں:

ہوگیا سلسلۂ مہر و محبت برہم   نازنیں بھول گئے ناز و ادا میرے بعد

شعر۔۳ شاعر نے اپنے آپ کو شعلۂ عشق سے تشبیہ دی ہے کہتا ہے کہ میرا مرجانا، گویا شعلۂ عشق کا بجھ جانا ہے۔ سیہ پوش میں ایہام ہے۔ اس سے دونوں مفہوم نکلتے ہیں۔ ایک تو شعلۂ عشق کا خود بجھ جانا اور دوسرے اس کا غمِ عاشق میں ماتمی لباس پہننا۔

شعر۔۴ خاک، مراد قبر۔ مطلب یہ ہے کہ قبر میں میرا دل معشوقوں کا حال دیکھ کر نہایت غمگین ہے۔ (خون ہوا جاتا ہے) کہ میرے بعد ان کو مہندی لگانے کی ضرورت پیدا ہوئی، ورنہ جب تک میں زندہ تھا وہ اپنے ناخن میرے خون سے سرخ کرلیا کرتے تھے۔

مرزا نے جس خوبی کے ساتھ 'دِل خوں ہے' استعمال کیا ہے، اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس میں ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ عاشق کا دل بعد مردن بھی خون ہوا جاتا ہے کہ وہ معشوق کے کام آسکے۔ ایک طریقہ سے مرزا نے اس شعر میں اس بات کا بھی اظہار کیا ہے کہ ان کے مرنے کے بعد کوئی ایسا عاشق صادق نہیں رہا ہے جو معشوقوں کے خاطر خون بہا سکے۔

مولانا حسرت اور جناب سہا صاحب اس شعر کا مطلب اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ قبر میں میرا دل اس رنج سے خون ہوا جاتا ہے کہ بہتوں نے میرے سوگ میں مہندی لگانا چھوڑ دی ہے اور اس طرح ان کی زینت وآرائش میں فرق آگیا ہے۔

شعر۔۵ درخورِ عرض: اظہار کے قابل۔ مطلب یہ ہے کہ میرے مرنے کے بعد (معشوق کے) جوہر بیداد کے اظہار کے قابل، کوئی جگہ نہیں رہی۔ (یعنی کوئی ایسا شخص نہیں رہا کہ جس پر وہ ظلم کر سکے) اسی وجہ سے انھوں نے سرمہ لگانا چھوڑ دیا۔ کیونکہ سرمہ لگا کر جس کو قتل کیا کرتے تھے، وہ میں ہی تھا۔ چونکہ اب میرے مرنے کے بعد ان کی نگاہ سے متاثر ہونے والا کوئی نہیں رہا، اس لیے انھوں نے سرمہ لگانا ہی چھوڑ دیا۔ عرض اور جوہر میں رعایت لفظی ہے۔

شعر۔۶ آغوشِ وداع ہے: رخصت ہونے کے واسطے بغلگیر ہو رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے مرنے کے بعد جنون، اہل جنوں سے اور چاک گریباں سے رخصت ہونے کے واسطے بغلگیر ہو رہا ہے۔ یعنی میرے بعد نہ اب کسی کو جنوں ہی ہوگا اور نہ کوئی گریبان ہی چاک کرے گا۔

شعر۔۷ مئے مردافگن عشق: یعنی وہ شرابِ عشق جس کے نشے کو بڑے بڑے اہل ہمت اور بہادر لوگ برداشت نہیں کر سکتے۔ اس شعر کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں، مئے مردافگن عشق کا ساقی، یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے، یعنی لوگوں کو شراب عشق کی طرف بلاتا ہے۔ "مطلب یہ ہے کہ میرے شراب عشق کا خریدار کوئی نہیں رہا، اور اس لیے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی۔ مگر زیادہ غور کرنے کے بعد، جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے، اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرعہ میں بھی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں اور اس مصرعہ کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے۔ کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگن عشق، یعنی کوئی ہے جو مئے مردافگن عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر

کوئی نہیں آتا تو اسی مصرعہ کو مایوسی کے لہجہ میں مکرر پڑھتا ہے۔ کون ہوتا ہے حریف مئے مردافگن عشق یعنی کوئی نہیں۔ اس میں لہجہ اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرعہ مذکور کی تکرار کی جاوے گی، فوراً یہ معنی ذہن نشیں ہو جاویں گے۔" (یادگار غالب)

شعر۔۸ اپنے آپ کو مہر ووفا کا پتلا بتایا ہے کہ میرے مرنے کے بعد مہر ووفا کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا اور کوئی اس کی تعزیت کرنے والا تک بھی نہ ہوگا۔

شعر۔۹ سیلاب بلا: یعنی عشق۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے بےکسیِ عشق پر افسوس ہوتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد اس سیلابِ بلا کو بھلا اپنے گھر کون آنے دے گا۔

ردیف ر

بلا سے، ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار   نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر، در و دیوار
وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ   کہ ہوگئے مرے دیوار و در، در و دیوار
نہیں ہے سایہ، کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار   گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار
ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مےِ جلوہ   کہ مست ہے ترے کوچہ میں ہر در و دیوار
جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار، تو آ   کہ ہیں دُکانِ متاعِ نظر در و دیوار
ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے   کہ گر پڑے نہ مرے پاٶں پر در و دیوار
وہ آرہا مرے ہمسایے میں تو سایے سے   ہوئے فدا در و دیوار پر، در و دیوار
نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی   ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
نہ پوچھ بےخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب   کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار
نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت، مگر در و دیوار

شعر۔۱ یعنی یہ درودیوار، جو میری نظرِ شوق کے حائل ہیں تو کوئی بات نہیں۔ ان کا روکنا تو درکنار یہ تو اور الٹا بال و پر کا کام دیتے ہیں، کیونکہ رکاوٹوں سے شوق میں اور بھی ترقی ہوتی ہے۔

شعر۔۲ وفور: زیادتی۔ کاشانہ: جھونپڑا۔ چھوٹا سا مکان۔ مطلب یہ ہے کہ کثرت گریہ نے میرے مکان کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ اب گریہ سے دیوار بہہ کر دروازہ بن گئی ہے اور دروازہ گر کر دیوار بن گیا ہے۔

شعر۔۳ کسی چیز کا سایہ اس سے کچھ قدم آگے پڑتا ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ میرے گھر سایہ نہیں ہے، بلکہ یار کی آمد کی خوشخبری سن کر درودیوار ان کے استقبال کے واسطے چند قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔

شعر۔۴ مئے جلوہ: شرابِ دیدار۔ یعنی تو نے اپنی شرابِ دیدار کو کس قدر سستا کر دیا ہے کہ تیرے کوچہ میں ہر درودیوار اس سے مست ہے۔

شعر۔۵ سرسودائے انتظار: (جنس) انتظار کے خریدنے کا خیال۔ مطلب یہ ہے کہ عشاق کی معشوق کے انتظار میں درودیوار پر اتنی نگاہیں لگی ہوتی ہیں کہ درودیوار متاعِ نظر کی دوکان بن گئی ہے۔ اگر تجھ کو اس سے کچھ خریدنا ہو تو آجا۔

شعر۔۶ یعنی جب کبھی میں نے سامان گریہ کیا، درودیوار میرے پاؤں پر گر پڑے۔ یعنی جب کبھی رویا سیلابِ گریہ نے میرے درودیوار کو بہا دیا۔

مولانا سہا صاحب اس کا مطلب اس طرح بیان فرماتے ہیں ”مبالغہ ہے۔ یعنی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے رونے کی تیاری کی ہو اور درودیوار گر نہ پڑے ہوں۔ پاؤں پر گرنا، یعنی اظہار عجز کرنا کہ اگر آپ گریہ کریں گے تو سیل گریہ ہمیں بہا دے گا، مگر نتیجہ ایک ہی نکلا کہ بجائے سیل گریہ سے گرنے کے عجز و خوف سے گر پڑے۔“

شعر۔۷ سایہ سے، یعنی بذریعہ سایہ۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ میرے پڑوس میں آ کر رہا تو میرے درودیوار کے سایہ نے اس کے درودیوار کی بلائیں لیں۔ ایک دیوار کے سایہ کا دوسری متصل دیوار کے سایہ پر چڑھ جانے کی طرف اشارہ ہے۔

شعر۔۸ مطلب یہ ہے کہ تیرے نہ ہونے کی وجہ سے مجھے گھر کو دیکھ کر رنج ہوتا ہے۔ اس لیے

میں ہمیشہ (گھر کے درودیوار دیکھ کر) روتا رہتا ہوں۔

شعر۔۹ یعنی سیلاب کے آنے کی خوشی میں ایسا بیخود ہو جاتا ہوں کہ سیلاب سے جو درودیوار گرتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ رقص کرتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ خانہ ویرانی باعث انبساط ہے۔ اسی مضمون کا ایک دوسرا شعر ہے:

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

شعر۔۱۰ مطلب یہ ہے کہ غالب، رازِ محبت تو دنیا میں سوائے درودیوار کے کسی سے مت کہہ۔ کیونکہ درودیوار کو چھوڑ کر کوئی بھی رازِ محبت کو نہیں چھپا سکتا اور چونکہ درودیوار سے راز کا کہنا فضول ہے، اس لیے نتیجہ یہ نکلا کہ رازِ محبت کا کسی پر بھی اظہار نہ کرنا چاہیے۔

گھر، جب بنالیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر، کہے بغیر
کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر، کہے بغیر
کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ”ستمگر“ کہے بغیر
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یار ہے؛ نہ رہیں پر کہے بغیر
چھوڑوں گا میں نہ اُس بتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے، دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
غالبؔ! نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

شعر۔۱ دوسرے مصرعہ میں استفہام انکاری ہے۔

شعر۔۲ یعنی جب کہ میں بول نہیں سکتا، اس وقت یہ کہتے ہیں کہ بغیر حالِ دل کہے مجھے کسی کی کیونکر خبر ہو سکتی ہے۔

شعر۔۳ صاف ہے۔

شعر۔۴ سرجائے یا رہے: خواہ مارا جاؤں یا زندہ رہوں۔ صاف، باطنی اور اخلاقی جرأت کی تعلیم دی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے دل میں ہی کوئی بات نہیں وگرنہ میں ضرور اس کا اظہار کر دیتا، خواہ انجام کچھ ہی ہوتا۔

شعر۔۵ کافر اول کے معنی معشوق اور دوم کے معنی، وہ شخص جو ماسوا خدا کے کسی کی پرستش کرے۔ منکر خدا۔ اسی مضمون کا خسرو رحمتہ اللہ علیہ کا بھی ایک شعر ہے:

خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی میکند
آرے آرے میکند باخلق و عالم کار نیست

شعر۔۶ یعنی گفتگو میں دشنہ و خنجر سے ناز و غمزہ ہی مراد ہے۔ ان کا استعمال محض تشبیہاً ہے۔

شعر۔۷ بنتی نہیں بادہ وساغر کہے بغیر، یعنی بادہ وساغر کے الفاظ ضرور کہنے پڑتے ہیں۔

شعر۔۸ یعنی اگر میں بہرہ ہوں تو آپ کو دونی توجہ کرنی چاہیے، کیونکہ جب تک کوئی بات مکرر نہ کہی جاوے میں اس کو سن نہیں سکتا۔ (آخر خفگی کی کیا بات ہے۔ مطلب صاف ہے)

شعر۹ اپنے حال کو کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مطلب صاف ہے۔

کیوں جل گیا نہ، تابِ رخِ یار دیکھ کر   جلتا ہوں، اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے   سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر
کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا   رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
آتا ہے میرے قتل کو، پر جوشِ رشک سے   مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق   لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
واحسرتا! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ   ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ   لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
زنّار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال   رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر
اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں   جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر
کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے   طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طور پر   دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر

شعر۔۱ جلتا ہوں، یعنی آتشِ رشک بھڑکی ہوئی ہے۔ اپنی طاقت دیدار پر رشک کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں رخ یار دیکھ کر جل کیوں نہ گیا۔ اسی مضمون کا ایک دوسرا شعر بھی ہے:

دیکھنا قسمت کہ اپنے آپ رشک آجائے ہے   میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

شعر۔۲ سرگرم: مصروف۔ مطلب یہ ہے کہ میں جو رات دن فراق معشوق میں آتشیں نالے بلند کرتا ہوں تو لوگ مجھ کو آتش پرست کہنے لگے ہیں (حالانکہ حقیقت کچھ اور ہی ہے)

شعر۔۳ عام ہو جفا، یعنی خواہ کوئی عاشق ہو یا نہ ہو، لیکن تم کو جفا (جو صرف عاشق صادق ہی کا حصہ ہے) کرنا۔ ایسی جگہ عشق کی کیا عزت؟

شعر۔۴ یعنی تلوار کی خوش قسمتی دیکھ کر کہ وہ اس کے ہاتھ میں ہے، رشک کی ایسی آگ بھڑکتی ہے کہ میں قتل ہونے سے پہلے ہی مرجاتا ہوں۔

شعر۔۵ مینا شیشہ۔ لیکن شاعروں کی اصطلاح میں صراحیِ مے کے معنی میں مستعمل ہے۔ موجِ شراب کے لرزنے کی وجہ یہ ہے کہ تیری رفتار مستانہ سے تو خون خلق ہوا اور تیری مستی کا باعث مے نوشی ہے، تو گویا سبب در سبب خون خلق گردن مینا پر ثابت ہوا۔ پس اسی الزام کے ڈر سے لرز رہی ہے۔

شعر۔۶ یعنی جب معشوق نے یہ جانا کہ مجھ کو اس کے آزار میں ہی لطف آتا ہے، تو افسوس کہ اس نے ظلم کرنا بھی چھوڑ دیا۔

شعر۔۷ عیار: کسوٹی، جانچنا۔ تولنا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے کلام کا جو خریدار ہوتا ہے، میں خود اس کے ہاتھ بک جاتا ہوں، لیکن یہ معلوم کرنے کے بعد کہ اس نے کہاں تک طبیعت رسا پائی ہے اور کہاں تک سخن فہم ہے، یعنی بالفاظ دیگر جو کوئی میرے کلام کے محاسن کو پہچانتا ہے، میں اس کا غلام بن جاتا ہوں۔

مولانا حالی لکھتے ہیں: ”جب حسنِ اتفاق سے مرزا کو کوئی سخن فہم اور سخن سنج میسر آجاتا تھا، اس کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ منشی نبی بخش حقیر جو ایک زمانہ میں کول میں سرشتہ دار تھے اور جن کی سخن سنجی کی بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سنی گئی ہے، کہیں وہ دلی میں آئے ہیں اور مرزا کے

مکان پر ٹھہرے ہیں۔ ان کی نسبت منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ خدا نے میری بے کسی اور تنہائی پر رحم کیا۔ اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی، جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی، دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس خزانۂ یگانہ، یعنی منشی نبی بخش کو کس درجہ کی سخن فہمی اور سخن سنجی عطا ہوئی ہے، حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں مگر جب تک میں نے ان بزرگوار کو نہیں دیکھا، یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے۔ اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کیے۔ آدھا یوسفؑ کو دیا اور آدھا تمام بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوق معنی کے بھی دو حصے کیے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کو اور آدھا تمام دنیا کے حصہ میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو، میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانہ کی دشمنی سے بے فکر اور اس نعمت پر دنیا سے قانع۔" چنانچہ اس قسم کے سخن فہموں کی قدر دانی کا اس شعر میں اظہار کیا ہے۔

شعر۔۸ زنار کو تسبیح پر کتنی خوبی کے ساتھ ترجیح دی ہے۔ تسبیح میں دانہ ہونے کی وجہ سے نشیب و فراز ہوتا ہے لیکن چونکہ زنار میں دانے نہیں ہوتے، صرف ڈورا ہی ہوتا ہے، تو اس میں ہمواری ہوتی ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شعر، عارف پر طنزاً کہا ہو یعنی عارف و سالک کو تسبیح وغیرہ کی کیا ضرورت ہے؟

شعر۔۹ راہ کو پُر خار دیکھ کر خوش ہونا، اس لیے کہ کانٹے لگ کر آبلے پھوٹ جائیں گے۔

شعر۔۱۰ طوطی کو آئینہ سامنے رکھ کر بلایا کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے آئینۂ دل میں جو یاس و محرومی کی وجہ سے زنگ آ گیا ہے، تو میرا یار سبزی کی مناسبت سے اس کو طوطی کا عکس سمجھتا ہے۔ (یعنی یہ سمجھتا ہے کہ مجھ کو کسی طوطی سے محبت ہے) مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میرے دل کی افسردگی کا باعث یاس و محرومی ہے، لیکن وہ بدگمان یہ سمجھتا ہے کہ میری افسردگی اس سبب سے ہے کہ کسی دوسرے محبوب کی محبت میرے دل میں جاگزیں ہوگئی ہے۔ مرزا ایک دوسری جگہ بھی لکھتے ہیں۔

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاش کے   اس قدر ذوق نوائے مرغ بستانی مجھے

شعر۔۱۱ اس شعر میں اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ شاعر کہتا ہے کہ برق تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے، نہ کہ کوہ طور۔ کیونکہ شراب خوار کا ظرف دیکھ کر اس کے موافق شراب دی جاتی، پس کوہ طور جو منجملہ جمادات کے ہے، وہ کیونکر تجلی الٰہی کا متحمل ہوسکتا ہے۔" (یادگار غالب)

عرفی نے اس مضمون کو اس طرح باندھا ہے:

بہ کوتہی ز عطا بود و عشق میداند   کہ بر کرشمہ ما ننگ بود خلعت طور

شعر۔۱۲ شوریدہ حال: پریشان حال

مرگیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی، ہے ہے   بیٹھنا اس کا وہ آکر تیری دیوار کے پاس

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہر درخشاں پر   میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر
نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی   سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اس زمانہ سے   کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے   بہم گر صلح کرتے پارہائے دل نمکداں پر
نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا   کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مہر عنواں پر
مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ، یاد آیا   کہ فرقت میں تری، آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا؟   قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر
نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

شعر۔۱ مہر درخشاں: چمکتا ہوا آفتاب۔ اول تو آفتاب کے مقابلہ میں قطرۂ شبنم کی ہستی کیا اور وہ بھی اس قطرہ کی جو کہ کانٹے کی نوک پر ہو، پس شاعر کہتا ہے کہ آفتاب جو مجھ جیسے ناچیز کو، کہ جس کی مثال اوس کے اس قطرہ کی سی ہے جو کہ خار بیاباں پر ہو، فنا کرنے کی تکلیف کرتا ہے، تو اس کی اس حرکت سے میرا دل لرزتا ہے: ع شاہبازے بہ شکارِ مگسے می آید

شعر۔۲ سفیدی، اس میں صنعت ایہام ہے۔ ایک تو آنکھ کی سفیدی اور دوسری وہ جو کہ مکان پر

پھیرتے ہیں۔ تلمیح ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں فراقِ یوسف میں روتے روتے بے نور ہوگئی تھیں۔ سفیدیٔ دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر، یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے تجسس میں حضرت یعقوب کی آنکھیں زنداں پر پھرتی ہیں اور چونکہ سفیدی مکان پر پھرنا زینت و آرائش ہے، اس لیے شاعر نے آنکھوں کی سفیدی کا زندانِ یوسف تک ان کی تلاش میں پہنچنے (اور وہاں پھرنے) کو حضرت یوسف کی خانہ آرائی کہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم اس کی تشریح یوں کرتے ہیں "جب زلیخا نے یوسف سے اپنا مقصود دل نہ پایا تو عزیز سے کہہ کر زنداں میں بھجوادیا۔ یہ زلیخا کی آخری کوشش تھی کہ شاید دلربا تکلیفِ قید سے مان جائے، لیکن ادھر یوسف روانہ ہوا اُدھر داروغہ کو فرمان ہوا کہ مجلس کی آرائش میں مشغول ہو تا کہ نازنین قید سے زیادہ ملول نہ ہو:

معطر دار دیوار و درش را
منور ساز طاق و منظرش را
(جامی)

چنانچہ معمار حجرۂ یوسف میں سفیدی میں مشغول ہیں۔ مرزا صاحب کا خیال کہاں سے کہاں منتقل ہوتا ہے۔ ان کو یہ سفیدی دیدۂ یعقوب کی نابینا آنکھ کی سفیدی معلوم ہوتی ہے۔ پدر ش نگران ست کہ یوسف در زندان ست۔"

شعر۔۳ مطلب یہ ہے کہ جس زمانہ میں کہ مجنوں ایک بالکل بچہ، نوآموز تھا، میں اسی زمانہ سے سبقِ بیخودی کے پڑھنے میں فنا ہوں۔ اس شعر میں لام الف لانے میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ لام الف (یعنی لا) کے معنی فنا و نیستی کے ہیں۔

شعر۔۴ مطلب یہ ہے کہ اگر پارہائے دل نمک (جو کہ آسانی سے دستیاب ہوسکتا ہے) لگانے پر راضی ہوجاتے ہیں، تو میں مرہم کے تلاش کرنے کی تشویش سے بچ جاتا۔ (نمک لگانے سے زخم میں تکلیف ہوتی ہے جو کہ عشاق کو نہایت مرغوب ہے۔)

شعر۔۵ طومار: دفتر۔ عنوان: سرخی۔ پشت چشم کنایہ از غمزہ و اغماض۔ مطلب یہ ہے کہ محبت کی ولایت میں کوئی دفترِ ناز بھی ایسا نہیں ہے کہ جس پر معشوق کے اغماض کی مہر نہ ہو، یعنی معشوق کے ناز و انداز کے ساتھ اس کا اغماض (آنکھیں پھیر لینا) بھی لازمی ہے (گویا عام طور پر معشوقوں کا

یہ رویہ ہوتا ہے کہ ادھر تو دل لیا اور اُدھر آنکھیں پھیر لیں)

شعر۔۶ شفق: سرخی جو صبح و شام کو آسمان کے کناروں پر دکھائی دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابر شفق آلودہ دیکھ کر مجھ کو گمان ہوا کہ تیری فرقت، گویا باغ پر آگ برسا رہی ہے۔

شعر۔۷ "قیامت میں مردے زندہ ہو کر اٹھیں گے، لیکن شاعر کہتا ہے کہ تیرے شہیدوں میں سوائے پروازِ شوقِ ناز، اور کیا باقی رہا ہوگا جو قیامت انھیں اٹھائے گی۔ ان کے لیے تو قیامت گویا ایک ہوائے تند ہے جو ان کی خاک کو (جو پہلے ہی سے شوقِ ناز میں اڑ رہی ہے) کچھ اور پریشان کردے گی۔" (حسرت)

شعر۔۸ ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر۔ یعنی اپنے گریبان کو پھاڑ ڈالیں گے۔ کس خوبصورتی سے اپنی مجبوری کا اظہار کیا ہے۔

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ابرو سے ہے کیا اس نگہِ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور
ہرچند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں، تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور
ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ ہرچند کہ سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں، اور"
لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
لیتا، نہ اگر دل تمھیں دیتا، کوئی دم چین
کرتا، جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

شعر۔۱ گزرتا ہے گماں اور، یعنی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کی محبت حقیقی نہیں ہے، بلکہ محض ازراہ

فریب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی ذرا ذرا سی حرکت سے ایک نئی بات نکلتی ہے، اس لیے اگر وہ محبت بھی کرتے ہیں تو ہم کو یہی گمان ہوتا ہے کہ وہ سب بناوٹ ہے۔

شعر۔۲ یہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس میں در پردہ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اے خدا، اگر تو میری زبان کو اتنی قوت نہیں دیتا کہ میں اپنے مطلب کو زیادہ شرح و وضاحت کے ساتھ بیان کر سکوں تو، تو ان کو سمجھنے کی مزید قوت عطا کر۔

شعر۔۳ پیوند: جوڑ، ٹکڑا، مجازاً تعلق۔ مقرر: قرار دیا گیا۔ شعراء ابرو کو کمان سے اور نگاہ کو تیر سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ (کمان) ابرو کو (تیر) نگہ ناز سے کوئی تعلق نہیں۔ نگہ ناز ایک تیر ضرور ہے، مگر اس کی کمان ابرو نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہی ہے (یعنی وہ حسن ہے)

شعر۔۴ یعنی جب تک تم شہر میں موجود ہو، اگر تم میرا دل لے بھی لوگے تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ میں بازار سے جا کر نہایت آسانی کے ساتھ اور خرید لاؤں گا۔ اس لیے کہ تمھارے زمانہ میں ہر شخص جان و دل سے عاری ہے اور فروخت کرنا چاہتا ہے۔

طباطبائی صاحب اس کے معنی یوں لکھتے ہیں ''کہ تمھاری بدولت ہر شخص کو دل و جان دوبھر ہے۔ سستا بیچ ڈالے گا۔''

شعر۔۵ ''اس شعر میں سارا زور ''ہم'' کے لفظ پر ہے یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے، اس وقت تک راہ معرفت الٰہی میں ایک اور سنگ گراں سد راہ ہے، پس اگر ہم نے بت توڑنے میں سبکدستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ؟ یہ بڑا بھاری بت، یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔'' (یادگار غالب)

شعر۔۶ و۔۷ صاف ہے۔

شعر۔۸ یعنی میں ہر روز جو لوگوں کو ایک نیا داغ دکھاتا ہوں، تو ان کو اس سے خورشید جہاں تاب کا دھوکہ ہوتا ہے کہ وہی ہر روز بار بار نکل آتا ہے۔

شعر۔۹ لیتا، یعنی چین لیتا۔ مرزا صاحب نے خود ایک خط میں اس شعر کے معنی بیان فرمائے ہیں۔ لکھتے ہیں ''یہ بہت لطیف تقریر ہے۔ لیتا کو ربط ہے چین سے۔ کرتا مربوط ہے آہ و فغاں سے۔ عربی میں تعقید معنوی اور لفظی دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقید معنی عیب، اور تعقید لفظی جائز ہے بلکہ فصیح و بلیغ ہے۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔ حاصل معنی یہ ہے کہ اگر دل تمھیں نہ دیتا، تو کوئی دم چین، اور اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا۔''

شعر۔۱۰ ''نالے، یعنی ندی نالے نہ کہ آہ و نالے۔ مثال کس قدر بے مثل نالہ کے مطابق ہے اور مضمون کتنا مطابق واقع کے ہے۔ فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رُکتی ہے، اسی قدر زیادہ راہ دیتی ہے۔ خصوصاً جو مضمون کہ اس وقت اپنے حسب حال لکھتا ہے وہ نہایت موثر اور درد انگیز ہوتا ہے۔'' (یادگار غالب)

صفائے حیرتِ آئینہ ہے، سامانِ زنگ آخر تغیر آب برجا ماندہ کا، پاتا ہے رنگ آخر
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

شعر۔۱ مصرعہ ثانی کی نثر اس طرح ہوگی۔ ''آب برجا ماندہ کا رنگ آخر تغیر پاتا ہے۔'' حیرت بہ سبب تعجب کہ ایک ہی حال پر رہ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے کہ پانی کا ایک جگہ ٹھہرے رہنے سے رنگ بدل جاتا ہے، یعنی اس پر کائی آجاتی ہے، اسی طرح آئینہ کی صفائی پر حیرت سے زنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

شعر۔۲ تدبیر: علاج مطلب یہ ہے کہ عیش و جاہ کے بہم ہونے سے میری وحشت دور نہیں ہوئی، بلکہ جام زمرد بھی میرے لیے داغ پلنگ بن گیا جس سے کہ میری وحشت میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عریانی گریباں چاک کا حق ہوگیا ہے میری گردن پر
برنگ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک تپیدن پر
فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
ہم، اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن، کہ رکھتا ہے شعاع مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر
فنا کو سونپ، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا فروغِ طالعِ خاشاک، ہے موقوف گلخن پر
اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ ''مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر''

شعر۔۱ مطلب یہ ہے ک صرف عریانی ہی میرے جنون کی نشانی اور اس کی موئد ہے، اور چاک گریباں نے مجھ کو عریاں کیا ہے۔ اس لئے چاک گریباں کا میری گردن پہ حق ہو گیا ہے۔ گریبان چاک میں اضافت مقلوبی ہے۔

شعر۔۲ نیرنگ: شعبدہ۔ مصرعۂ اوّل میں آتش زدہ کے بعد لفظ 'ہے' محذوف ہے۔ بال: بازو۔ تپیدن: تڑپنا، گرم ہونا۔ اس شعر میں آئینۂ متحرک کی تڑپ کو اس شعلہ سے تشبیہ دی ہے جو کہ کاغذ آتش زدہ سے بلند ہوتا ہے۔

جناب سید ہاشمی صاحب لکھتے ہیں کہ "شرح نویسوں نے اس شعر کے معنی بیان کرنے میں خوب طبع آزمائی کی ہے اور عجیب عجیب پہلو نکالے ہیں، لیکن خاکسار کاتب الحروف کے نزدیک یہاں دل باندھنے سے ڈھارس باندھنا یا امید دلانا ہے۔ کاغذ آتش زدہ میں سکڑنے اور سمٹنے کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس سے بیتابی کو تشبیہ دی ہے اور ایسے کاغذ میں جو روشن نقطے نمودار ہو جاتے ہیں، ان کی مناسبت سے ہزار آئینہ کا لفظ کہا ہے، مگر ان تکلفات کے پردوں میں مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تکلیف و بے قراری میں اگر کوئی شے موجب تسکین ہو سکتی ہے تو وہ تڑپنا اور لوٹنا ہے۔"

(از رسالہ اردو)

شعر۔۳ متاع بردہ، یعنی لوٹی ہوئی پونجی۔ مطلب یہ ہے کہ گردشِ دوراں سے جو زمانۂ عیش جاتا رہا، اس کی پھر توقع رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ لوٹی ہوئی پونجی کو رہزن پر قرض خیال کرنا۔ مرزا صاحب کا عہد جوانی نہایت ہی آرام وچین سے گزرا تھا۔ اس کے بعد حالت ضعیفی میں ان کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ بڑی مصیبت وتنگی سے دن گذرنے لگے۔ انھیں ایام کو یاد کر کے یہ شعر لکھا ہے۔ مولانا حالی، یادگار غالب میں لکھتے ہیں۔ "یہ مضمون بھی بالکل وقوعیات میں سے ہے۔ جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم وستم رسیدہ، وفلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور آخر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال پھر عود کرے گا۔"

شعر۔۴ بے سبب رنج: بلا وجہ رنجیدہ ہونے والا۔ آشنا دشمن: دشمن (رقیب) سے دوستی رکھنے والا یعنی معشوق۔ بے سبب رنج اور آشنا دشمن کے درمیان 'و' حرف عطف محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا ایسے بے سبب رنج وآشنا دشمن معشوق سے سابقہ پڑا ہے جو کہ شعاع مہر (سورج کی کرن) کو تار نظر سمجھ کر چشم روزن پر بند نگاہی کی تہمت لگاتا ہے۔

"ہم ہیں اور وہ بے سبب رنجیدہ ہونے والا آشنا۔ دشمن ہے، یعنی ہمارا اس بے سبب رنج آشنا دشمن سے پالا پڑا ہے جو اپنے روزن دیوار میں شعاع آفتاب دیکھ کر میری نگاہ سمجھتا ہے اور مجھ پر روزن در سے جھانکنے کی تہمت رکھتا ہے۔ بے سبب رنج آشنا کو اگر پورا جملہ سمجھ لیا جائے تو اس حالت میں صحیح ہے۔" (از شرح مولانا عبدالباری)

شعر۔۵ گلخن: آتش گاہ، بھاڑ جس میں غلہ بھونتے ہیں۔ خاشاک: کوڑا کرکٹ۔ کوڑا کرکٹ جب تنور میں ڈالتے ہیں تو اس میں سے شعلے بلند ہوتے ہیں اور وہ روشن ہو جاتا ہے۔ اس کے روشن ہونے کو فروغ طالع خاشاک کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے خاشاک کا بھٹی میں پڑنا (یعنی فنا ہو جانا) اس کا فروغ طالع ہے، اسی طریقہ سے اگر تو اپنی حقیقت کا مشتاق ہے تو پہلے اپنے آپ کو فنا کر دے۔

مولوی محمد مہدی صاحب اس شعر کی شرح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "خس وخاشاک کے طالع کا فروغ گلخن پر موقوف ہے جہاں وہ سراپا روشن ہو جاتا ہے یا جل کر فنا ہو جاتا ہے اور اس کی آرزو اپنے مبداء سے ملنے کی پوری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر تم اپنی حقیقت کے مشتاق ہو تو فنا ہو جاؤ بغیر فنا ہوئے تمھاری آرزو پوری نہیں ہو سکتی۔"

شعر۔۶ بسمل: دل۔ مشق ناز: معشوق۔ مطلب یہ ہے کہ اے اسدؔ تیرے دل کا عجب انداز ہے کہ وہ خود اپنے قاتل سے کہتا ہے کہ اس کو اس طرح قتل کرے کہ خوب خون بہے۔

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف، مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

شعر۔۱ تجھ سا رقیب یعنی وہ حسین جو تجھ پہ عاشق ہے۔ خوباں: حسین۔ مطلب یہ ہے کہ میں جو تیرا ظلم برداشت کرتا ہوں، اس میں محض ایک مصلحت ہے اور وہ یہ ہے کہ تو محبوب محبوباں ہے۔ تجھ پر بہت سے حسین عاشق ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی تجھ جیسا حسین نکل آئے تو میں اس

سے لَو لگا لوں گا۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو، قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں، اے فلک پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شب چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
تم کون سے تھے ایسے کھرے دادوستد کے!
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ ”کیوں جیتے ہیں“ غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

شعر۔۱ اس غزل کے تمام اشعار زین العابدین عارف مرحوم کے مرثیہ میں کہے گئے ہیں جو مرزا صاحب کے سالے تھے اور مرزا صاحب کو بہت عزیز تھے۔ آپ نے عین شباب میں انتقال کیا جس سے مرزا کو سخت صدمہ ہوا۔ اسی کے اظہار میں مرزا نے یہ مرثیہ لکھا ہے۔ ان کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ تم کو ہمارے ساتھ مرنا تھا۔ تم نے جلدی کی ہے تو اب کچھ عرصہ تک تنہا رہنا پڑے گا۔

شعر۔۲ ناصیہ فرسا: پیشانی رگڑنے والا۔

شعر۔۳ صاف ہے۔

شعر۔۴ یعنی ہم کو تمھاری موت کی وجہ سے آج ہی قیامت ہے۔

شعر۔۵ صاف ہے۔

شعر۔۶ ماہ شب چاردہ: چودھویں رات کا چاند۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ تم میرے گھر کے ماہ شب چہاردہم تھے، اور شب چہاردہم کے بعد کچھ دن چاند رہتا ہے، جب جا کر کہیں چھپتا ہے۔ تم ایک دم کیسے چھپ گئے؟

شعر۔۷ دادوستد: لین دین، معاملہ۔ مطلب یہ ہے کہ تم دادوستد کے ایسے کہاں کے کھرے تھے جو وقت پر جان دے دی۔ تم کو چاہیے تھا کہ ملک الموت کو کچھ روز اور ٹالا ہوتا اور اس کو تقاضا کرنے دیا ہوتا۔

شعر۔۸ نیّر۔ مرزا غالبؔ کے ایک شاگرد خاص تھے۔ مرزا کو ان کے ساتھ بہت محبت تھی، جو عارف کو گوارہ نہ تھی۔ نیّر سے محبت کرنے کی وجہ سے مرزا صاحب سے بھی ناخوش تھے۔ اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

شعر۔۹ یعنی جس طریقہ سے جہاں تمھاری خوشی یا ناخوشی سے اتنی عمر گزری، وہاں کچھ روز اور بسر کرتے۔

شعر۔۱۰ یعنی لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ غالبؔ عارف کی موت کی خبر سن کر کیوں نہ مر گیا، تو وہ بے سمجھ ہیں۔ کیونکہ میری قسمت میں تو یہ لکھا ہے کہ میں کچھ دن اور مرنے کی تمنا کروں (اور اس کا صدمہ اٹھاؤں) پھر مرتا تو کیونکر مرتا۔

ردیف ز

فارغ مجھے نہ جان، کہ مانند صبح و مہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیب و کفن ہنوز
ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گل فروش شوخیِ داغِ کہن ہنوز
میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیداد فن ہنوز

شعر۔۱ اس شعر میں جیب و کفن کو صبح سے اور داغ عشق کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں مرنے پر بھی عشق سے خالی نہیں بلکہ صبح و مہر کے مانند داغ عشق، میرے جیب و کفن کو روشن کیے ہوئے ہے۔

شعر۔۲ زر از دست رفتہ: کھویا ہوا مال۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے ایک مفلس اپنی گئی ہوئی

دولت پر اور گل فروش اپنے بکے ہوئے پھولوں پر ناز کرتا ہے، اسی طرح میں اپنے داغ کہن عشق پر ناز کرتا ہوں۔ اس شعر میں زوال کو پذیرفتہ وگم شدہ، اور عشق کو زراز دست رفتہ سے تشبیہ دی ہے۔

شعر۔۳ خون جگر کو شراب سے تشبیہ دی ہے کہ گو میرے میخانۂ جگر میں شراب خون بالکل نہیں رہی لیکن معشوق ظلم پیشہ کی خونخواری ملاحظہ ہو کہ شراب خون نہ ہونے پر بھی اس کی خواہش میں انگڑائیاں لے رہا ہے۔

حریف مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب! کہ عمرِ خضر دراز

نہ ہو بہ ہرزہ بیابان نوردِ وہمِ وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

وصال جلوہ تماشا ہے، پر دماغ کہاں
کہ دیجیے آئینۂ انتظار کو پرواز

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ مے خانۂ جنوں غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے، ایک خاک انداز

شعر۔۱ حریف: دوست۔ فسون نیاز۔ عجز و نیاز کا منتر (دعا) ''ایک نئی شوخی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی۔ کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا۔ لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی دی جا چکی ہو۔'' (یادگار غالب)

شعر۔۲ ہرزہ: بیہودگی۔ وجود یعنی مسئلہ وحدت الوجود۔ نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نورد وہم وجود۔ یعنی تو فضول وہم (خیال) وجود کے بیابان میں بھٹکتا نہ پھر۔ ہنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز یعنی تیرا تصور ناقص ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو عقیدۂ وحدۃ الوجود بلا پس و پیش اختیار کر۔ اس میں زیادہ تشویش نہ کر، کیونکہ تیرا تصور اس قابل نہیں کہ وہ تیرے خیال میں آ سکے۔

حسرت صاحب اس کے معنی یوں بیان فرماتے ہیں ''وحدت الوجود کا عقیدہ اختیار کر لینا چاہیے تاکہ وجود اشیائے عالم کے متعلق تمام اوہام سے نجات مل جاوے۔''

مولوی محمد مہدی صاحب لکھتے ہیں '' کہتے ہیں تو وجود ماسوائے اللہ کے وہم میں مت پڑ۔

جب تک تو یہ سمجھتا رہے گا کہ وجود کی قسمیں اور مراتب ہیں، مثلاً وجوب اور امکان وغیرہ تو اس وقت تک تیرا خیال ناقص و نامکمل رہے گا۔ حاصل یہ ہے کہ ایک ہستی واجب کے سوا اور دوسری ہستی نہ سمجھ۔'' (از رسالہ اردو)

شعر۔۳ وصال یعنی وصال یار۔ پرواز: آراستگی، مجازاً صیقل۔ جلوہ تماشا ہے: جلوۂ حسن کا تماشا دکھانے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گو وصال یار جلوۂ حسن کا تماشا دکھانے والا ہے لیکن ہمیں یہ دماغ کہاں کہ آئینہ انتظار کو صیقل کریں۔ یعنی انتظار کے بعد جلوۂ حسن یار کا تماشا ممکن تو ہے لیکن انتظار کرنے کی طاقت نہیں:

اثر گریہ مسلّم سہی لیکن اے دل
کل یہ منت کش فریاد ہوا یا نہ ہوا

شعر۔۴ ہوا: خواہش۔ مطلب یہ ہے کہ خاک ہونے پر (یعنی مر کر بھی) جلوۂ ناز کی خواہش نہیں گئی اور عاشق کی خاک کا ایک ایک ذرّہ آفتاب پرست بنا ہوا ہے۔

شعر۔۵ مے خانہ جنوں یعنی صحرائے جنوں۔ کاسۂ گردوں: آسمان کا پیالہ یعنی خود آسمان۔ خاک انداز: وہ برتن جس میں بھر کر کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

وسعت سعیِ کرم دیکھ کہ سرتا سرِ خاک
گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں تپ گرمیِ رفتار ہنوز

شعر۔۱ سرتا سر خاک: تمام روئے زمین پر، تمام دنیا میں۔ مطلب یہ ہے کہ ابر کے کرم کی وسعت دیکھیے کہ آبلہ پا ہونے پر بھی برابر مینہ برسانے میں سرگرم رہتا ہے۔ اس شعر میں شاعر نے بتلایا ہے کہ کریم کی ایسی شان ہونی چاہیے۔ اس کو یہ نہیں چاہیے کہ تکلیف سے گھبرا جائے۔ ابر کو آبلہ پا قطرات، باراں کی وجہ سے کہا ہے۔

شعر۔۲ یک قلم: یکسر۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی تک میری گرمیِ رفتار کی تپش میرے نقش پا میں موجود ہے جس کی وجہ سے تمام بیابان کاغذ آتش زدہ کے مانند بنا ہوا ہے۔ قلم، کاغذ، نقش صفحہ، یہ سب رعایت لفظی ہے۔

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایماں عزیز

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے   ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

شعر۔۱ اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس سے جان عزیز رکھوں تو وہ ایمان لے لے گا، اس لیے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بت پر جان قربان کرنا عین ایمان ہے، تو پھر اس سے جان کیونکر عزیز رکھی جا سکتی ہے۔ (یادگارِ غالب)

شعر۔۲ نہ نکلا دل سے، یعنی فراموش نہ ہوا۔ بھولا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ گو تیرا تیر، دل سے نکل گیا لیکن اس کی یاد اور محبت ابھی باقی ہے۔ کیونکہ تیرا پیکان (تیر) فرط آزار رسانی کی وجہ سے مجھ کو نہایت ہی عزیز ہے۔

شعر۔۳ تاب لائے ہی بنے گی، یعنی صبر کرنا ہی پڑے گا، کیونکہ گو واقعہ سخت اور جاں نثاری کے قابل ہے لیکن جان بھی پیاری ہے۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز   میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرایشِ خمِ کاکل   میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز
لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی   ہم ہیں، اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد   ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے   ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں   جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز
اے ترا غمزہ، یک قلم انگیز   اے ترا ظلم، سر بسر انداز
تو ہوا جلوہ گر، مبارک ہو   ریزشِ سجدۂ جبین نیاز
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا   میں غریب اور تو غریب نواز
اسداللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

شعر۔۱ یعنی نشاط و خوشی سے مجھ کو کچھ غرض نہیں۔ میں تو اپنی مصیبت میں مبتلا ہوں اور اسی سے سروکار ہے۔ اسی مضمون کا مرزا صاحب کا ایک فارسی شعر بھی ہے:

دیگر زساز بے خودی ما صدائے مجو   آوازے از گسستن تار خودیم ما

شعر۔۲ کاکل: زلف۔ مطلب یہ ہے کہ تو تو ادھر بال سنوار نے یعنی اپنی آرایش میں مصروف ہے اور میں ادھر دور دور کے خیالات میں غرق ہوں کہ دیکھیے ان پر کون کون عاشق ہوتا ہے، یا یہ نظر عنایت کس طرف ہے۔

شعر۔۳ لاف: شیخی۔ مطلب یہ ہے کہ ہم میں اپنی سادہ دلی (کے فریب) کی وجہ سے ابھی تک (یعنی عشق میں بھی) یہ شیخی ہے کہ ہم میں تمکنت اور ثابت قدمی موجود ہے۔ اگر چہ ہمارے دل میں ایسے ایسے راز ہائے سینہ گداز بھرے ہوئے ہیں کہ جن کے موجود ہوتے ہوئے تمکین و ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے۔ یا یہ کہ اے لاف تمکین تو نے میری سادہ دلی کا فریب کھایا ہے جو مطمئن ہے کہ ہمارا حال کسی پر کھل نہیں سکتا کیونکہ ہمارے سینہ کے اندر ایسے ایسے راز موجود ہیں جو سینہ گداز ہیں اور ہرگز نہیں چھپ سکتے۔

جناب حکیم امتیاز الدین مدفیوضہم پہلے مصرعہ میں کسی جگہ بھی اضافت نہیں پڑھتے اور فرماتے ہیں کہ "سادہ دل سے یہاں مراد ہے دل کا اثر سے خالی ہونا اور شاعر کہتا ہے کہ ایسے راز ہائے سینہ گداز کے ہوتے تمکین کا دعویٰ کیا جائے تو وہ بیہودہ ادعا ہے اور اگر دل کو غیر متاثر سمجھا جائے تو یہ بھی غلطی یا دھوکا ہے۔" (رسالہ اردو)

شعر۔۵ یعنی اب تک تو میں اس ستمگر کے ناز اٹھانے کی حسرت رکھتا ہوں۔ خدا کرے کبھی وہ دن بھی آئے جب کہ میں اس کی حسرت ناز کے بجائے اس کے ناز اٹھاؤں۔

شعر۔۶ مطلب یہ ہے کہ میرے دل کا سارا خون پلکوں کے ذریعہ باہر ٹپک گیا، یعنی آنکھوں کی راہ آنسو بن کر نکل گیا۔

شعر۔۷ مصرعہ اول میں 'اے' کے بعد نازنین اور مصرعہ دوم میں 'اے' کے بعد (ظالم) محذوف ہے۔

شعر۔۸ یعنی تو نے جو میرے یہاں قدم رنجہ فرمایا، تو میرے جبین نیاز کے سجدے تجھ کو مبارک

ہوں۔

شعر۔۹ کچھ غضب نہ ہوا: کوئی حرج کی بات نہیں۔ غریب نواز: غریب پرور۔

شعر۔۱۰ دریغا: افسوس۔ شاہد: معشوق۔ مطلب یہ ہے کہ اسد اللہ خاں مرگیا، ہائے افسوس، ہائے وہ رند شاہد باز۔

ردیف س

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دام خالی، قفسِ مرغ گرفتار کے پاس
جگر تشنۂ آزار، تسلی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس
میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیر سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس
دہنِ شیر میں جا بیٹھیے، لیکن اے دل
نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس
دیکھ کر تجھ کو چمن بس کہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس
مرگیا پھوڑ کے سر غالبؔ وحشی، ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

شعر۔۱ مژدہ: خوشخبری۔ دام، بمعنی وہ دام جو کہ مقید مرغ کے دام کے برابر، اس غرض سے لگا ہوتا ہے کہ دوسرے پرند بھی اسے دیکھ کر وہاں آکر پھنسیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے ذوق اسیری (قید ہونے کا شوق) تجھ کو خوشخبری ہو کہ مرغ گرفتار کے پاس دام خالی ہے، چل اور اس میں گرفتار ہو جا۔

شعر۔۲ تشنہ آزار: تکلیف کا پیاسا، ایذا طلب۔ تسلّی نہ ہوا یعنی تسلی نہ ہو، راحت یاب نہ ہوا۔ بن: جڑ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر چہ ہم نے ہر کانٹے کی جڑ میں خون کی ایک ندی بہادی یعنی جہاں جہاں کانٹا لگا تھا وہاں سے خون کی ندی بہنے لگی لیکن پھر بھی میرے جگر تشنہ آزار کو تسلی نہیں ہوئی۔ اور

اس ایذا طلب کی تشنگی خونفشانی نہ بجھی۔ ایک دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تشنہ آزار سے خار مراد لی جاوے، یعنی اگر چہ ہم نے ہر کانٹے (یا بال) کی جڑ میں ایک جوئے خون بہادی لیکن خارِ دست معشوق اس قدر ظالم ہیں کہ ان کو پھر بھی تسلی نہ ہوئی۔

شعر۔۳ اسی مطلب کو مرزا صاحب نے اس سے پہلے بھی ادا کیا ہے۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے میری بالیں پہ اسے پر کس وقت

شعر۔۴ دشنہ: خنجر۔ مطلب یہ ہے کہ میرے غمخوار نے جو نصیحت اور ملامت بر بنائے عشق کی ہے، تاکہ میں اس سے باز آؤں تو اس سے مجھ کو اور زیادہ تکلیف ہوتی ہے اور میری جان اور بھی زیادہ مشکل سے نکلتی ہے۔ اس سے تو یہ بہتر تھا کہ زبان و ملامت کے بدلے کسی خنجرِ تیز سے میرا کام تمام کر دیا ہوتا۔

مولانا سہا لکھتے ہیں: ”غمخوار کے سارے دلاسے اور تسلیاں مریض عشق کے لیے بیکار ہوتی ہیں۔ ذرا اس کے دلاسوں سے طبیعت ٹھہرتی ہے اور پھر بگڑتی ہے، گویا سنبھلنا پھر بگڑ جانا، رک رک کے مرنا ہے اور ظاہر ہے کہ رک رک کے مرنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے غمخوار کے پاس بجائے زبان کے جس پر الفاظ تسکین و تسلی جاری رہے ہیں، تیز سی چھری ہوتی اور وہ چلتی تو آسانی سے موت آجاتی۔“

شعر۔۵ یعنی معشوقان دل آزار سے دل لگانا سب سے زیادہ مخدوش اور مہلک ہے۔ شیر کے منہ میں جانا ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں خود اپنی موت تلاش کرنا۔ خود در پئے مرگ ہونا۔

شعر۔۶ نمو کرتا ہے، یعنی جوشِ شوق میں اس میں بالیدگی ہوتی ہے یہاں تک کہ پھول خود بخود تیری پگڑی میں جا لگتا ہے تاکہ وہاں پہنچ کر تجھ کو زینت دے اور خود فخر حاصل کرے۔

شعر۔۷ قریب قریب اسی مضمون کا ایک شعر پہلے بھی آچکا ہے۔

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

ردیف ش

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے   لگائے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش
فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

شعر۔۱ خس جوہر: جوہر آئینہ۔ طراوٹ: نمی۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کا روئے نگار ایسا آتشیں ہے کہ اگر خس جوہر آئینہ میں اس کے سبزۂ خط سے طراوت نہ پہنچے تو اس کے عکس رخ سے خانہ آئینہ میں آگ لگ جائے۔

شعر۔۲ شمع کے ڈورے کو خار شمع کہا ہے۔ اس خار کا نکالنے والا شعلہ آتش ہے۔ کیونکہ وہ اس کو جلا دیتا ہے۔ آتش کو فروغ حسن سے اور شمع کو عاشق سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے شعلہ آتش (لوے شمع) سے شمع کی مشکل حل ہو جاتی ہے یعنی کانٹا (ڈورا) جل کر نکل جاتا ہے، اسی طریقہ سے فروغ حسن معشوق سے عاشق کی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ وہ خاشاکِ آتش فروغ حسن بن جاتی ہیں۔ (یعنی جل جاتی ہیں)

ردیف ع

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

شعر۔۱ تارِ شعاع: سفید خط جو غروب آفتاب کے بعد اور طلوع سے کچھ پہلے آسمان پر دکھائی دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شام کے وقت خورشید کو تارِ شعاع جادۂ رہ (جانے کا راستہ) بنا ہوا ہے اور فلک اس کے وداع کرنے کو آغوش ہلال کھولے ہوئے ہیں۔ (یعنی بالفاظِ دیگر آفتاب رخصت ہونے کو تیار ہے اور آسمان اس کو رخصت کرنے کے لیے آغوش (ہلال) کھولے ہوئے آمادہ ہے۔

رُخ نگار سے ہے سوز جاودانِ شمع   ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانی شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ، خاموشی   یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع
کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام   بہ طرز اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع
غم اس کو حسرتِ پرواز کا ہے، اے شعلے   ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانی شمع
ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے   بہ جلوہ ریزی باد و بہ پرفشانیِ شمع
نشاط داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ   شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع
جلے ہے، دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغ بدگمانیِ شمع

شعر۔۱ جاودانی: دائمی۔ آتش۔ آتشِ رشک۔ گل، یعنی رخ نگار۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کے رخساروں کے رشک سے شمع کو سوز جاودانی ملا۔ اس لیے گویا آتش رخسارِ دوست، شمع کے لیے آب حیات کا کام دیتی ہے۔ کیونکہ شمع اسی وقت تک زندہ سمجھی جاتی ہے جب تک کہ وہ روشن ہے اور اس کی روشنی کی وجہ ہے آتش رخسار دوست۔

شعر۔۲ روشن ہوئی: ظاہر ہوئی، ثابت ہوئی۔ شمع کی رعایت سے روشن ہونا اور اہل زبان، نہایت خوبی کے ساتھ لایا گیا ہے۔ چونکہ شمع کا خاموش ہونا، اس کا مرجانا ہے اس لیے مطلب یہ ہوا کہ زبانیِ شمع ہم کو یہ بات معلوم ہوئی، یعنی شمع کو دیکھ کر ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ اہل زبان کا خاموش ہو جانا گویا اس کا مرجانا ہے۔ شمع کو اس کی لو کے لحاظ سے اہل زبان کہا ہے۔

شعر۔۳ ایما: اشارہ کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ ''شمع صرف شعلہ کے اشارہ سے سارا قصہ تمام کرتی ہے، یعنی شعلہ سے لو لگا کر سر سے پانو تک فنا ہو جاتی ہے، جس طرح صوفیان اہل فنا شعلہ عشق سے لو لگا کر فنافی الذات ہو جاتے ہیں اور اپنی ہستی سے گزر جاتے ہیں۔'' (طباطبائی)

مولوی محمد مہدی صاحب اس کا مطلب اس طرح بیان کرتے ہیں۔ ''کہتے ہیں شمع کی فسانہ خوانی ان لوگوں کی طرح ہے جو اپنی ذات میں فنا ہو کر خودی کو ترک کر دیتے ہیں۔ فسانہ خوانی

سے فنا ہونا مراد ہے اور جس کے ایما سے شمع اپنا قصہ تمام کرتی ہے، یعنی فنا ہوتی ہے وہ شعلہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے لو لگا کر اپنی ہستی کو مٹا دیتی ہے۔" (از رسالہ اردو)

شعر۔۴ شاعر شعلے سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ اے شعلہ تیرے لرزنے سے جو شمع کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے، تو اس کمزوری کا باعث اس کو پروانہ کے جل جانے کا غم ہے۔ اسی غم کی وجہ سے وہ اتنی ناتواں ہوگئی ہے کہ لرزتی ہے۔

شعر۔۵ اہتزاز: خوش ہو کر ہلنا۔ جلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع۔ یعنی قسم ہے ہوا کی جلوہ ریزی اور شمع کی پرفشانی کی قسم میں تشبیہ بھی مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قسم ہے کہ جس طریقہ سے کہ ہوا کی جلوہ ریزی سے شمع جھلملانے لگتی ہے، اسی طریقہ سے تیرے خیال سے میری روح جنبش سرور میں آجاتی ہے۔

شعر۔۶ لفظ گل میں ایہام ہے۔ 'گل' کی رعایت سے لفظ شگفتگی لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ داغ غم عشق کی خوشی کی بہار کچھ نہ پوچھ۔ اس کی یہ شگفتگی شمع کے خزاں زدہ گل کی شہید (عاشق) ہے یعنی فنا ہوجانے والی ہے۔

مولانا طباطبائی صاحب اس کا مطلب یوں بیان فرماتے ہیں "جس طرح شگوفہ شعلہ بہار شمع کو خزاں کر دیتا ہے، اسی طرح داغ عشق، عاشق کا کام تمام کر دیتا ہے، لیکن اس داغ میں عجیب بہار ہے کہ اس گل خزانی پر شگفتگی نثار ہے۔"

مولانا حسرت موہانی صاحب کا بھی اس شعر کے معنی کے متعلق قریب قریب یہی خیال ہے۔

شعر۔۷ بدگمانی اس وجہ سے کہ وہ یار کے سرہانے مجھے دیکھ کر (مارے رشک کے) جل رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی میرے محبوب پر عاشق ہے اور یہی بدگمانی کا باعث ہے۔

ردیف ف

ہم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار، حیف
جلتا ہے دل کہ کیوں، نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفس شعلہ بار حیف

شعر۔۱ نہیں کرتے وداع ہوش، یا تو اس وجہ سے کہ راز محبت فاش ہو جائے گا یا اس وجہ سے کہ ہماری بے ہوشی سے رقیب مستفید ہوگا اور اس کا کام بن جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ رقیب کے خوف کی وجہ سے ہم نہ سو سکتے ہیں، نہ شراب پی سکتے ہیں اور نہ کوئی اور نشہ کر سکتے ہیں۔ اے اختیار تجھ پر افسوس کہ ہم یہاں تک مجبور ہوئے کہ ایسے بے اختیار ہو گئے۔

شعر۔۲ جلتا ہے دل: افسوس ہے۔ اکبار: یکدم۔ نفس: آہ۔ مطلب یہ ہے کہ اے آہ شعلہ بار تیری ناتمامی اور کمزوری پر مجھ کو افسوس ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہو جاتا کہ ہم ایک دم ہی جل کر فنا ہو جائیں۔

مولوی محمد مہدی صاحب لکھتے ہیں "جدید تحقیقات یہ ہے کہ تنفس دھیمے طور پر جلنے کا نام ہے۔ کیونکہ آکسیجن (oxygen) ایک سوزندہ عنصر ہے۔ سانس میں بھی خارج ہوتا ہے۔ مرزا صاحب کے فلسفیانہ دماغ نے یہ مسئلہ دریافت کر لیا۔ حالانکہ وہ علوم جدید سے واقف نہ تھے، اور نہ اس وقت یہ مسئلہ منکشف ہوا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرزا صاحب نے اسی شاعرانہ خیال پر ان شعروں کی بنیاد رکھی ہو کہ سینہ میں غم یا محبت کی آگ بھری ہوئی ہے۔ سانس میں اسی آہ کے شعلہ نکلتے ہیں۔ لیکن شعروں کا انداز صاف طور پر اسی جدید مسئلہ کی طرف صراحت کر رہا ہے۔"

(رسالہ اردو)

ردیف ک

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک
مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہوجیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک
شور جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک
داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ
یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک
چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک
غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توقیرِ درد
زخم، مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک
یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

شعر۔۱ مطلب یہ ہے کہ یہ طفلان بے پروا، جو دیوانہ کے پتھر مار رہے ہیں، ان میں اتنی تمیز کہاں کہ وہ ان زخموں پر نمک چھڑکیں۔ اگر خود یہ پتھر نمک کے ڈھیلے ہوتے تو بڑے مزے ولطف کی بات ہوتی کہ زخم کا زخم بھی لگتا اور ساتھ کے ساتھ ان پر نمک بھی چھڑکا جاتا۔

شعر۔۲ یعنی ویسے تو دنیا میں بہت سا نمک پیدا ہوتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ ہم کو نمک سے اتنی لذت حاصل نہیں ہوتی جتنی کہ گردِ راہ یار (کے زخم میں بھرنے) سے ہوتی ہے۔ گرد راہ یار ہی زخم دل کا سرمایۂ ناز ہے۔ گرد راہ یار کو نمک پر اس بنا پر ترجیح دی ہے کہ گو نمک ابتدا میں تکلیف رساں ہے، مگر آخر کار زخم بھر دیتا ہے اور مٹی زخم کو بڑھاتی ہے، بھرتی نہیں۔

شعر۔۳ ارزانی رہے۔ مبارک ہو: اس شعر میں صنعت لف ونشر مرتب ہے یعنی مجھ کو نالۂ بلبل کا درد اور ارزانی رہے اور تجھ کو خندۂ گل کا نمک مبارک ہو۔

شعر۔۴ جولان: دوڑنا (گھوڑے کا)۔ شور: سمندر کی صفت ہے۔ شور اور نمک میں رعایت لفظی ہے۔ مطلب یہ ہے آج سمندر کے کنارے کس کے گھوڑے کے دوڑنے کا شور ہے۔ کہ (اس کے

رشک سے) گردِ ساحل موجِ دریا کے زخموں کے لیے نمک بنی ہوئی ہے، یعنی توسنِ یار کی گرم جولانی کے (شور کے) مقابلہ میں جوش وخروش سمندر گرد ہے اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

شعر۔۵ داد دیتا ہے یعنی قدر کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سبحان اللہ میرا معشوق میرے زخم جگر کی کیسی قدر کرتا ہے کہ جہاں کہیں نمک دیکھتا ہے، وہ مجھ کو یاد کرتا ہے کہ یہ اس کے زخمِ جگر پر چھڑکا جاتا تو اچھا ہوتا۔ یاد کرنے کے معنی بلانے کے بھی لیے جاسکتے ہیں، یعنی نمک کے دیکھتے ہی وہ مجھ کو بلا بھیجتا ہے اور میرے زخم جگر پر نمک چھڑک کر اس کی داد دیتا ہے۔

شعر۔۶ محبوب سے خطاب ہے کہ ایسی صورت میں جب کہ تن زخمی ہے اور دل کو زخم کی آرزو ہے تو (دل میں) بلا زخم لگائے اور (بدن کے زخموں پر) بغیر نمک چھڑکے افسوس کہاں جاتا ہے۔

شعر۔۷ توقیر: بہت کرنا، زیادہ کرنا۔ خندہ زخم کو جو ایک مشہور استعارہ ہے، خندۂ معشوق سے نمکین ہونے کی بناء پر تشبیہ دی ہے اور چونکہ زخم نمکین ہے تو اس میں لامحالا اتنا درد ہوگا کہ غیر کا احسان اٹھانے کی ضرورت نہیں۔

شعر۔۸ وجد: غمگین ہونا، شیفتہ ہونا۔ مجازاً حالتِ ذوق وشوق۔ وجد شوق: فرط شوق۔ مطلب یہ ہے کہ اے غالب تجھ کو کیا وہ زمانہ یاد نہیں جبکہ زخم سے جو نمک گرتا تھا، میں اس کو فرط ذوق سے اپنے پلکوں سے اٹھا لیتا تھا؟ یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ نمک اگر گر جاوے تو اس کو پلکوں سے اٹھانا چاہیے۔

آہ کو چاہیے ایک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دامِ ہر موج، میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب، اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے، ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک
غمِ ہستی کا اسدؔ، کس سے جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شعر۔۱ سر ہونے تک بمعنی قابو میں آنے تک، زیر ہونے تک۔ مطلب یہ ہے کہ میری آہ موثر ضرور ہے لیکن اس کے اثر پذیر ہونے کے لیے ایک بڑی مدت درکار ہے۔ جب تک تیری زلف میرے قابو میں آئے گی، میرا اس وقت تک کام تمام ہو جائے گا۔

شعر۔۲ کام: تالو۔ نہنگ: گھڑیال رکھتے ہیں کہ موج میں سینکڑوں نہنگ منہ پھاڑے ہوئے ہیں۔ دیکھیں قطرے پہ موتی بننے تک کیا کیا آفتیں گزرتی ہیں۔

''مطلب جو اس شعر میں ادا کیا گیا ہے، وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجہ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔'' (یادگارِ غالب)

شعر۔۳ رنگ کروں: تدبیر کروں۔ عاشقی صبر طلب یعنی تقاضائے عشق یہ ہے کہ صبر کیا جائے کیونکہ اس کے معاملات ایسے ہیں کہ جلدی میں کام نہیں چل سکتا۔ مطلب ہے کہ عاشقی تو صبر چاہتی ہے لیکن تمنا بیتاب ہے۔ بس جب تک جگر، خون ہو۔ اس وقت تک دل کا کیا علاج کروں۔

شعر۔۴ تغافل: غفلت کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے مان لیا کہ تم تغافل نہیں کرو گے، مگر مشکل تو یہ ہے کہ جب تک تم کو ہمارے حال کی خبر پہنچے گی، ہم تو اس وقت تک ختم ہو جائیں گے۔

شعر۔۵ پرتو: سایہ۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے سورج کے پرتو سے شبنم فنا ہو جاتی ہے (دھوپ سے شبنم اڑ جاتی ہے) اسی طریقہ سے اگر آپ کی ایک نظرِ عنایت مجھ پر پڑ جائے گی تو میں بھی فنا ہو جاؤں گا۔ پرتو خور کو نظر معشوق سے تشبیہ دی ہے:

گرانجاں تر زشبنم نیست جسم ناتواں من   اگر می بود با من روئے گرمی آفتابش را

شعر۔۶ یعنی اے غافل، زندگی کا زمانہ بہت ہی تھوڑا ہے۔ گرمیِ بزم (دنیا) اس سے زیادہ عرصہ تک نہیں رہتی۔ جتنا عرصہ کہ ایک چنگاری کو اُڑ کر اس کے بجھ جانے میں لگتا ہے، یعنی بالکل بے ثبات اور بہت جلد فنا ہو جانے والی ہے۔ ذوق کا بھی ایک شعر ہے:

کیا اعتبار ہستیِ ناپائیدار کا   چشمک ہے برق کی تبسم شرار کا

شعر۔۷ اس شعر میں انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی، اس کو غم سے نجات نہیں ملتی، شمع سے تشبیہ دی ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی، برابر جلتی رہتی ہے۔ ہر رنگ میں یعنی ہر حال میں:

اے شمع تیری عمرِ طبعی ہے ایک رات   ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

ردیف گ

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دعا نہ مانگ   یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

شعر۔۱ بغیر: سوائے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تجھ کو اس بات کا یقین ہے کہ تیری دعا ضرور قبول ہو جائے گی، تو تو صرف یہی دعا مانگ کہ تجھ کو دل بے مدعا، (وہ دل کہ جس کو کوئی غرض ہی نہ ہو) عطا ہو، کیونکہ تجھ کو دل بے مدعا مل جانے پر کسی چیز کے لیے دعا مانگنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم لکھتے ہیں کہ ''اگر جنت کی ہوا و ہوس، دوزخ کا خوف دہر اس دل پر غالب ہو تو عبادت عین مصیبت ہے۔ یہاں تک کہ اگر طالب کو یقین ہو کہ اس کی مناجات درجۂ قبول ضرور حاصل کرے گی تو یہ خیال ہی سجدۂ نیاز کو باطل کر دینے کے لیے کافی ہے۔''

شعر۔۲ ''اس شعر میں ایک نئی طرح کی شوخی ہے جو بالکل اچھوتی۔ بظاہر شاعر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ اور در پردہ الزام دیتا ہے، گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں، وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب ان کو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں دیے ہیں اور جو شمار میں اس کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں۔ ان کی گنتی یاد نہیں آتی۔ گناہ اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بسبب عدمِ استطاعت کے اس کو خاطر خواہ نہ کر سکا۔ کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہ ہوا اور وصل میسر آیا تو شراب نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کیے ہیں اتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں۔'' (یادگارِ غالب)

اسی خیال کو مرزا پھر آگے چل کر باندھتے ہیں:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ردیف ل

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل   بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف   ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل
جو تھا، سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا   اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل
خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو   رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بہ پائے گل
ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار   میرا رقیب ہے نفسِ عطر ہائے گل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے   مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل
سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی   خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل
تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکہ کہ آج تک   بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

غالبؔ مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے کہ گل جیب قبائے گل

شعر۔۱ یعنی گل خود بلبل پر، اس کی اس سادگی وحماقت پر کہ کس قدر وفائے گل کے فریب کا کشتہ ہے، خندہ زن ہے (یعنی ہنس رہا ہے) کہ اس نے خوب دھوکا کھایا۔ قریب قریب اسی مضمون کا ایک شعر پہلے بھی آچکا ہے۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل   کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا

شعر۔۲ ہوائے گل: شوق گل، مجازاً بوئے گل۔ مطلب یہ ہے کہ ہر طرف غنچہ کے کھل جانے سے بوئے گل کے دام کے حلقہ ٹوٹے پڑے ہیں۔ یعنی جو بوئے گل مقید تھی وہ گل کے کھل جانے سے آزاد ہوگئی۔ پس اب نسیم پرانے بوئے گل کو آزادی مبارک ہو۔

شعر۔۳ جو تھا، یعنی جو گل تھا۔ نوا: آواز۔ مطلب یہ ہے کہ چمن میں جو کوئی پھول تھا۔ وہ موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا۔ یعنی اس دھوکہ میں کہ اس نے اس رنگ کو مستقل پائیدار سمجھا۔ اگرچہ وہ بالکل بے ثبات تھا۔ افسوس ہے کہ اب پھول دھوکے میں آنے پر خونیں نوا، یعنی بڑی غمناک اور دلسوز آواز میں نالہ کر رہے ہیں اور ان کی حالت قابل افسوس ہے۔

حسرت صاحب اس کا مطلب یوں بیان فرماتے ہیں ”لوگ موج رنگ کے دھوکے میں ہیں۔ حالانکہ درحقیقت وہ گل کی نوائے خونیں اور نالہ خونچکاں تھا۔“ نظامی صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔

شعر۔۴ اس شعر میں عاشقِ سیہ مست کو سایۂ گل سے اور معشوق کو گل سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سایۂ گل کی طرح اگر عاشق سیہ مست کا سر معشوق کے پانو پر رکھا ہو تو (یہ سمجھنا چاہیے کہ) وہ بہت ہی خوش نصیب ہے۔

شعر۔۵ ایجاد: وجود میں لانا، پیدا کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ بہار پھولوں کو تیرے لیے پیدا کرتی ہے کہ وہ تیرے گلے کا ہار بنیں اور تو ان کی عطر جیسی خوشبو سونگھے۔ نفسِ عطر سائے گل کو تیرے ساتھ اس طریقہ سے ہم نفس ہونا میرے لیے باعث رشک و رقابت ہے۔

شعر۔۶ مینا: شیشی۔ مینائے بے شراب: وہ شیشی جس میں کہ شراب نہ ہو۔ دل بے ہوائے گل: وہ دل جس میں سیر گل کی خواہش نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ جو مجھ پر باغ کی سیر کرنے اور شراب پینے پر اعتراض کرتے ہیں تو میں ان دونوں چیزوں کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں کیونکہ اگر زمانہ بہار میں میرا شیشہ شراب سے اور دل ہوائے گل سے خالی ہوا تو مجھ کو باد بہار سے شرمندگی ہوتی ہے۔

شعر۔۷ سطوت: دبدبہ، رعب۔ غیور: غیرت مند۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے حسن غیور کے رعب سے گل کی ادا کا رنگ میری نظروں میں خون معلوم ہوتا ہے، یعنی تیری غیرت مند طبیعت جو اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ مجھ کو کسی اور کی ادا اچھی معلوم ہو تو اس سبب سے رنگ ادائے گل مجھ کو بھلا نہیں معلوم ہوتا۔

شعر۔۸ یعنی تیرے جلوے کے دیکھنے ہی کے دھوکے میں پھول یکے بعد دیگرے نکلے چلے آتے ہیں۔

شعر۔۹ ہم آغوشی آرزو، اضافت مقلوبی ہے۔ یعنی آرزوئے ہم آغوشی۔ مطلب یہ ہے کہ میں اس شاہدِ حقیقی سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہوں کہ جس کے خیال کو گل نے اپنی جیبِ قبا کی زینت بنایا ہے۔

ردیف م

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس   برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال   ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بت خانہ ہم
باوجودِ یک جہاں ہنگامہ، پیدائی نہیں   ہیں چراغانِ شبستان دل پروانہ ہم
ضعف سے ہے، نے قناعت سے، یہ ترکِ جستجو   ہیں وبالِ تکیہ گاہ ہمت مردانہ ہم
دایم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

شعر۔۱ مطلب یہ ہے کہ ہم آزادوں کو دم بھر سے زیادہ غم نہیں ہوتا، چنانچہ ہم اپنے ماتم خانہ کی شمع کو برق سے، جو ایک لمحہ میں غائب ہو جاتی ہے، روشن کرتے ہیں کیونکہ اس میں زیادہ روشنی کی ضرورت ہی نہیں۔ یعنی بالفاظ دیگر آزادوں کو غم نہایت ہی عارضی اور فوری ہوتا ہے اور ان کے ماتم خانہ کی روشنی بجلی ہے کہ جس کی چشمک بھی دم بھر سے زیادہ نہیں۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم اس کے معنی اس طرح بیان فرماتے ہیں ”دنیا کی تکالیف علایق سے ہیں جو اضافت اور نسبت سے بَری ہیں۔ وہ الم سے بھی سبکدوش ہیں۔ آزاد، ظاہر ہے سب سے زیادہ آزاد پاتے ہیں اور رنج اٹھاتے ہیں اور شب و روز تاریک ماتم خانہ میں رہتے ہیں، لیکن واقعتاً غم کا اثر ان پر عارضی اور فوری ہوتا ہے۔ مرزا اپنی اس سکونِ طبیعت کی کیا فوق الخیال مثال رکھتے ہیں کہ جب برقِ بلا گرتی ہے تو ہم بجائے خوف زدہ اور پریشان ہونے کے، کمال اطمینان سے اٹھ کر اس جوالۂ برق سے اپنے الم کدہ کی خاموش کشتہ شمع کو روشن کر لیتے ہیں۔

شعر۔۲ ورق گردانی، بمعنی ورق گردانندہ مطلب یہ ہے کہ خیال گنجفہ باز محفلیں برہم کرتا ہے۔ یعنی برہم شدہ محفلوں کی یاد کو تازہ کرتا ہے، اس لیے ہم گویا ورق گردانندۂ نیرنگِ بت خانہ ہیں۔ گنجفہ اور ورق میں رعایت لفظی ہے۔

شعر۔۳ مطلب یہ ہے کہ باوجودیکہ ہم حسرت و ارماں کا ایک جہاں رکھتے ہیں لیکن ہنگامہ

پیرائی یعنی رونق نہیں۔ گویا ہم شبستان دلِ پروانہ کے چراغاں کے مانند ہیں کہ اس میں ظاہراً کوئی رونق ہی نہیں ہوتی۔

شعر۔۴ مطلب یہ ہے کہ مردوں کی ہمت کے واسطے قناعت تکیہ گاہ ہے، لیکن ہم نے جو یہ ترک جستجو کی ہے اس کا باعث قناعت نہیں ہے بلکہ ہماری کمزوری ہے۔ اس لیے ہم یا ہماری قناعت ہمت مردانہ کی تکیہ گاہ نہیں ہو سکتی، بلکہ یوں کہیے کہ الٹا وبال ہے۔

شعر۔۵ دائم الحبس: ہمیشہ کے لئے قید۔ مطلب یہ ہے کہ اے اسدؔ چونکہ میرے سینۂ پُرخوں میں لاکھوں تمنائیں مقید ہیں۔ اس لیے میں اس کو زندان خانہ سمجھتا ہوں۔

بہ نالہ حاصلِ دلبستگی فراہم کر   متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

شعر۔۱ ”دلبستگی یعنی تعلق خاطر کو زنجیر سے مشابہ کیا ہے اور کہتا ہے کہ جس طرح خانۂ زنجیر کی دولت اس کی صدا یا جھنکار کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی، اسی طرح تعلق خاطر کی متاع بھی نالہ کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ پس اسی کو فراہم کرنا چاہیے یعنی نالہ کشی اختیار کرنا چاہیے۔“ (حسرت)

”اگر تو دلبستہ ہے تو رونا بھی اختیار کر کیونکہ زنجیر جو ایک دلبستہ ہے، اس کے گھر میں سوائے نالۂ فریاد کے کچھ نہیں ہے، گویا حاصل دلبستگی رونا ہے۔“ (آسی)

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور   رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعویِ وارستگی کی شرم

شعر۔۱ ”پردیس میں مرنا جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے، اس پہ خدا کا شکر اس لیے کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں! کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کون تھا اور کس مرتبہ کا آدمی تھا؟ لیکن وطن میں مرنا، جہاں ایک زمانہ واقف حال ہو مگر خریدار اور غمخوار ایک بھی نہ ہو، وہاں مردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی۔ پس خدا کا شکر ہے کہ اس نے پردیس میں مار کر میری بے کسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے مگر فی

الحقیقت سراسر اہل وطن کی شکایت ہے جس کو ایک عجیب پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔" (یادگار غالب)

شعر۔۲ وارستگی: آزادی۔ کمیں: گھات۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے زلف کے حلقے میرے پھانسنے کی فکر میں ہیں۔ اے خدا تو مجھ کو اسیر زلف ہونے سے بچا کر میرے دعوی آزادی کی شرم رکھ لیجیو۔ کیونکہ اگر زلف کے پھندے میں پھنس گیا تو پھر میرا وارستگی اور آزادی کا دعویٰ باطل ہوجائے گا۔

ردیف ن

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش، ولے
غالبؔ! یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

شعر۔۱ یعنی میری تقدیر سو رہی ہے اور میں بیخواب ہوں۔ اگر میں اپنے اس بخت خفتہ سے ایک خواب خوش لینا چاہوں تو لے سکتا ہوں۔ لیکن غالب خوف یہ ہے چونکہ میں خواب سے محروم ہوں (یعنی فراق معشوق میں بالکل نیند نہیں آتی) اس لیے میں اس قرض کو ادا نہیں کرسکوں گا، اس واسطے قرض نہیں لیتا۔ حاصل یہ ہے کہ مجھ کو چین و آرام ملنے کی کوئی تدبیر ممکن نہیں۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں　　وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے　　ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا　　شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے　　اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں، لہو رونا　　دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق　　واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں　　میں کہاں، اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہوگئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

شعر۔۱ اس پوری غزل میں شاعر اپنے پچھلے زمانہ کو یاد کرتا ہے، یعنی نہ وہ لذت فراق باقی ہے اور نہ وہ ذوق وصل اور نہ وہ زمانہ ہے (یعنی بڑھاپا آنے سے دل میں کوئی شوق نہیں رہا)۔

شعر۔۲ صاف ہے۔

شعر۔۳ یعنی دل تو رہا درکنار، وہ تو خیر گیا ہی تھا، لیکن اب وہ دماغ بھی نہیں رہا تو پھر بھلا اب خیال خط و خیال یار میں زور و شور کہاں؟

شعر۔۴ چونکہ پہلے بیان کرچکے ہیں کہ ذوق معشوق بالکل باقی نہیں رہا، اس لیے معشوق کی بجائے لفظ شخص پر اکتفا کیا ہے۔ رعنائیِ خیال: رنگا رنگی خیال۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے خیال میں جو کچھ رنگینی تھی وہ محض ایک شخص کے تصور کا کرشمہ تھا۔ اب جبکہ وہ تصور ہی نہیں رہا تو پھر رعنائیِ خیال کیسی؟

شعر۔۵ لہو رونا: اشک خوں بہانا۔ یعنی خونِ دل و جگر سب پہلے ہی ختم ہو چکا۔ ساری طاقت زائل ہوچکی پھر دعویٰ خونفشانی کیسا؟

شعر۔۶ قمار خانہ: جوا گھر۔ مطلب یہ ہے کہ مجبوراً قمار خانہ عشق ہم کو چھوڑنا ہی پڑا کیونکہ نہ تو ہمارے پاس اب نہ نقد دل ہے، نہ دولتِ صبر۔ تو پھر اب وہاں جائیں تو کس برتے پر۔ حاصل یہ ہے کہ بہ سبب عدم استطاعت اب عشق بازی سے معذور ہیں۔ ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

غمِ زمانہ نے جھاڑی عشق کی مستی　　وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

شعر۔۷ وبال: مصیبت، مراد فکرِ دنیا۔ مطلب یہ ہے کہ جب سے کہ مجھ میں طاقت عشق زائل ہوئی ہے ہر وقت افکار دنیوی سے پریشان رہتا ہوں، ورنہ اس وبال سے مجھ کو کیا تعلق؟

شعر۔۸ مضمحل۔ محو ہوجانے والا، ناچیز، سست۔ عناصر: چار اصلی اجزاء جن سے کہ آدمی کا جسم مرکب ہے یعنی آگ، پانی، ہوا، مٹی۔ جب تک ان چاروں میں اعتدال رہتا ہے، آدمی زندہ، قوی و تندرست رہتا ہے۔ جہاں ان میں سے کسی ایک نے غلبہ پایا موت آجاتی ہے۔ اعتدال عناصر

سے عہد شباب مراد ہے۔

کی وفا ہم سے، تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں   ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر ان سے   کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو   جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
دل میں آ جائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے   اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ ادراک سے، اپنا مسجود   قبلے کو، اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے   خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں
اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا   آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں
دیکھیے رلاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ   اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا، کہتے ہیں

وحشتؔ و شیفتہؔ اب مرثیہ کہویں شاید
مرگیا غالبؔ آشفتہ نوا، کہتے ہیں

شعر۔۱ 'کی' یعنی معشوق نے۔ باقی مطلب صاف ہے۔

شعر۔۲ صاف ہے۔

شعر۔۳ اندوہ رُبا: غم غلط کرنے والا۔ مطلب یہ ہے کہ اگلے زمانہ کے لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ مے ونغمہ سے غم غلط ہوتا ہے، تو یہ سادہ دل بزرگ ہیں۔ ان سے کچھ نہ کہنا چاہیے ورنہ عشق ان چیزوں سے غلط نہ ہوا کرتا۔

شعر۔۴ گویا شاعر کو نالۂ رسا کی تعریف نہیں معلوم کہ نالۂ رسا کس کو کہتے ہیں۔ اس کے خیال میں نالۂ رسا وہ نالہ ہے جو غشی سے ہوش میں آنے کے بعد پھر دل میں آ موجود ہو۔ اس کے اظہار سے مقصود صرف یہ ہے کہ اس کا نالہ کبھی موثر ہی نہیں ہوا، جو اس کو خبر ہوتی کہ نالۂ رسا کیا چیز ہے۔ یا یہ کہ جب میں غش سے ہوش میں آتا ہوں تو فوراً تصور معشوق میرے دل میں آ جاتا ہے، اس سے زیادہ نالہ کی اور کیا رسائی ہوسکتی ہے۔

شعر۔۵ قبلہ۔ جس کی طرف نماز میں منہ کریں۔ اس شعر میں شاعر نے اس اعتراض کا جواب دیا

ہے کہ مسلم بھی کعبہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا مسجود مطلق ادراک کی سرحد سے بھی اس طرف ہے۔ جیسا کہ مخالفین کا خیال ہے کہ ہمارا مسجود کعبہ نہیں ہے جس کا کہ نہ صرف قوت مدرکہ بلکہ قوت باصرہ سے بھی احساس ہوتا ہے۔ ہم کعبہ کو سجدہ نہیں کرتے، بلکہ معبود حقیقی کو سجدہ کرتے ہیں اور چونکہ سجدہ کے لیے ایک سمت ضروری ہے، اس لیے قبلہ کی سمت کو مقرر کرلیا ہے۔ نعوذ باللہ، وہ ہمارا مسجود نہیں ہے بلکہ وہ ہمارے مسجود حقیقی کی سمت بتلاتا ہے۔ پس دراصل وہ قبلہ نہیں بلکہ قبلہ نما ہے۔

شعر۔۶ افگار: زخم۔ مہر گیا: ایک قسم کی بوٹی ہوتی ہے جس کی جڑ آدمی کی شکل جیسی ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ جو شخص اسے اپنے پاس رکھتا ہے اس پر لوگ مہربان رہتے ہیں۔ یہاں خار راہ کو مہر گیا اس وجہ سے کہا کہ اس سے عاشق کے پیر میں زخم ہوگیا جس کی وجہ سے محبوب کو رحم آ گیا۔ مطلب صاف ہے۔ یعنی جب سے تجھ کو میرے زخم پر رحم آیا ہے، میں خارِ راہ کو تیرے رحم آنے کی وجہ سے مہر گیا سمجھتا ہوں۔

شعر۔۷ اس شعر میں شاعر نے ایک فلسفیانہ مسئلہ قلم بند کیا ہے۔ شرر سے مراد روح حیوانی ہے۔ ہوا، مراد سانس۔ مطلب یہ ہے کہ ہم کو شررِ روح حیوانی سے کیا خوف ہوسکتا ہے جب کہ ہم خود سانس لے لے کر اس کو مشتعل کر رہے ہیں۔ یا یہ کہ ہمارے دل میں آتش عشق کا نہ صرف ایک شرارہ ہے جس سے ہم کو کوئی گھبراہٹ اور پریشانی نہیں۔ اس لیے ہم اس کو ہوا یعنی ہیچ کہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے حوصلہ کے مطابق نہیں۔ ہم کو تو آگ مطلوب ہے، شرر ہمارے لئے کم ہے۔

شعر۔۸ یعنی اس کی ہر بات کی جو ہم تعریف کرتے ہیں اور ہر بات پر جو 'سبحان اللہ' کہتے ہیں تو وہ اس سے بہت مغرور ہوگیا ہے۔ دیکھیے اس کا حشر کیا ہوتا ہے؟

شعر۔۹ وحشتؔ، غلام علی خاں، وحشت تلمیذ مومن۔ شیفتہؔ، نواب مصطفٰے خان صاحب۔ یہ دونوں غالب کے نہایت معتقد تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ غالب آشفتہ نوا کے مرنے پر اس کی یاد میں وحشت و شیفتہ مرثیہ لکھیں۔

آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں   ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہوکر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم، اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں
رونقِ ہستی، ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں
بس کہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں
قطرہ قطرہ ایک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ، مینا کی گردن میں نہیں
ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود!
قد کے جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشت خس کہ گلخن میں نہیں

شعر۔۱ پیراہن: لباس۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے اس پھول کی جو کہ چمن میں نہیں ہوتا، کچھ وقعت نہیں ہوتی۔ اسی طریقہ سے وہ گریباں جو (بعلّت چاک گریبانی لٹک کر) دامن میں نہ ہو، اس کی کچھ عزت نہیں، بلکہ وہ ننگ پیراہن ہے۔ گویا کہ مذہب جنون و عشق میں گریبان کی اصلی دنیاو مناسب جگہ چاک ہوکر، دامن ہی میں قرار دے گئی ہے۔

شعر۔۲ اس شعر میں غالب کے گریہ کے طرز خطاب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے (گریہ کے) اس سوال کا کہ وہ (غالب) روکر اشک خون کیوں نہیں بہاتا، جواب دیتا ہے یعنی یہ کہ اے گریہ میرے رونے سے اشک خوں نہ بہنے کی وجہ یہ ہے کہ میں اتنا کمزور ہو گیا ہوں کہ مجھ میں جو کچھ خون تھا وہ سب رنگ بن کر اُڑ گیا۔ (ظاہر ہے کہ زیادہ نحیف اور کمزور ہونے سے آدمی کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے)۔

شعر۔۳ یعنی دیوار کے روزن میں جو چھوٹے چھوٹے ذرے (روشن دان میں ہو کہ جو دھوپ اندر آجاتی ہے اس میں چھوٹے چھوٹے ذرے دکھائی دیتے ہیں، انھیں کی طرف اشارہ ہے) دکھائی دیتے ہیں، وہ دراصل ذرے نہیں ہیں، بلکہ آفتاب کی آنکھ کے اجزاء (تیرے دیکھنے کے لیے) جمع ہو گئے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ آفتاب تک تیرے دیدار کا مشتاق ہے۔

شعر۔۴ پنبہ: روئی۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنے زندانِ غم کی تاریکی کا کیا حال بیان کروں۔ وہ تو اتنا تاریک ہے کہ اگر اس کے روزن میں روئی رکھ دی جاوے تو وہ نورِ صبح کی طرح چمکنے لگے گی۔ (قاعدہ ہے کہ اگر بہت زیادہ اندھیرا ہو تو تھوڑی سی سفیدی بھی خوب چمکتی ہے)

یادگار غالب میں لکھا ہے کہ ''مکان کے ایک جانب ایک کوٹھری بھی تنگ و تاریک تھی جس کا دروازہ اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں جھک کر جانا پڑتا تھا۔'' بس چونکہ غالب کی نشست گاہ خود اس قدر تاریک تھی اس لیے ان کا خیال یہاں تک پہنچا۔

شعر۔۵ ''یعنی تمام دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے، وہ عشق و محبت کی بدولت ہے۔ خواہ زن و فرزند کی محبت ہو، خواہ مال و دولت کی، خواہ ملک و ملت کی، خواہ اور کسی چیز کی۔ بس اگر خرمن میں برق نہیں، یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اس کی مثال اس انجمن کی ہے جس میں شمع کی روشنی نہیں۔''

(یادگار غالب)

جناب مولانا سید ہاشمی صاحب، رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی رسالہ اردو میں لکھتے ہیں۔

''راقم الحروف کے نزدیک ان معنی میں سب سے اہم پہلو بیان ہونے سے رہ گیا۔ درحقیقت مرزا غالب نے یہاں فلسفہ رواقیہ کا یہ عقیدہ بیان کیا ہے کہ خود ہستی کا مقتضی اور لازمہ فنا یا نیستی ہے۔ اس مضمون کو مرزا صاحب نے اور بھی کئی جگہ ادا کیا ہے۔ مثلاً اس مشہور شعر میں ع: مری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی الخ۔ شعر مذکورہ میں بھی اس مضمون کو ایک نئے پیرایہ میں ادا کیا ہے اور فنا کے بجائے 'عشق ویراں ساز' لاکر اسے باعتبار تغزل نہایت دلکش اور واضح ترقی دی ہے، ورنہ مطلب صرف یہ ہے کہ ہستی اسی وقت ہستی کہلانے کی مستحق ہوتی ہے جب کہ خود اس کے اندر ہستی کی اہلیت اور استعداد موجود ہو۔''

شعر۔۶ چارہ جوئی: علاج کروانا۔ مطلب یہ ہے کہ میرا رقیب جو مجھ کو زخم سلوانے پر چارہ جوئی کا طعنہ دیتا ہے (کیونکہ مذہب عشق میں تکلیف کا علاج کرنا، ایک قسم کی سبکی ہے) تو غالباً اس کو یہ خبر نہیں کہ سوئی سے سلنے میں جو زخم پیدا ہوتا ہے، اس میں بھی ایک عجیب لذت حاصل ہوتی ہے اسی قسم کا ایک شعر اور بھی ہے:

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزاں کی
سمجھنا مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

شعر۔۷ یعنی ہم نے ایک بہارِ ناز کے تصور میں جان دی ہے۔ اس لیے اس کے تصور کے باعث ہماری قبر میں گرد کا نام نہیں۔ ہر طرف جلوۂ گل ہی جلوہ گل ہے۔ گویا تصورِ محبوب ہی میں وہ برکات ہیں جو اس کے گناہوں کی تلافی کے واسطے کافی ہیں۔ مرزا ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال   خلد کا ایک در ہے میری گور کے اندر کھلا

شعر۔۸ ہیولیٰ: مادہ۔ مطلب یہ ہے کہ میرے خون کا ایک ایک قطرہ ناسور کی صورت اختیار کرنے والا ہے۔ گویا میرے خون کے ہر قطرہ میں ذوقِ درد موجود ہے، چنانچہ اس کے ناسور بننے کی یہی وجہ ہے۔

شعر۔۹ ”قلزم آشامی: سمندر کے سمندر پی جانا۔ ساقی شراب پلانے میں بڑی فیاضی سے کام لیتا تھا اور اس پر مغرور تھا، لیکن میں ایسا قلزم آشا تھا کہ میری بلانوشی نے ساقی کی نخوت مٹا دی اور شیشہ کی شراب ختم ہوگئی۔ ”گردن مینا“ میں موج مئے کی رگ، نخوت کی رعایت سے لایا ہے کیونکہ رگ گردن کو غرور سے تعبیر کیا کرتے ہیں“۔ (حسرت)

”یعنی شیشہ اپنے پُر ہونے پر مغرور تھا اور ساقی اترایا ہوا تھا کہ اتنی شراب کون پی سکتا ہے۔ مگر میں ایک قلزم آشام۔ میرے سامنے ایک شیشہ شراب کی کیا ہستی تھی۔ سب چٹ کر گیا۔ اب نہ ساقی کی وہ نخوت نہ شیشہ کو وہ غرور۔“ (آسی)

شعر۔۱۰ فشار: مصدر، فشردن سے ہے، جس کے معنی ہیں نچوڑنا، بھینچنا، دبانا۔ مطلب یہ ہے کہ ضعف نے مجھ کو چاروں طرف سے اس قدر دبایا ہے کہ میری ناتوانی بھی ظاہر نہیں ہوسکتی (اس لیے کہ) قد جو کہ کثرت ناتوانی سے جھک جاتا ہے (اور جس سے کہ ناتوانی ظاہر ہوتی ہے) وہ بھی چاروں طرف سے ناتوانی کے غلبہ کی وجہ سے جھک نہیں سکتا۔ کیونکہ جھکے تو کدھر جھکے۔ پس میری ناتوانی ظاہر ہو تو کس طرح ہو؟

شعر۔۱۱ گلخن: آتشگاہ۔ بھاڑ جس میں غلہ بھونتے ہیں ”اپنے تئیں مشت خس سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح پھونس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا، تو کچھ قدر نہیں ہوتی۔ یہی حال میرا ہے کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر رہوں۔“ (یادگار غالب)

مولانا سید ہاشمی صاحب نے حالی کے ان معنی پر اعتراض کیا ہے۔ لکھتے ہیں ”راقم الحروف کو ان معنی میں کلام ہے۔ شاعر کا اصلی مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیس و پردیس کہیں بھی میرے مخفی جوہر ظاہر نہ ہوسکے اور دونوں جگہ میں ایسا ہی ناکارہ سمجھا گیا جیسا کہ گھانس پھونس کا ایک ڈھیر جو بھٹی میں نہ ڈالا جائے تو محض کوڑا ہے اور بادی النظر میں بالکل بیکار اور بے حقیقت شئے ہے حالانکہ اگر وہ اپنے موزوں مقام، یعنی گلخن میں ہوتا تو اس کے کمالات ظاہر ہوتے اور وہ روشن اور منور ہو جاتا۔“ خس اور گلخن کے اس نادر مضمون کو مرزا صاحب نے ایک اور شعر میں بھی تحریر کیا ہے۔

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا   گر ایک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں
حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بہ سوئے دل   ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں
میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش   تو اور ایک وہ نشیدن کہ کیا کہوں
ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ   ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

شعر۔۱ یعنی میں اس کے ناز کی پوری تعریف نہیں بیان کر سکتا۔ اگر اس میں ایک ادا ہو تو میں اسے اپنی قضا سمجھوں۔ لیکن وہاں تو جان کی لیوا سینکڑوں ادائیں ہیں۔

شعر۔۲ یعنی زلفہائے معشوق میں جو حلقے پڑے ہوئے ہیں وہ گویا چشمہائے کشادہ تار کے حلقے ہیں جو میرے دل کی تاک لگا رہی ہیں۔ لہٰذا اگر میرے ہر تار زلف کو ایک نگہ سرمہ سا کہا جائے تو جائز ہے۔

شعر۔۳ نوا: آواز کہ مجازاً نالہ۔ اسی مضمون کا ذوق کا بھی ایک شعر ہے:

ہاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں   واں ایک خاموشی تری سب کے جواب میں

شعر۔۴ منفعل، شرمندہ۔ خدا نکردہ، یعنی خدا ایسا نہ کرے ہے ہے خدا نکردہ، عاشق کے اس لہجۂ اضطراب سے صاف ترشح ہوتا ہے کہ اس کو معشوق کو بے وفا کہنا کسی طرح بھی گوارہ نہیں ہوسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ میں اور میرے گمان میں ایک تکرار آپڑی ہے۔ میرا گمان تو تجھ کو بے وفا کہتا ہے اور میں باوفا۔ اے ظالم خدا کے واسطے تو اپنی بیوفائی سے باز آ، اور مجھ کو میرے گمان کے سامنے

شرمندہ مت کر (اس وقت معشوق کی بے وفائی کا نقشہ اس کے سامنے آتا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس کے بے وفا کہنے پر مجبور پاتا ہے) یک دم چونک اُٹھتا ہے اور دعا مانگتا ہے کہ اے خدا مجھ کو وہ دن مت دکھائیو کہ مجھے بھی اس کو بے وفا کہنا پڑے۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے۔ چاہو جس وقت　　میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے　　بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ　　کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

شعر۔۱ صاف ہے۔

شعر۔۲ سر نہ اٹھانا: شرمندہ ہونا یا ضعف سے سر نہ اٹھانا، جس معنی میں کہ یہاں مستعمل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اغیار جو مجھ کو میری اس ضعیفی و کمزوری کی حالت میں طعنہ دیتے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ میں ان کو برداشت کر لوں گا۔ یہ طعنے مجھ ضعیف کا سر تو ہیں نہیں کہ وہ اٹھ بھی نہ سکیں۔ ایک طرح اپنی کمال ناتوانی کا اظہار کیا ہے۔

شعر۔۳ "جب کہتے ہیں کہ ان کو فلاں کام کرنے کی قسم ہے، تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس کو اس کام کے کرنے سے انکار ہے۔ پس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اس کو کھا نہ سکوں مگر چونکہ وہ ملتا نہیں اس لیے نہیں کھا سکتا۔ کھا بھی نہ سکوں میں ضعف ایہام ہے۔" (یادگار غالب)

هم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن　　ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
غرّہ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو　　اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں　　رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے　　بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن
دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

شعر۔۱ کھل جاؤ: بے تکلف ہو جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ کسی روز شراب پینے کے وقت ہم سے بے تکلف ہو جاؤ ورنہ ہم کسی دن مستی کا بہانہ کر کے آپ کو دق کریں گے۔ امیر خسرو کا شعر ہے:

جاناں اگر شبیت دہن بر دہن نہم　　خود را بخواب ساز و مگو کہ دہان کیست

شعر۔۲ عالم امکاں: دنیا۔ مطلب یہ ہے کہ تو دنیا کی بلندی پر مغرور مت ہو کیونکہ ایک روز اس دنیا کا فنا ہو جانا لازمی ہے۔ اوج اور پستی میں صنعت تضاد ہے۔

شعر۔۳ رنگ لائے گی، یعنی کوئی نہ کوئی جھگڑا پیدا کرے گی۔ اس بنا پر کہ شراب قرض پیتے رہے ہیں۔ مے فروش اپنا قرض مانگیں گے اور ہمارے پاس دینے کو کچھ ہے نہیں، اپنے آپ جھگڑا ہوگا۔ تذکرۂ آب حیات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ مرزا بہت قرض دار ہو گئے۔ قرض خواہوں نے نالش کر دی۔ جواب دہی میں طلب ہوئے۔ مفتی صاحب کی عدالت تھی۔ جس وقت پیشی میں گئے یہی شعر پڑھا۔ قرض کی پیتے تھے۔ الخ

شعر۔۴ یعنی اگر ترانہ شادی نہیں تو نغمۂ غم کو ہی غنیمت سمجھنا چاہیے کیونکہ ایک روز یہ بھی جاتا رہے گا اور سازِ ہستی میں کوئی نغمہ نہیں رہے گا۔ ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم کہ آخر　　نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق　　نوحۂ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی

شعر۔۵ دھول دھپا: مار پیٹ۔ بعض لوگ اس لفظ کو غیر فصیح خیال کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہاتھا پائی معشوق کا دراصل شیوہ نہیں ہے، بلکہ ایک دن ہم ہی سے گستاخی ہو گئی تھی جس پر مجبور ہو کر اس نے ایسا کیا۔

ہم پر جفا سے، ترکِ وفا کا گماں نہیں　　اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجیے اس لُطفِ خاص کا　　پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز　　نامہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں
بوسہ نہیں، نہ دیجیے دشنام ہی سہی　　آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ہرچند جاں گدازی قہر و عتاب ہے   ق   ہر چند پشت گرمی تاب و تواں نہیں
جاں، مطربِ ترانۂ ھل من مزید ہے   لب، پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں
خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دونیم   دل میں چھری چبھو مژہ گر خوں چکاں نہیں
ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو   ہے عارِ دل نفس اگر آزر فشاں نہیں
نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب   سو گز زمین کے بدلے بیاباں گراں نہیں
کہتے ہو "کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں"   گویا جبیں پہ سجدۂ بُت کا نشاں نہیں
پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی   روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

جاں ہے بہاے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

شعر۔۱ یعنی وہ جو مجھ پر جفا کرتے ہیں تو اس غرض سے نہیں کہ میری وفا کا امتحان لیویں کہ دیکھیں، ظلم کرنے پر بھی باوفا رہتا ہے یا نہیں بلکہ یہ جفا صرف ایک دل لگی کی وجہ سے ہے۔

شعر۔۲ لطف خاص کا: یعنی پرسشِ پنہاں کا جو کہ صرف انداز و اشارات سے ہو، نہ کہ گفتگو سے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی اس مہربانی کا کہ در پردہ وہ میری خبر گیری رکھتے ہیں، میں کس طرح شکریہ ادا کروں (یعنی نہیں کرسکتا) اس شعر کو حمد یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی میں خدائے عزوجل کی کس زبان سے تعریف کروں کہ وہ بغیر کسی گفتگو کے خود ہی اپنے بندوں کی خبر گیری رکھتا ہے۔

شعر۔۳ مطلب یہ ہے کہ ہم کو جفا پسند ہے اور وہ ہم پر ظلم کرتا ہے، یعنی وہی بات کرتا ہے جو ہم کو مرغوب ہے، تو گویا وہ ایک طریقہ سے ہم پر مہربان ہوا۔ پس اگر وہ ہم پر حقیقت میں مہربان نہیں تو ہم اس کو نامہربان بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہماری مراد کا پورا کرنا (یعنی ستم کرنا) ہی ایک قسم کی مہربانی ہے:

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

شعر۔۵۔۶ ہرچند: جتنا کچھ۔ جس قدر پشت گرمی تاب و تواں نہیں: گرمی تاب و تواں برداشت نہیں کرسکتا۔ مطرب: گانے والا۔ ھل من مزید: کیا میرے لیے کچھ اور بھی خوراک ہے۔ زمزمہ: راگ، گیت، ترانہ، الامان: خدا امن میں رکھے۔ لب پردہ سنجِ زمزمہ الامان نہیں، یعنی لب سے الامان کی آواز نہیں نکلتی۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ قہر و عتاب سے جان گھلی جاتی ہے اور مجھ میں برداشت کی طاقت نہیں رہی، لیکن تب بھی میں اس کے قہر سے الامان نہیں پکارتا۔ بلکہ میری جان خوشی سے برابر یہی کہہ رہی ہے کہ اگر کوئی اور ظلم باقی رہ گیا ہو تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔

شعر۔۷ دونیم: دو ٹکڑے، نصف نصف۔ مطب صاف ہے۔

شعر۔۸ آزر فشاں: آتش فشاں، آگ برسانے والا۔ آزر برق کو بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر دل آتش کدہ نہ ہو تو وہ سینہ کے واسطے باعث ننگ و عار ہے، اسی طرح اگر نفس (نالہ) آتش فشاں نہ ہو تو دل کے واسطے باعث شرم ہے۔

شعر۔۹ گراں: مہنگا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میرے جنوں سے گھر خراب ہوتا ہے تو ہونے دو کیونکہ اس میں زیادہ سے زیادہ سو گز زمین ہوگی۔ مگر ہم کو اس کے بدلے ایک بیابان (یعنی جنگل جو کہ مقتضائے جنوں ہے) مل جاوے گا، پس یہ سودا بہت سستا ہے۔ اس میں کچھ نقصان نہیں۔ اگر گھر خراب ہوتا ہے تو ہماری بلا ہے۔

شعر۔۱۰ سرنوشت: تقدیر۔ جبیں: پیشانی۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو پوچھتے ہو کہ میری تقدیر میں کیا لکھا ہے تو کیا میری پیشانی پر سجدۂ بت کا نشان نہیں دیکھتے یعنی اس سے ظاہر ہے کہ بتوں کی آستاں سائی میری قسمت میں لکھی ہے۔

شعر۔۱۱ "یہاں ہم زبان کے لفظ میں ایہام ہے۔ ظاہراً معنی تو یہ ہیں کہ انسان اور فرشتہ کی زبان ایک نہیں ہوسکتی، اور در پردہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے، ویسی روح القدس (حضرت جبرئیل علیہ السلام) کی نہیں۔" (یادگار غالب)

شعر۔۱۲ یعنی اس کے ایک بوسہ کی قیمت ایک جان ہے، لیکن چونکہ وہ جانتا ہے کہ غالب ابھی نیم جان نہیں، (یعنی ابھی بالکل زندہ ہے) اس لیے وہ جان کے بالعوض بوسہ نہیں دیتا (لیکن ہاں) اس وقت نیم جان ہو جاؤں گا جب کہے گا کہ جان کے بدلے بوسہ لے لو۔

مانعِ دشت نوردی کوئی، تدبیر نہیں   اک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں   جادہ، غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے   جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں
رنج نومیدیِ جاوید! گوارا رہیو!   خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں
سر کھجاتا ہے، جہاں زخمِ سر اچھا ہوجائے   لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں
جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے   کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں
غالبؔ! اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

شعر۔۱ ''چکر: پھرنے کی دھت۔ کہتے ہیں کہ اس کے پاؤں میں چکر ہے یعنی اس کو پھرنے کی دھت ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی تدبیر مجھے دشت نوردی سے روک نہیں سکتی۔ پس زنجیر جو اس غرض سے میرے پاؤں میں ڈالی گئی ہے اسے زنجیر نہ سمجھو۔ بلکہ چکر سمجھو۔'' (یادگارِ غالب)

شعر۔۲ جادہ: راستہ، بٹیا۔ غیر از نگہِ تصویر: حیرت کے سوا، معدوم۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ کو شوق جنوں ایسے جنگل کی طرف لیے جاتا ہے کہ جہاں سوائے نگاہ دیدۂ تصویر کے کوئی راستہ نہیں یعنی جہاں راستہ بالکل معدوم ہے، یا جہاں سوائے جادۂ حیرت کے اور کوئی راستہ نہیں۔

ڈاکٹر مرحوم لکھتے ہیں کہ ''دشتِ وفا میں عشق کی تگ و دو کا انجام موت ہے۔ اس بحرِ سراب کا کوئی ساحل نہیں۔ کوئی جادہ نہیں جس سے مسافر صحرا سے جان سلامت لے جا سکے۔ راہ کے عدم کو مرزا کمال شاعری سے یوں بیان کرتے ہیں کہ صرف ایک راستہ ہے۔ اور وہ نگہ دیدۂ تصویر ہے یعنی کوئی راستہ نہیں۔ کیا خوب عدم کو وجود کے لباس میں جلوہ گر کیا ہے۔

شعر۔۳ جادہ، یعنی بٹیا کو دمِ شمشیر سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب شاعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار و تکلیف میں جو لذت ہے، جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذت سے دل کھول کر متمتع ہوں، مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے اس لیے پہلے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے، پس افسوس ہے کہ لذت آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے۔

شعر۔۴ زبونی: عاجزی، برائی۔ مطلب یہ ہے مجھ کو ہمیشہ کے واسطے ناامیدی و مایوسی کا رنج گوارا کرنا بھلا معلوم ہوتا ہے، بہ نسبت اس کے کہ میرا نالہ تاثیر کے سامنے عاجز ہو۔ (یعنی میرا نالہ تاثیر کا احسان اٹھانے کی ذلت پسند کرے) یعنی بالفاظ دیگر رنج و ناامیدی اٹھانا منظور ہے لیکن یہ

منظور نہیں کہ (نالہ موثر ہونے کی وجہ سے) تاثیر کا احسان اٹھانے کی ذلت برداشت کروں۔ ایک شعر پہلے بھی گزر چکا ہے۔

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا   میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

شعر۔۵ جہاں: جس وقت۔ لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں: پتھر میں (زخم پتھر کھانے سے) مجھ کو ایسی لذت اور مزہ حاصل ہوتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت زخمِ سر اچھا ہو جاتا ہے تو وہ پھر کھجانے لگتا ہے، یعنی زخم پتھر کی پھر خواہش ہونے لگتی ہے (سر کھجانا ایک محاورہ ہے جس کے معنی پٹنے کی خواہش کرنے کے ہیں) کیونکہ پتھروں کی چوٹ میں مجھے ایسا لطف حاصل ہوتا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

شعر۔۶ تقصیرِ اول بمعنی گناہ۔ اور تقصیرِ دوم بمعنی کوتاہی۔ خجلت تقصیر: شرمندگیِ گناہ، گناہ کرنے میں جھجکنا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یار از راہ کرم بیباکی و گستاخی کی اجازت دے دے، تو اس وقت گناہ کرنے میں جھجکنا سب سے بڑا قصور (گناہ) ہے۔

شعر۔۷ بے بہرہ: بدنصیب۔ مطلب صاف ہے۔

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

شعر۔۱ مردمک: پتلی۔ سویدا: دل میں آنکھ کے تل کے مانند ایک سیاہ داغ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری آنکھ کے تل میں یہ نگاہیں نہیں ہیں، بلکہ یہ سمجھو کہ آنکھ کے دل کے سویدا میں آہیں جمع ہیں۔

برشکالِ گریۂ عاشق ہے، دیکھا چاہیے   کھِل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن
اُلفتِ گل سے غلط ہے دعویِ وارستگی
سرو ہے باوصفِ آزادیِ گرفتارِ چمن

شعر۔۱ برشگال: برسات۔ کھِل گئی: پھٹ گئی۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کے رونے سے جو آنسو بہے ہیں، ان کا پانی اس کثرت سے بہ رہا ہے کہ برسات کا زمانہ معلوم ہوتا ہے اور دیوارِ چمن، گل

(مٹی) کی مانند سو جگہ سے پھٹ گئی ہے، جیسا کہ برسات میں اکثر ہوا کرتا ہے کہ مکانات کے مکانات پھٹ جاتے ہیں۔ دوسرا مصرعہ ثبوت میں پیش کیا ہے۔

شعر۔۲ آزادی: سرو کو آزاد کہا جاتا ہے "مطلب یہ ہے کہ کوئی کیسا ہی آزاد و وارستہ مزاج ہو، دنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا۔" (یادگارِ غالب)

عشق تاثیر سے نومید نہیں   جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے   جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلی تری سامانِ وجود   ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رُسوا ہوجائے   ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگ طرب سے ڈر ہے   غمِ محرومیِ جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

شعر۔۱ مطلب یہ ہے کہ عشق کا ضرور اثر ہوتا ہے۔ عشق کی راہ میں جان سونپنا بید کا درخت نہیں ہے کہ جس میں کوئی پھل ہی نہیں آتا، یعنی بالفاظ دیگر نہالِ عشق ایک بار آور ہے، شجر بید کی مانند بے ثمر نہیں۔

شعر۔۲ یعنی سلطنت ایک سے دوسرے کو واسطہ بواسطہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جام جمشید یا خاتم جم نہیں کہ صرف ایک شخص کے واسطے ہو اور اسی کی ذات پر ختم ہوجائے۔ اکثر شارحین نے سلطنت اور جام مے کو مرادف مان کر معنی لکھے ہیں، لیکن اس سے حقیقت میں کوئی معنی پیدا نہیں ہوتے۔

شعر۔۳ یعنی جس طرح سے بغیر پرتو آفتاب ذرہ کی جلوہ گری ممکن نہیں، اسی طرح بغیر تیری تجلی کے کائنات کا ظہور میں آنا محال ہے۔ تیری جلوہ گری ہی وجود عالم کا باعث ہے۔ مرزا آگے چل کر بھی کہتے ہیں:

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے   پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

حسرت صاحب اس کے یہ معنی لکھتے ہیں "جس طریقہ سے ذرے میں پرتو خورشید نظر آتا

ہے، اسی طرح تمام موجوداتِ عالم تیری ذات کے مظہر ہیں۔"

شعر۔۴ شاعر کہتا ہے کہ میرے مرنے میں کوئی برائی نہیں۔ صرف یہ خیال ہے کہ ایسا نہ ہو کہ مرنے سے معشوق کا راز رسوا ہوجاوے۔ راز اور بھید میں رعایت لفظی ہے۔

شعر۔۵ رنگ طرب ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ کوئی شخص ہمیشہ خوشحال نہیں رہتا۔ زمانہ خوشی کے بعد خوشی کا زوال ہوتا ہے اور پھر مصیبت کا زمانہ آجاتا ہے جو نہایت تکلیف کا باعث ہوتا ہے، بس میں اس خیال سے اس چند روزہ خوشی سے محرومیِ جاوید بہتر سمجھتا ہوں کیونکہ اس صورت میں تو تکلیف سے عادی ہوجانے کی وجہ سے زیادہ تکلیف نہیں ہوگی، لیکن اُس حالت میں خوشی کا احساس ہونے کی وجہ سے تکلیف اور بھی زیادہ بڑھ جائے گی۔

یا یہ کہ رنگ طرب کی تبدیلیاں دیکھ کر مجھ کو یہ ڈر ہے کہ محرومی بھی ہمیشہ نہ رہ سکے گی، اس لیے ڈرتا ہوں کہ محرومیِ جاوید کا جو غم میں حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ حاصل نہ ہوا۔

شعر۔۶ مطلب صاف ہے۔

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں   خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں
دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے   سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم   قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشہ کہ اے محوِ آئینہ داری   تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے   کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

شعر۔۱ خیاباں: چمن کی کیاری۔ خیاباں خیاباں کثرت کے واسطے لایا گیا ہے۔ ارم: یعنی باغ ارم جس کو ایک کافر بادشاہ شداد نے بنوایا تھا۔ اس بادشاہ نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ اس زمانہ کے پیغمبر نے نصیحت کی، اور کہا کہ اگر تو راہ حق پر آجائے تو تجھے بہشت ملے گی۔ پھر بہشت کی کیفیت بیان کی۔ اس نے کہا کہ ایسی بہشت تو میں خود بنوا سکتا ہوں۔ چنانچہ مقام ارم میں ایک باغ بنوایا۔

جواہرات سے مرصع محل تیار کرائے۔ اس میں حسین عورتیں حوروں کی جگہ اور حسین لڑکے خادم و غلمان کی جگہ رکھے۔ باغ تیار ہو چکا تو خود گھوڑے پر سوار ہو کر باغ کے دروازے پر پہنچا۔ رکاب سے پانو زمین پر رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ ملک الموت نے اس کی روح قبض کر لی۔ کہتے ہیں کہ اس کے مرنے کے بعد یہ باغ زمین سے اٹھا لیا گیا، اور بہشت اور دوزخ کے درمیان رکھ دیا گیا۔ اب اسی کو اعراف کہتے ہیں۔

مطلب صرف یہ ہے کہ تیرا نقش قدم نہیں ہے، بلکہ گویا ایک خیابانِ ارم ہے۔

شعر۔۲ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ تیرے خال دہن پر فریفتہ ہیں وہ گویا اپنے سویدائے دل میں عدم کی سیر کر رہے ہیں۔ کیونکہ سویدا، خال (دہن معشوق) سے مشابہ ہے۔ اور دہنِ معشوق، عدم کہا جاتا ہے۔

شعر۔۳ ''اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ تیرے سرو قامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے اور دوسرے یہ معنی ہیں کہ تیرا قد اسی میں سے بنایا گیا ہے، اس لیے وہ (فتنۂ قیامت) ایک قد آدم کم ہو گیا۔''
(یادگار غالب)

شعر۔۴ تماشہ کر یعنی تماشہ کن بمعنی دیکھ۔ مطلب یہ ہے کہ اے محبوب تو جو آئینہ میں اپنا جمال دیکھنے میں محو ہے، ذرا میری طرف تو دیکھ کہ میں تجھ کو کس تمنا و حسرت سے دیکھ رہا ہوں۔

شعر۔۵ سراغ: کھوج۔ تف نالہ: نالہ کی گرمی۔ شب رو: رات کے چلنے والے یعنی مسافرِ شب۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے کہ صبح کو مسافر شب کا اس کے قدم (پسماندہ) دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے، اسی طریقہ سے میرے داغ دل سے نالہ شب کی گرمی کا پتہ چل جائے گا۔

شعر۔۶ اہل کرم: سخی لوگ۔ مطلب صاف ہے۔

ملتی ہے خوے یار سے نار، التہاب میں   کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں   شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر   آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے، خط اک اور لکھ رکھوں   میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام   ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
جو منکرِ وفا ہو، فریب اس پہ کیا چلے   کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں
میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے   ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں
میں، اور حظِّ وصل، خدا ساز بات ہے   جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے   ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چُرانا نگاہ کا   لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ، دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے   جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مدّعا طلبی میں نہ کام آئے   جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں
غالبؔ! چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

شعر۔۱ التہاب: شعلہ۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب نار میں مجھ کو کیونکر لذت نہ آئے، اس لیے کہ اس کا کام بھی تو محبوب کی عادت کی طرح جلانا ہے۔ آتش مرحوم بھی اس خیال کو اس طرح باندھتے ہیں:

آسماں شوق سے تلواروں کا مینہ برساوے   ماہ نو نے کیا ابرو کا ترے خم پیدا

شعر۔۲ جہاں خراب: دنیا: شب ہجر کی لنبائی ضرب المثل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر شبہائے ہجر بھی میں حساب میں شامل کروں تو پھر میری عمر کے زمانہ کی لنبائی اندازہ سے بھی باہر ہو جاوے گی۔

اسی مضمون کو ایک فارسی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے:

خضر عمر فزون است عشق بازاں را   اگر زعمر شمارند روز ہجراں را

امیر خسرو کا بھی ایک شعر ہے

زہے عمر درازِ عاشقاں گر   شبِ ہجراں حسابِ عمر گیرند

شعر۔۳ یعنی معشوق کیسا ظالم ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ مجھ کو خواب میں بھی اس کا دیدار نصیب ہو، اس لیے وہ ایک روز خواب میں آ کر آنے کا وعدہ کر گیا تا کہ پھر اسی انتظار میں مجھ کو کبھی نیند نہ آئے۔ نہ نیند آئے گی اور نہ پھر کبھی خواب میں جلوہ نصیب ہو گا۔

شعر۔۴ ''دوسرے مصرعہ میں بطور طنز کے کہتا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے، مجھے معلوم

ہے یعنی وہ کچھ نہیں لکھنے کے۔ اس لیے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں۔"

(یادگار غالب)

شعر۔۵ "اس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے۔ "پھر آج جو خلاف عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے۔" اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔ ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ حذف کیے گئے ہیں، وہ بغیر ذکر کیے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں، محسناتِ شعر میں شمار کیا جاتا ہے۔" (یادگار غالب)

شعر۔۶ منکر وفا: جو وفا سے انکار کرتا ہو۔ جس کو کسی کی وفا پر اعتبار نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جب کہ معشوق کو کسی کی وفا کا یقین ہی نہیں ہوتا (یعنی سب کو جھوٹا سمجھتا ہے) تو پھر اس سے رقیب کے بارے میں بدگمان نہیں ہونا چاہیے کہ اس (معشوق) پر کسی کی وفاداری کا فریب چل گیا ہو۔ اسی قسم کا ایک شعر پہلے بھی آ چکا ہے۔

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف   عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

شعر۔۷ شاعر اپنے معشوق سے خطاب کرتا ہے کہ میں جو وصل میں مضطرب اور پریشان ہوں اس کی وجہ رقیب کا خوف ہے (کہ کبھی وہ نہ آ جائے) تمھارا یہ وہم کہ میں کسی دوسرے معشوق کے خیال سے بے چین ہوں، غلط ہے۔

شعر۔۸ یعنی مجھ جیسے ناچیز کو حظ (سرور) وصل نصیب ہونا ایک تقدیری امر ہے (ورنہ میں اس قابل کہاں تھا) افسوس کہ مجھ کو وصل کی بے چینی میں محبوب کو جان نذر کرنی بھی یاد نہ رہی۔

شعر۔۹ یعنی نقاب میں جو ایک جگہ شکن پڑی ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نقاب کے اندر تمھاری تیوری چڑھی ہوئی ہے، یعنی تم کچھ خفا ہو۔

شعر۔۱۰ لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اس کا التفات اور میلان طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف اور ایک نگاہ کا چرانا ایک طرف اور اس کے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور ایک عتاب میں بگڑنا ایک طرف ہے۔ "یہ شعر بھی سہل اور ممتنع ہے۔ اگر الفاظ کو دیکھیے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے دو ہم پلہ مصرعے بہم پہنچ گئے جن میں حسن و ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور اگر معنی پر نظر کیجیے تو ہر ایک

مصرعہ میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گزرتا رہتا ہے۔ معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لیے بہت بڑی چیز ہے۔ اگر اس کا آنکھ چرانا، جو لگاوٹ کی ضد ہے وہ عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے بہت زیادہ دلفریب و دل آویز ہوتا ہے۔ اس طرح بناؤ سنگار سے معشوق کا حسن بیشک دوبالا ہو جاتا ہے مگر اس کا غصہ میں بگڑنا، اس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوشنما اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں جو ہم لکھ رہے ہیں۔ اس کی اصل خوبی وجدانی ہے جس کو صاحب ذوق کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔"

"ایک روز مولانا آزاد مرحوم کے روبرو کسی نے یہ شعر پڑھا۔ چونکہ مولانا نہایت صاف اور سریع الفہم اشعار پسند کرتے تھے، اس لیے مرزا کا کلام سن کر اکثر الجھتے تھے اور ان کی طرز کو ہمیشہ نام رکھتے تھے مگر اس روز اس شعر کو سن کر وجد کرنے لگے اور متعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے؟ کہا گیا کہ مرزا غالب کا۔ چونکہ وہ مرزا کے شعر کی کبھی تعریف نہیں کرتے تھے اور اس روز لاعلمی میں بے ساختہ ان کے منہ سے تعریف نکل گئی تھی، غالب کا نام سن کر بطور مزاح کے، جیسی کہ ان کی عادت تھی فرمایا "اس میں مرزا کی کیا تعریف ہے یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے مگر فی الحقیقت یہ شعر بھی معناً اور لفظاً ویسا ہی اچھوتا اور نرالا ہے جیسا کہ مرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا۔ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے یہ اسلوب بیان آج تک اس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔" (یادگار غالب)

شعر۔۱۱ تعجب ہے کہ میرے نالہ سے کہ جس کی تاثیر سے آفتاب تک میں شگاف آ جاتا ہے، معشوق کے دل پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔

شعر۔۱۲ یعنی تعجب ہے کہ ہمارا مدعا و مطلب اس جادو کے ذریعہ سے بھی حاصل نہ ہوا جس کے اثر سے سراب تک میں کشتیاں چلنے لگتی ہیں۔

شعر۔۱۳ روز ابر: جس دن ابر چھایا ہو۔ شب ماہتاب: چاندانی رات۔ مطلب یہ ہے کہ گو شراب پینی چھوڑ دی ہے لیکن ابر اور چاندنی رات کو طبیعت نہیں مانتی، اس لیے ان دنوں میں کبھی کبھی پی لیا کرتا ہوں۔

کل کے لیے، کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل، کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں
اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب! ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

شعر۔۱ ساقی کوثر: آنحضرت ﷺ۔ کوثر: حوضِ بہشت۔ مطلب یہ ہے کہ اے ساقی تو کل قیامت کے خیال سے شراب پلانے میں آج خسّت (کنجوسی) نہ کر، کیونکہ ایسا کرنا ساقیِ کوثر کی شان میں گستاخی کرنا ہے۔ بھلا یہ ان کے کب شایانِ شان ہے کہ اگر تو آج شراب زیادہ پلا دے گا تو وہ اس کو کل منہا کر لیں گے۔

شعر۔۲ ''اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اس کو گوارا نہ ہوتی۔ اور یا اب ہم کو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدمؑ اور فرشتوں کے اس قصہ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب خدائے تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا ''کیا تو دنیا میں اس شخص یعنی اس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے؟'' وہاں سے ارشاد ہوا کہ تم نہیں جانتے، جو کچھ میں جانتا ہوں اور پھر آدم سے ان کو زک دلوائی اور حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کریں۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں کہ کل تک تو

ہماری ایسی عزت تھی۔'' (یادگارِ غالب)

حافظ کا بھی ایک شعر ہے:

من کہ ملول گشتم از نفسِ فرشتگاں
قال و مقال عالمے میکشم از برائے تو

شعر۔۳ سماع، سننا۔ اصطلاحاً صوفیائے کرام میں معرفت الٰہی کے اشعار سننے کو جو خوش آوازی سے گائے جاتے ہیں، کہتے ہیں، اس شعر میں استفہام سے صرف تعجب مقصود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر چنگ و رباب (دونوں باجوں کے نام ہیں) میں خدا کی صدا سمائی ہوئی ہے تو پھر اس کے سننے سے سامعین کی جان کیوں فنا ہو جاتی ہے کیونکہ اس کی صدا تو جاں بخش ہے۔ اس شعر میں اس لطف کو جو اہلِ ذوق کو سماع سے حاصل ہوتا ہے، قلم بند کیا ہے۔

شعر۔۴ رخش: گھوڑا۔ ''اس شعر میں انسان کی مجبوری کی طرف اشارہ ہے۔ سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اس کے قابو سے باہر ہو جانا۔ چابک سواروں کی زبان میں اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا۔ اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینا، حسن تشبیہ کا حق ادا کر دینا ہے۔'' (یادگارِ غالب)

شعر۔۵ بُعد: دوری۔ غیر: ماسوائے خدا۔ مطلب یہ ہے کہ جتنا میں ماسوائے خدا کے وہم سے پیچ و تاب میں رہتا ہوں، اتنا ہی میں اپنے آپ کو حقیقت سے دور پاتا ہوں۔

شعر۔۶ شہود: حاضر ہونا، اور جمع ہے شاہد کی۔ شاہد: محبوب، حاضر۔ حاضر کرنے والا، مشہور: حاضر کیا گیا، موجود۔ ''مطلب یہ ہے کہ مشاہدہ، شاہد و مشہود کے وجود کو علاحدہ علاحدہ چاہتا ہے اور یہاں جب تمام عالم بوجودِ واحد موجود ہے تو شاہد و مشہود ایک ہی ہوئے، یعنی جب شاہد و مشہود میں مغائرت نہیں تو پھر مشاہدہ کس طرح ہو سکتا ہے۔'' (نظامی)

شعر۔۷ مشتمل: شامل ہونے والا، محیط ہونے والا۔ وحدتِ وجود اور کثرت موہوم کی تمثیل ہے۔ قطرہ و موج و حباب کے ہیچ و ناچیز ہونے کو ایک عام محاورے میں اس طرح ادا کرنا کہ کیا ''دھرا ہے'' منتہائے بلاغت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قطرہ و موج و حباب بذاتہ کوئی چیز نہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ یہ مختلف صورتیں ہیں جو وجودِ بحر کا پتہ دیتی ہیں۔

جناب مولوی محمد مہدی صاحب لکھتے ہیں: ''مسئلہ وحدت وجود شاعری میں بہت مقبول ہے کہ ایک وجود باری تعالیٰ کے سوا کچھ ہستی موجود نہیں۔ یا ایک دریائے وحدت ہے، وہی کثرت

میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس کے دو اجزاء ہیں۔ ایک یہ کہ کثرت جو نظر آتی ہے وہ محض اعتباری اور وہم وخیال ہے۔ دوسرا جزیہ ہے کہ دریا ہی دریا ہے۔ موج وحباب کچھ نہیں۔ دیوان غالب میں مرزا صاحب نے اس مضمون کو متعدد اشعار میں مختلف پہلوؤں سے باندھا ہے۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ دریا کا وجود چونکہ مختلف صورتوں کی نمود پر مشتمل ہے، اس لیے خود ان صورتوں یعنی ممکنات کی کوئی ہستی نہیں۔"

مولانا آسی نے اس شعر کا مطلب اس طرح بیان فرمایا ہے کہ "قطرہ اور موج اور حباب کی کوئی ہستی نہیں بلکہ یہ سب صورتیں دریا کی بدولت نظر آ رہی ہیں اور ان صورتوں کے ظاہر ہونے سے بحر کا پتہ چلتا ہے، یعنی ہستی موجودات وجود واجب کے ضمن میں ہے۔ باقی کچھ نہیں ہے۔"

شعر۔۸ مطلب یہ ہے کہ شرم ایک ادائے ناز ہے۔ اس کا اقتضا تو یہ ہے کہ خود اپنی ذات سے بھی حیا کریں۔ لیکن ان کے پردے میں رہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس میں آزاد رہیں، اس لیے ان کا اس طرح پردے میں رہنا (کہ وہ خود اپنے آپ سے نہیں شرماتے) بے حجابی (بے شرمی) ہے۔ دوسرے معنی اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کا حجاب کرنا ہی ایک قسم کی بے حجابی ہے۔ کیونکہ حجاب کرنے سے ان کا مقصود یہ تھا کہ کوئی ان کی ادا نہ دیکھے لیکن مجھ سے اس طرح چھپ جانا ہی ایک ادا ہے۔ پس ایسے حجاب سے ضرور بے حجابی ہوتی ہے۔

حسرت صاحب نے مطلب ثانی کو اس طرح ایک شعر میں قلم بند کیا ہے:

وہ چاہتے تھے کہ نہ دیکھے کوئی ادا میری   چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی

شعر۔۹ شاعر کہتا ہے کہ گو اس کے محبوب نے ہمیشہ کے لیے پردہ نشینی اختیار کر لی ہے لیکن تب بھی بناؤ سنگار کے واسطے ہمیشہ آئینہ سامنے رکھا رہتا ہے اور وہ اپنے جمال کی آرائش کرنے میں مصروف رہتا ہے۔

شعر۔۱۰ "سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے، اس کو شہود کہتے ہیں۔ اور غیب الغیب سے مراد مرتبہ احدیت ذات ہے، جو عقل وادراک وبصر وبصیرت سے وراء الوراء ہے۔ کہتا ہے کہ جس کو ہم مشہود سمجھے ہوئے ہیں، وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور اس کو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں۔ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس مضمون کے لیے مثال نہیں ہو سکتی۔" (یادگار غالب)

شعر۔۱۱ بوتراب: کنیت حضرت علیؑ کی۔ اس شعر میں دوست سے خدا اور ندیم دوست سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت علیؑ چونکہ خدا عزوجل کے ندیم ہیں (اور دوست کے ہم نشین سے دوست کی بو آتی ہے) اس لیے ان کی بندگی کرنا درحقیقت خدا کی بندگی کرنا ہے۔ ناسخ نے بھی اس مضمون کا ایک شعر لکھا ہے۔

بیعت خدا سے ہے مجھے بے واسطہ نصیب   دستِ خدا ہے نام میرے دستگیر کا

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں   مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں   ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار   اے کاش! جانتا نہ تری رہگزر کو میں
ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے   کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بے ننگ ونام ہے"   یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ   پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار   کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں
پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوے یار   جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا   سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

غالبؔ! خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

شعر۔۱ نوحہ گر: نوحہ پڑھنے والا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دل وجگر دونوں کا خون ہو گیا ہے۔ سخت حیران ہوں کہ کیا کروں۔ آخر میں تن تنہا کس کس کو روؤں۔ اتنا مقدور نہیں رکھتا جو کسی نوحہ گر کو اس غرض کی ادائیگی کے واسطے اپنے ساتھ رکھ لوں۔

شعر۔۲ پھر کثرت رشک کا اظہار کیا ہے کہ مجھ کو خود اپنی زبان پر رشک آتا ہے، اس لیے معشوق

کے گھر کا نام تک نہیں لیتا بلکہ ہر ایک سے یہی پوچھتا پھرتا ہوں کہ کدھر جاؤں؟ اسی طرح مرزا آگے چل کر بھی لکھتے ہیں:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے   میں اسے دیکھوں بھلا، کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

علاوہ ازیں ایک اور شعر میں بر بنائے رشک خود بھی وصل معشوق کی تمنا نہیں کرتے:

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے   مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

شعر۔۳ یعنی مجھ کو جو یہ معلوم ہوا کہ تو رقیب کے یہاں پڑا رہتا ہے تو مجھ کو تیرے شوق یا تیری تلاش میں سینکڑوں مرتبہ رقیب کے گھر جانے کی ذلت اٹھانی پڑی۔ کاش ایسا ہوتا کہ مجھ کو تیری اس آمد ورفت کی خبر ہی نہ ہوتی اور اس طرح میں اس ذلت سے بچ جاتا۔

شعر۔۴ کمر باندھنا: کسی کام کرنے کے لیے مستعدی ظاہر کرنا۔ شعراء کے نزدیک معشوق کے کمر بالکل نہیں ہوتی۔ بس شاعر اپنے معشوق سے کہتا ہے کہ تم جو میرے قتل کرنے کے لیے کمر کسنے کی گھڑکی دیتے ہو، تو میں تمھاری اس دھمکی میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ جو کچھ کہ تمھاری کمر ہے، مجھ کو خوب خبر ہے۔ (یعنی تمھاری کمر ہے ہی نہیں باندھنا کیسا؟)

شعر۔۵ یعنی معشوق کی خاطر گھر کو لٹایا، لیکن گھر لٹانے پر وہ یہ کہتے ہیں کہ میں بے ننگ و نام ہوں۔ اگر مجھ کو پہلے سے یہ خبر ہوتی تو میں کاہے کو اپنے آپ کو اس طرح برباد کرتا۔

شعر۔۶ ”طالب راہ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے، اس کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اول اول جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد وسماع و جوش وخروش دیکھتا ہے، اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے بڑھ کر نظر آتا ہے تو اس کا تعقب کرتا ہے۔ وھکم جرا۔ اور وجہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی تو ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا۔“ (یادگار غالب)

شعر۔۷ یعنی میں اس بت بیداد گر کی پرستش نہیں کرتا، بلکہ ایسا کرنے والے احمق لوگ ہیں جو خواہشِ نفسانی کے غلام بن کر اس کی (معشوق بیداد گر کی) پرستش کرتے ہیں، یا یہ کہ میرا تعلق میرے معشوق کے ساتھ ایک عشق صادق جیسا ہے۔ جو لوگ میرے اس عشق اور رغبت کو پرستش کے نام سے موسوم کرتے ہیں، وہ بالکل احمق ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں اس بت بیداد گر کو

پوجوں، بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

شعر۔۸ اس لیے کہ اگر اپنے کھوئے جانے کا احتمال ہے، تو صرف معشوق کے یہاں۔

شعر۔۹ مطلب یہ ہے کہ میں چونکہ بذات خود ہنرور کی بہت قدر کرتا ہوں، اس لیے میں (اپنی غلط فہمی سے) یہ خیال کرتا ہوں کہ متاع ہنر دلپذیر ہے، یعنی تمام دنیا ہنرمند کی قدر کرتی ہے، لیکن میرا یہ خیال غلط ہے۔ دنیا میں ہنرمند کے دوست بہت ہی کم پائے جاتے ہیں۔

شعر۔۱۰ سمند ناز: وہ سمند جو کہ ناز سے چلے۔ مطلب صاف ہے۔

ذکر میرا، بہ بدی بھی اسے منظور نہیں   غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
وعدۂ سیر گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق   مژدۂ قتل مقدّر ہے جو مذکور نہیں
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم   لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن   ہم کو تقلید تنک ظرفیِ منصور نہیں
حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی   عشقِ پُر عَربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمھیں   کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ”ہم حور نہیں“
ظلم کر ظلم، اگر لطف دریغ آتا ہو   تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
صاف دردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ   وائے! وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں
ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ ”مشہور نہیں“

شعر۔۱ یعنی معشوق کو مجھ سے ایسی نفرت ہے کہ وہ میرا ذکر بہ بدی بھی سننا گوارا نہیں کرتا، لیکن میرا رقیب اکثر اس کے سامنے میری بُرائی کیا کرتا ہے، تو کیا عجب ہے کہ اس بنا پر رقیب اور معشوق کے درمیان بگاڑ ہو جائے۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

دشمنی نے میری کھویا غیر کو   کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

شعر۔۲ مقدر: چھپا ہوا۔ شاعر کہتا ہے کہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہے کہ اس نے میرے ساتھ سیر گلستاں (تماشائے لالہ وگل) کا وعدہ کیا ہے۔

بھلا ہمارے ایسے نصیب کہاں تھے کہ وہ ہمارے ساتھ سیر گلستاں کرتا۔ ضرور اس میں مژدۂ قتل پوشیدہ ہے، یعنی سیر گلستاں سے مراد اس کی یہ ہے کہ وہ میرا خون بہائے جو مثل لالہ وگل کے ہے۔

شعر۔۳ ''شاعر نے دنیا کے موہوم ہونے کو بہ غلو بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ عالم شاہدِ ہستی مطلق کی کمر ہے۔ اور اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ جس طرح شاہد کی کمر نہیں ہوتی، اسی طرح وجود عالم بھی موہوم ہے لیکن ہم کو یہ بھی منظور نہیں ہے کیونکہ جب کہتے ہیں کہ عالم شاہدِ ہستی مطلق کی کمر ہے تو گرچہ اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ عالم معدوم ہے لیکن ہے (جو لفظ اثبات ہے) کا لفظ ایک شے معدوم کے لیے کسی طرح استعمال کرنا نہیں چاہیے۔'' (حسرت)

شعر۔۴ مطلب یہ ہے کہ اگر سچ پوچھو تو ہماری ہستی بھی ایک قطرہ ہے جو کہ درحقیقت دریا ہی (کہلانے کا مستحق) ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ جس طرح منصور نے تنگ ظرفی کی اور انا الحق کہا، ہمارا قطرۂ ہستی بھی انا البحر کہنے لگے:

نہ چشم کم سے دیکھ اے ابر اشکِ چشم کو مرے یہ قطرہ قابلیت اس کی رکھتا ہے کہ دریا ہو

مولوی محمد مہدی صاحب نے اس شعر کے معنی توضیح سے بیان فرمائے ہیں۔ لکھتے ہیں ''جو لوگ توحید وجودی کے قائل ہیں ان کا یہ مذہب ہے کہ اگرچہ موج وحباب دریا سے علاحدہ علاحدہ نہیں ہیں لیکن ان کا ایک تشخص اور تعین جداگانہ ہے۔ اس لیے جب تک یہ تشخص و تعین قائم ہے اس وقت تک دعوائے عینیت کرنا تنگ ظرفی ہے۔ اس لیے شاعر کہتا ہے کہ ہم بھی دریائے وحدت میں شامل ہیں۔ اس لیے عین دریا ہیں لیکن جو تنگ ظرفی کہ منصور نے انا الحق کا نعرہ لگایا اس کی تقلید ہمیں پسند نہیں ہے۔''

شعر۔۵ عشق پُرعربدہ: عشق جنگ جو۔ گوں: قابل، طرح۔ شاعر اپنی زائل شدہ طاقت پر اظہار افسوس کرتا ہے، اور حسرت کرتا ہے کہ حسرتا مجھ میں اب اتنی طاقت نہیں رہی کہ میں عشق جیسے جنگ جو دشمن کا مقابلہ کر سکوں۔

شعر۔۶ مطلب یہ ہے کہ اگر تجھ کو میرے اوپر رحم کرنے سے دریغ ہے تو ظلم ہی کر۔ کیونکہ یہ (ظلم) بھی تغافل کی، جو کہ تیرا شعار ہے ایک ادا ہے اور تو تغافل کی ہر ایک ادا پر قادر ہے۔

مولوی محمد مہدی صاحب لکھتے ہیں۔ ''نہایت نازک مضمون ہے۔ کہتے ہیں کہ تو اپنے تغافل اور بے پروائی میں کسی شیوہ سے معذور نہیں ہے، چاہے تو اس تغافل کے عالم میں لطف بھی کر سکتا ہے اور ستم بھی لیکن اگر تجھ کو لطف و مہربانی میں دریغ آتا ہو تو ظلم ہی کر، یعنی تغافل محض نہ ہو۔''

شعر۔۷ رعونت: غرور، نادانی، سرکشی، خود آرائی۔ اس شعر میں خداوند تعالیٰ کے اس وعدے کی طرف اشارہ ہے کہ نیک بندوں کو ان کی خدمت کے واسطے بہشت میں حوریں ملیں گی۔ مطلب یہ ہے کہ میں اس سے یہ کہتا ہوں کہ میں قیامت کے روز تمھیں لے لوں گا تو وہ کیسی رعونت سے کہتے ہیں کہ ہم حور تھوڑا ہی ہیں جو تم ہم کو قیامت میں لے سکو گے:

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام قدرت حق سے اگر حوریں یہی واں ہو گئیں

شعر۔۸ دردی: تلچھٹ، گاد۔ صاف اور دردی میں رعایت لفظی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ صاف طور سے جام جمشید کی تلچھٹ پینے والے ہیں یعنی انگور ہی کی شراب پیتے ہیں۔ پس ہم کو اس شراب کے ساتھ نہایت ہمدردی ہے جو کہ انگور کی نہ ہو۔ (اس لیے اگر ہم اس کو پیتے تو اس کی عزت بڑھ جاتی)۔

شعر۔۹ خفائی۔ مخفی ہونا۔ ظہوری: ظاہر ہونا۔ ان دونوں میں تضاد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا مشہور نہ ہونا اس بات پر دلیل ہے کہ میں خفائی ہوں اور ظہور و خفا میں تقابل ہے، تو میں ظہوری کا مد مقابل ہوا۔'' (طباطبائی) مرزا شعرائے ایران میں ظہوری کو خاص طور سے پسند کرتے تھے اور اس کی تقلید کا دم بھرتے تھے اس لیے اس شعر میں اپنے آپ کو اس کا مد مقابل قرار دیا۔ بقول شاعر:

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا بلبل ہمی کہ قافیہ گل بود بس است

ایک شعر میں اور ان کی تعریف کی ہے:

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب رگ جاں کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را

نالہ جز حسن طلب، اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے، جفا شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلی استاد نہیں

دونوں جہاں دے وہ سمجھے، یہ خوش رہا　　　یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے　　　تیرا پتہ نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ، اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز، تو غمخوار کیا کریں

شعر۔۱ اپنی فراخ حوصلگی اور اس کے ساتھ شرافت نفس کا اظہار کیا ہے۔ یعنی میں جو دونوں جہان لے کر خاموش رہا اس کا سبب یہ نہ تھا کہ میں اس پر قانع ہو گیا بلکہ مجھ کو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی۔ اس لیے خاموشی اختیار کی۔ مگر انھوں نے یہ سمجھا کہ خوش ہو گیا۔

شعر۔۲ مقام: یعنی مقام سلوک و معرفت۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ تیری جستجو میں نکلے، ان میں سے ہر مقام پر کچھ نہ کچھ تھک کر رہ گئے۔ غرض کہ اسی طرح سب کا خاتمہ ہو گیا، اور ایسا ہونا لابد تھا کیونکہ تو لا پتہ ٹھہرا۔ تجھ تک کیسے پہنچ سکتے تھے۔ ایسی صورت میں اگر تھک کر گر نہ پڑتے تو ناچار کیا کرتے۔

شعر۔۳ مصرعہ اول میں استفہام اقراری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل بزم شمع کے غمخوار ضرور ہیں لیکن غم ہی چونکہ اس کو ایسا جانگداز لگا ہوا ہے (کہ وہ جل جل کر پگھلا کرتی ہے) اس لیے وہ اس کی مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ ماحصل شعر کا یہ ہے کہ دوست واحباب کی رفاقت صرف اسی وقت تک کام آسکتی ہے جب تک مرض قابل علاج ہو لیکن جب مرض یا غم لاعلاج ٹھہرا تو پھر عدم توجہی کی کیا شکایت۔ اگر ایسی حالت میں غمخواری کی بھی جائے تو بیکار ہے (جیسا کہ شمع کی مثال ہے) ایک طریقہ سے مرزا نے اس میں اپنی کمال خستہ حالی کا اظہار کیا ہے۔

ہوگئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

شعر۔۱ مطلب یہ ہے کہ معشوق پر میرے رقیب کی شیریں بیانی اثر کر گئی ہے اور وہ اس کو اپنا عاشق سمجھنے لگا ہے اور چونکہ ہم بے زبان ہیں اور کچھ کہہ نہیں سکتے اس لیے اس کو یہ گمان ہے کہ ہم کو اس سے عشق نہیں، حالانکہ اصل عاشق ہم ہی ہیں۔

قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا　　　تعجب سے وہ بولا "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں"

دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ
نہ کر سرگرم اس کافر کو اُلفت آزمانے میں

شعر۔۱ یعنی افسوس ہے کہ میرا معشوق بھی کیسا غیور اور سنگدل ہے کہ میں نے جو اس کو لیلیٰ کے خود دشتِ مجنوں میں جانے کا قصہ سنایا تو وہ یہ سن کر ایک دم مارے غیرت اور طیش کے چونک اٹھا اور کہنے لگا کہ کیا زمانے میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود معشوق عاشق کے پاس جایا کرتے ہیں؟

شعر۔۲ شاعر اپنے سے خطاب کرتا ہے کہ اے غالبؔ تو اپنے معشوق کو اپنی محبت آزمانے کی تربیت مت دے کیونکہ مجھ کو اس کے دل نازک پر رحم آتا ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ تیری محبت آزمانے کے لیے تجھ کو قتل کرے گا اور تجھ کو قتل ہو جانے کے بعد (تیری وفا کی وجہ سے) اس کا دل نازک کڑھے گا (کہ اُس نے عاشق صادق کو مار ڈالا)

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا　　　بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد یاں

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغ رہگزار باد یاں

شعر۔۱ لگ گیا یعنی مرض لگ گیا۔ معشوق جلوت پسند نہیں ہے تو اس خیال کو شاعر ایک نئے طریقہ سے بیان کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ہماری بے کسی ہی کا معشوق پر صبر پڑا ہے کہ اس کو بھی تنہا دل لگا کر بیٹھے رہنے کا مرض لگ گیا ہے۔ اس کے خلوت پسند ہو جانے کا باعث میری ہی بے کسی ہے۔

شعر۔۲ زوال آمادہ: یعنی زوال پذیر۔ آفرینش: پیدائش، دنیا۔ مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا اور اس کے تمام اجزا ذرا ذرا کر کے سب فانی ہیں۔ یہاں تک کہ خورشید بھی ہوا کے راستہ میں رکھے ہوئے چراغ کی مانند ہے کہ اب بجھا اور اب بجھا۔ (یعنی بالکل بے ثبات ہے) خورشید اور چراغ میں وجہ تشبیہ ظاہر ہے۔

یہ ہم، جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں   کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے   کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو   یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

شعر۔۱ شعراء، صبا کو نامہ بر یعنی قاصد کہتے ہیں کیونکہ اس کو کہیں بھی روک ٹوک نہیں اور وہ ہر جگہ موجود ہے۔ پس مطلب یہ ہے یہ جو ہجر (مفارقت) میں ہم بار بار در و دیوار کو دیکھتے ہیں تو اس کی یہ وجہ ہے کہ ہم قاصدِ صبا کے منتظر ہیں کہ دیکھیے کب اور کس طرف سے دیوار پھاند کر یا دروازہ کی راہ خبر لے کر آ موجود ہو۔

شعر۔۲ یعنی شاعر کو جو معشوق کے اپنے گھر آنے سے حیرت ہوئی ہے، وہ اس کو نہایت خوبی کے ساتھ مصرعہ ثانی میں ادا کرتا ہے، یعنی وہ کبھی معشوق کو دیکھتا ہے اور کبھی اپنے گھر کو کہ اس (غریب) گھر میں اور ایسا (بڑا) شخص وارد ہوا۔

شعر۔۳ مطلب یہ ہے کہ میرے زخم جگر (کی گہرائی) کو جو لوگ بار بار دیکھتے ہیں کہ یہ کس (کامل فن) کا لگایا ہوا زخم ہے، تو ایسا نہ ہو کہ اس سے اس کے دست و بازو کو نظر (بد) لگ جاوے۔ گویا اپنے زخم کی فکر نہیں بلکہ معشوق کے بازوؤں کی فکر ہے:

ہر کس کہ زخم کاری مارا نظارہ کرد   تا حشر دست و بازوے اورا دعا کند

شعر۔۴ زینت اس لیے کی جاتی ہے کہ لوگ اس کو دیکھیں۔ شاعر کہتا ہے کہ تیری ٹوپی پر جو جواہرات لگے ہوئے ہیں ان کو ہم کیا دیکھیں۔ وہ کیا تیری زینت بڑھائیں گے البتہ لعل اور گوہر کے طالع کے عروج کو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تیری ٹوپی میں لگ کر کس بلند رتبہ پر پہنچ گئے۔ یعنی تیری ٹوپی پر لگنے سے ان کی زینت ہو گئی۔

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں   شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں
کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے   بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں   جو جاؤں واں سے کہیں کو، تو خیر باد نہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں   کہ ”آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں“
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب   گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں
جہاں میں ہو غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام   دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ ”یاد نہیں“

شعر۔۱ روز جزا: قیامت کا دن۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں ہے (یعنی اس پر ایمان نہیں ہے) بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ مجھ کو شب فراق کی سختیوں کے مقابلہ میں قیامت کی تکلیف بالکل ہیچ نظر آتی ہیں اور اسی بنا پر میں روز جزا کی کچھ فکر نہیں کرتا۔

شعر۔۲ شرابیوں کے یہاں شراب پینے کے لیے دو وقت بہت اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ ایک وہ دن کہ جس میں ابر رہے اور دوسری وہ رات کہ جس میں چاندنی کھلی ہو۔ پس شاعر کہتا ہے کہ اگر آج دن کو ابر و باد ہونے کی وجہ سے جلسہ برخاست رہا تو کوئی حرج نہیں۔ چونکہ آج مطلع صاف رہا ہے، اس لیے رات کو ضرور چاندنی نکلے گی لہٰذا ہم اُس وقت صحبت شراب کے مزے اڑا سکتے ہیں۔

شعر۔۳ مرحبا: شاباش۔ یہ لفظ عرب میں واسطے تعظیم مہمان کے کہتے ہیں۔ خیر باد: اچھا ہو جیو۔ یہ رخصتی دعا ہے۔ اپنے معشوق کی شکایت کرتا ہے کہ اس کی میرے ساتھ بے التفاتی کا یہ حال ہے کہ وہ کبھی بھی میرے ساتھ اچھی طرح پیش نہیں آتا۔ اگر میں کبھی اس کے پاس جاتا ہوں تو جیسا کہ عام قاعدہ ہے، وہ کبھی مجھ کو دیکھ کر یہ نہیں کہتا کہ ”آیئے تشریف لایئے۔“ اور نہ کبھی میرے رخصت ہوتے وقت یہ کہتا ہے کہ خیر باد یا خدا حافظ۔

شعر۔۴ یعنی اول تو وہ مجھ کو اپنی محفل میں یاد ہی نہیں کرتے اور اگر اتفاقاً کبھی ان کو میرا خیال آ بھی گیا تو وہ شرارت سے خالی نہیں ہوتا۔ یعنی یہی کہتے کہ ”آج جو محفل میں کچھ فتنہ و فساد نہیں تو شاید وہ مفسد و فتنہ جو نہیں آیا ہے۔“

شعر۔۵ مطلب یہ ہے کہ معشوق کے کوچہ کا میخانہ ہر وقت کھلا رہتا ہے اور ہر وقت شراب کی تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ کبھی کوئی فقیر نامراد واپس نہیں جاتا۔ کچھ خاص عید پر ہی منحصر نہیں کہ عید کو بھیک ملے۔

شعر۔۶ اس شعر میں شاعر نے جہان میں غم وشادی کے بہم ہونے پر حسرت کا اظہار کیا ہے کہ ہمیں ان سے کیا کام کیونکہ ہم تو ان سے محروم ہی ہیں۔ ہم کو تو خدا نے ایسا دل دیا ہے کہ جو کبھی خوش ہی نہیں ہوتا۔

شعر۔۷ کس خوبی سے معشوق کی وعدہ خلافی کا اظہار کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے غالب، تم فضول کیوں ان کے وعدے کو بار بار یاد دلاتے ہو۔ تم کو اس میں کیا مزا آتا ہے کہ تم کہو کہ آپ نے یہ وعدہ کیا تھا اور وہ کہے جائیں کہ ہمیں یاد نہیں۔ اس شعر میں کچھ ملامت کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں　　ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے!　　ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری سُرعت کے مقابل، اے عمر　　برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم　　اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہے وا شدِ گل　　مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ　　لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہل تدبیر کی وا ماندگیاں!　　آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پُرکار ہیں خوباں، غالبؔ
ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

شعر۔۱ ہوا باندھنا: رعب گانٹھنا۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے توسن (گھوڑے) کو (تیز رفتاری میں) ہوا سے تشبیہ دے کر ہم اپنی خوش بیانی کی ہوا باندھتے ہیں۔ صبا اور ہوا میں رعایت لفظی ہے۔

شعر۔۲ یعنی یہ کس کو معلوم ہے کہ آہ کا اثر ہو گا یا نہیں۔ ہمارا یہ کہنا کہ ہماری آہ ضرور موثر ہوگی، صرف ہماری ہوا ہی ہوا ہے۔ (یعنی رعب ہی رعب ہے)

شعر۔۳ برق کی سرعتِ فنا مشہور ہے۔ اِدھر کوندی اور اُدھر غائب ہو گئی۔ دوسرے یہ کہ جس کسی کے پاؤں میں مہندی لگی ہوتی ہے، وہ سرعت کے ساتھ چل پھر نہیں سکتا۔ پس شاعر کہتا ہے کہ اے عمر

تو اتنی تیز رفتار ہے یعنی اتنی جلد فنا ہو جانے والی ہے کہ بجلی بھی تیرے آگے پا بہ حنا ہے۔ یعنی سست و کم رفتار ہے۔

شعر۔۴ اشک کو شعراء بے سرو پا باندھتے ہیں۔ گویا بے سرو پائی کے بند میں وہ بھی گرفتار ہے۔ حالانکہ نہ ان کے گردن ہے کہ طوق پڑے اور نہ پاؤں ہیں کہ بیڑیاں۔ اس لیے قیدِ ہستی سے کسی کی بھی رہائی ممکن نہیں۔ یہ محض لفظی رعایت ہے۔

لفظی رعایات پر نظر رکھتے ہوئے اس شعر کے معنی اس طرح بھی کہے جا سکتے ہیں کہ شاعر کرب و صعب ہستی سے سخت پریشان ہے۔ اس کے خیال میں ان مصائب سے بچنے کی سوائے موت کے کوئی صورت نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن موت آئے تو کیونکر؟ پس یہی ترکیب ہے کہ خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع اور اشکباری کی جاوے اور دعا مانگی جاوے، اس خیال سے کہ اس کے دل میں کچھ تھوڑی سی تسکین ہوتی ہے لیکن معاً ایک مایوسی کی لہر اس کے سر سے پاؤں تک گزر جاتی ہے اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شعراء اشک کو بے سرو پا (بے بس) باندھتے ہیں۔ اس لیے اشکباری اس کے حصول مدعا (قیدِ ہستی سے رہائی) کے واسطے کارگر نہیں ہو سکتی۔

شعر۔۵ واشدنِ گل۔ مطلب یہ ہے کہ پھول نشۂ رنگ سے مست ہیں اسی وجہ سے کھلے ہوئے ہیں کیونکہ مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں۔

شعر۔۶ یعنی مضامین کی بندش میں شعراء جو جو غلطیاں کرتے ہیں، میں ان کو کہاں تک گنا پاؤں۔ ایک بڑی سخت غلطی یہی ہے کہ وہ نالہ کو جو کبھی رسا نہیں ہوتا، رسا باندھتے ہیں۔

شعر۔۷ واماندگی: تھکن، پیچھے رہ جانا۔ اس شعر میں اہل تدبیر پر طنز کرتے ہوئے ان پر اہل جنوں کی فوقیت دکھلائی ہے۔ کہتے ہیں کہ اہل تدبیر کی ذرا عقل ملاحظہ ہو۔ ان کے پاؤں میں جب آبلے پڑ جاتے ہیں تو الٹی حنا باندھ لیتے ہیں، یعنی ایک تو آبلہ ہی باعث واماندگی ہوتا ہے اور اس پر سونے میں سہاگا یہ کہ پاؤں میں مہندی لگا کر اور عاجز اور وامانده بن جاتے ہیں۔ (برخلاف اس کے اہل جنون کے اگر پاؤں میں آبلے ہوں تو وہ دشت پُرخار میں دوڑتے ہیں تا کہ وہ کانٹوں سے پھوٹ جائیں)

شعر۔۸ سادہ، اس وجہ سے کہ وہ (معشوق) از راہ سادگی سمجھتے ہیں کہ ہم دھوکے میں آ جائیں

گے۔ پُرکار، اس وجہ سے کہ ہم کو دھوکا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم سے یعنی کوئی اور بھی نہیں ہم سے (جو ان کو اچھی طرح جانتے ہیں) ذرا زور کے ساتھ پڑھنے سے اس کے معنی صاف ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے غالب! معشوق کیسے سادہ پُرکار ہیں کہ وہ اور کسی کو بھی نہیں، ہم کو پیمانِ وفا باندھ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ گویا ہم ان کے اس جھوٹے عہد کے دھوکے میں آجائیں گے۔

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

شعر۔۱ سخت کم آزار: بہت کم آزار۔ بجان اسد: یعنی اسدؔ کی جان پر، بعض شارحین نے 'ب' کو قسمیہ بھی لکھا ہے لیکن یہاں قسم کا کوئی محل نہیں معلوم ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری توقع کے لحاظ سے اسد پر زمانہ کی تکالیف بہت ہی کم ہیں۔ ورنہ ہم کو تو اس سے بہت زیادہ کی امید ہے۔ اپنی کمال ایذا دوستی کا اظہار کیا ہے۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں، عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوسی کس لیے!
کیا آسماں کے بھی برابر نہیں ہوں میں
غالبؔ وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے جو کہتے تھے ''نوکر نہیں ہوں میں''

شعر۔۱ مصرعہ اول میں استفہام اقراری ہے۔ کہتے ہیں کہ میں تیرے در پر ہمیشہ (پتھر کی طرح) پڑا رہتا ہوں۔ لیکن پھر بھی مطلب براری نہیں ہوتی۔ (کبھی مطلب براری نہ ہونے کی وجہ سے اکتا کر کہتے ہیں کہ) میں پتھر نہیں ہو کہ اس طرح ہمیشہ پڑا رہوں۔ میں ایسی زندگی سے بھی باز آیا۔

طباطبائی صاحب اس کے معنی اس طرح لکھتے ہیں ''اس زندگی سے تو پتھر ہونا بہتر تھا کہ شاید تیراسنگِ در ہوتا اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہمیشہ پتھر کی طرح پڑا تو رہتا ہوں لیکن درِیار سے دور ہوں۔ میں پتھر نہیں ہوں کہ اس طرح پڑا رہنا گوارا کروں۔''

شعر۔۲ مطلب یہ ہے کہ شراب کا پیالہ یا ساغر تو میں ہوں نہیں کہ اگر وہ ہمیشہ بھی دَور میں رہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ ایک بے جان چیز ہے۔ اس میں احساس کا مادہ نہیں۔ لیکن میں (آخر کو) تو انسان ہوں کوئی بے جان چیز نہیں۔ اگر ہمیشہ گردش میں رہوں گا تو اپنے آپ دل گھبرا جائے گا۔ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

شعر۔۳ لوح: تختی۔ حرفِ مکرر: وہ لفظ جو ایک بار لکھنے کے بعد پھر دوبارہ لکھ دیا جاوے۔ چونکہ یہ لفظ فضول اور زائد ہوتا ہے تو اس کو مٹا دیا کرتے ہیں۔ شاعر خدا سے فریاد کرتا ہے کہ یارب باوجودیکہ میں لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں تو پھر آخر یہ کیا بات ہے کہ زمانہ مجھ کو مٹائے دیتا ہے۔ یعنی اگرچہ میری ہستی کارآمد ہے فضول نہیں ہے لیکن تب بھی زمانہ میرے درپے (فنا) ہے۔

شعر۔۴ عقوبت: گناہ مطلب یہ ہے کہ تم جو مجھ کو میرے گناہ کی وجہ سے برابر سزا دے رہے ہو آخر اس کی کوئی حد بھی ہے۔ یہ سزا کبھی تو بند ہونی چاہیے (کیونکہ) میں صرف گنہگار ہی تو ہوں، کافر نہیں ہوں کہ ہمیشہ سزا ملتی رہے۔

شعر۔۵ حضرت رسول مقبول ﷺ کی طرف خطاب ہے کہ آپ کو تو لعل و زمرد و گوہر (یعنی مال و دولت دنیا) سے نفرت تھی، میں تو لعل و گوہر نہیں ہوں۔ پھر آپ مجھ کو کیوں عزیز نہیں رکھتے؟

شعر۔۶ شاعر حضرت رسول ﷺ سے عرض کرتا ہے کہ جب آپ کو شب معراج دیدہ ہائے مہر و ماہ پر قدم رکھنے میں کچھ دریغ نہیں ہوا تو پھر میری آنکھوں پر قدم رکھنے میں کیا اعتراض ہے۔ رتبہ میں میں ان سے کچھ کم نہیں ہوں۔

شعر۔۷ یعنی آپ نے شب معراج آسمان تک کو شرف قدم بوسی بخشا۔ پھر مجھ کو قدم بوسی سے

کیوں انکار ہے۔ کیا میں آسمان کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا۔

شعر۔۸ کیسے نئے اسلوب سے بادشاہ کا (ان کے وظیفہ مقرر ہونے پر) شکریہ ادا کیا ہے۔ مطلب صاف ہے۔

سب کہاں، کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہوگئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرئیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں
تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہوگئیں
قید میں، یعقوب نے، لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زُلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں
جُوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھونگا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں
اِن پریزادوں سے لینگے خُلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی، حوریں، اگر واں ہوگئیں
نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں
میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھُل گیا
بُلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب! دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں
بس کہ روکا میں نے، اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں، بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں
واں گیا بھی میں، تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب!
یاد تھیں جتنی دُعائیں، صرفِ درباں ہوگئیں
جانفزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں
ہم مُوَحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مِٹ گئیں، اجزائے ایماں ہوگئیں
رنج سے خُوگر ہوا اِنساں، تو مِٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں
یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ، تو اے اہلِ جہاں!
دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

شعر۔۱ یعنی انھیں حسینوں میں سے جو خاک میں مل گئے ہیں، بعض لالہ و گل کی شکل میں نمایاں ہوگئے ہیں۔ ان پھولوں کی خوبصورتی کو دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نہ معلوم وہ کیسی کیسی پیاری پیاری صورتیں ہوں گی جو زیرِ خاک روپوش ہوگئی ہیں۔ (یا مٹ گئی ہیں) امیر خسرو کا بھی ایک شعر ہے:

اے گل چو آمدی ززمیں گو چگونہ اند
آں رویہا کہ در تہ گرد فنا شدند

شعر۔۲ رنگا رنگ: طرح طرح کی۔ نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں۔ یعنی سب کچھ بھول گئے۔ لفظ 'بھی' کو ذرا زور کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ مرزا صاحب کا شباب بہت عیش و محبت سے بسر ہوا۔ اس زمانہ میں رنگین صحبتوں کا شوق ہوگیا، اور ایک ستم پیشہ سے مراسم بھی پیدا ہوگئے تھے۔ انہی رنگین صحبتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ شاعر ان لوگوں سے جو نشۂ شباب میں چور ہیں از راہ نصیحت کہتا ہے کہ تم لوگوں کی طرح ہم بھی رنگا رنگ کے جلسہ کیا کرتے تھے۔ لیکن پیری کا زمانہ آتے ہی سب چیزیں بھول گئے۔ تم ہماری اس حالت سے عبرت حاصل کرو اور اپنے چند روزہ شباب پر نازاں مت ہو۔ تمھاری یہ حالت ہمیشہ یکساں نہیں رہے گی۔

شعر۔۳ بنات النعش: قطب شمالی کی طرف سات ستارے ہیں۔ چار کو نعش اور تین کو بنات کہتے ہیں۔ مرزا نے ان ستاروں کو مونث مانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بنات النعش گردوں دن کو پردہ میں چھپی رہتی ہیں (کیونکہ وہ دن کو دکھلائی نہیں دیتیں) پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ رات کو برہنہ ہوجاتی ہیں؟

بظاہر اس شعر میں کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن مولانا عبدالباری صاحب نے معنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"......گویا کہ یہ شعر اپنے معشوق کی طرف خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ بنات النعش بڑی پردہ دار تھیں۔ دن کو منہ چھپائے رہیں مگر شب کو وقت آیا تو اپنا پردہ اٹھایا۔ تم ایسے ہو کہ شب وصل میں بھی مجھ سے شرمائے جاتے ہو حالانکہ یہ کوئی محل نہیں ہے یا یہ کہ یہ ایک عاشقانہ چال ہے کہ معشوق سے کہتا ہے کہ دیکھو تم کہتے کہ معشوقوں کا کام عریاں اور بے پردہ ہونے کا نہیں ہے۔ دیکھو بنات النعش دن میں کیسی چھپی ہوئی تھیں آخر شب کو اگر بے پردہ ہونے کا محل نہیں تو وہ بے پردہ کیوں ہوگئیں۔"

شعر۔۴ روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں۔ یعنی روتے روتے بے نور ہوگئیں۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس شعر کے معنی نہایت توضیح کے ساتھ لکھے ہیں، لکھتے ہیں کہ:

''حضرت یعقوب کی آنکھیں فرزند کے فراق میں روتے روتے سفید ہوگئی تھیں۔ مرزا کے فکر رسا نے اس سے تاثیر عشق کا کیا طرفہ مضمون پیدا کیا ہے کہ وہ روزن جو دیوار زندانِ یوسفؑ میں ہیں، حضرت یعقوبؑ کی نابینا آنکھیں ہیں جو اپنے فرزند کو دیکھتی رہتی ہیں۔ سفید نابینا آنکھوں کو جو روزن سے مشابہت ہے، ظاہر ہے۔ قطرہ قطرہ پانی اگر کہیں گرتا رہتا ہے تو مرمر اور فولاد تک میں سوراخ کر دیتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کی مدام اشکباری سے دیوار زنداں میں سوراخ ہوگئے ہیں جس طرح روزن دیوار کبھی بند نہیں ہوتے، حضرت یعقوبؑ کی نابینا آنکھیں کبھی بند نہیں ہوتیں رات دن بے خواب جانبِ یوسفؑ نگراں رہتی ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں روزن دیوار زنداں ہوگئیں؛ تاکہ تاریکی اور حبس سے یوسفؑ کا دم فنا نہ ہو۔ آنکھیں روزن دیوار زنداں ہوگئیں تاکہ یوسفؑ زنداں سے دنیا کا تماشا دیکھ سکیں اور تنہائی سے پریشان نہ ہوں۔''

مولانا حالی نے اس شعر کے معنی اس طرح لکھے ہیں۔ ''یعقوبؑ کی آنکھوں کو روزن دیوار زنداں قرار دیا ہے کیونکہ جس طرح روزن دیوار زنداں ہر وقت یوسفؑ پر کشادہ رہتا تھا، اسی طرح یعقوبؑ کی آنکھیں شب و روز یوسفؑ کی نگراں رہتی ہیں۔''

شعر۔۵ ماہ کنعان: حضرت یوسف علیہ السلام جن کا وطن کنعاں تھا۔ اس شعر میں ان عورات کی طرف اشارہ ہے جو حضرت یوسفؑ کو دیکھ کر ایسی محو ہوگئی تھیں کہ انھوں نے بجائے لیمو کے جواُن کو تراشنے کے لیے دیا گیا تھا، اپنی اپنی انگلیاں تراش لیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام عشاق تو اپنے رقیبوں سے ناخوش ہوتے ہیں لیکن زلیخا زنانِ مصر کی محویت سے خوش ہے کہ مجھ کو تو یوسفؑ سے عشق کرنے پر نام رکھتی تھیں، خود کیوں اس کے حسن میں محو ہو کر انگلیاں کاٹ لیں۔

شعر۔۶ فروزاں ہوگئیں۔ روشن ہوگئیں۔ مطلب یہ ہے کہ غم ہجر میں اگر (روتے روتے) میری آنکھوں سے خون کی ندیاں بہ رہی ہیں تو بہنے دو کیونکہ ہر طرف شام فراق کی تاریکی ہے۔ میں سمجھوں گا کہ میری آنکھوں میں دو موم بتیاں ہی (سرخی کی رعایت سے) روشن ہیں۔

شعر۔۷ پری زاد: یعنی حسین۔ خلد: بہشت۔ مطلب یہ کہ اگر ان پریزادوں کو جو ہم پر اس قدر ظلم و ستم کرتے ہیں، خدا نے حورانِ خلد بنا دیا تو پھر ہم بھی ان سے اس ظلم و ستم کا خوب بدلہ لیں گے۔

شعر۔۸ تیری زلفیں پریشاں ہوگئیں۔ یعنی درحالت ہمخوابی۔ مطلب یہ ہے کہ جس کا تو ہمخواب ہے اصل میں نیند، دماغ اور رات کا لطف اسی کا ہے۔ ہم کو تو ویسے ہی تیرے فکر میں نیند نہیں آتی اور نہ اپنے آپے کا ہوش ہے۔ راتیں تیرے غم میں جاگتے کٹتی ہیں۔

شعر۔۹ دبستاں: مکتب، مدرسہ۔ اصل میں ادبستان ہے'' مطلب یہ ہے کہ چمن میں میرا جانا مثل ایک استاذ کے تھا جس کی تقلید میں بلبلیں فوراً عاشقانہ آہ و فغاں کرنے لگیں۔

شعر۔۱۰ مژگاں ہوگئیں۔ اس قدر کوتاہ ہوگئیں کہ مژگاں بن گئیں لیکن مراد نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ ہے کہ شرم و حیا کے سبب اوپر نہیں اٹھتیں بلکہ پلکوں کی طرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔ شاعر تعجب سے پوچھتا ہے کہ گو اس کی نگاہیں شرم سے میری طرف نہیں اٹھتیں لیکن پھر بھی وہ میرے دل کے پار ہوئی جاتی ہیں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟

شعر۔۱۱ اس شعر میں آہ کے بار بار ابھرنے اور بار بار ضبط کرنے کو بخیہ کے تاگے سے تشبیہ دی ہے کیونکہ وہ بھی بار بار اٹھتا ہے لیکن پھر نیچے کو ہو جاتا ہے۔ بخیہ اور سینہ میں رعایت لفظی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بار بار میری آہ کے ابھرنے اور میرے اس کو ضبط کرنے نے میرے (پھٹے ہوئے) گریبان کے واسطے بخیہ کا کام دیا (یعنی وہ رفو ہوگیا)۔

شعر۔۱۲ ''یعنی اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو دربان کو دے چکا ہوں، دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس شعر میں جو اصل خوبی و لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونا ظاہر کرتا ہے کہ گویا اس کو ہر شخص ضروری جانتا ہے کیونکہ سب سے حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ بتاؤ ان کی گالیوں کا کیا جواب دوں گا جبکہ دعائیں سب نبٹ چکیں۔'' (یادگار غالب)

شعر۔۱۳ مرزا میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''میر مہدی صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پیے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہوگیا۔ دماغ روشن ہوگیا۔ نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔'' چنانچہ اسی حالت کو اس شعر میں دکھلایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جام شراب ایک بڑی جانفزا چیز ہے۔ جس کے ہاتھ میں جام شراب آجاتا ہے اس کے

ہاتھ کی تمام رگیں اس کے اثر سے رگ جان بن جاتی ہیں۔

شعر۔۱۴ موحد: وحدانیت کا قائل۔ کیش: مذہب۔ ”شاعر تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے، جن کا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے۔ اور جب ترک رسوم مذہب ہوا تو پس جتنی ملتیں مٹتی جائیں گی اجزائے ایمان ہوتی جائیں گی۔“ (یادگار غالب)

ڈاکٹر صاحب مرحوم لکھتے ہیں۔ ”ذات خداوندی گو جملہ مذاہب کا مقصود ہے، خدائے تعالیٰ خود طریق وملت کی قید سے مبرا ہے۔ ان کو ہر مذہب کا اس قدر پاس ہے کہ انھوں نے سب میں شرکت کی خاطر تمام ظاہری رسوم کو جو باعث امتیاز ہیں، ترک کر دیا ہے۔“

شعر۔۱۵ خوگر: عادی۔ اگر کوئی شخص کسی تکلیف کا عادی ہو جاتا ہے تو رفتہ رفتہ یہ تکلیف اس کو تکلیف نہیں رہتی۔ پس شاعر کہتا ہے کہ مجھ پر اتنی مصیبتیں پڑی ہیں کہ مصیبت کا برداشت کرنا میرے واسطے ایک بہت آسان اور معمولی کام ہو گیا ہے۔ ”مشکلات کی کثرت کا اندازہ ان کی ضد حقیقی یعنی آسان ہو جانے سے کرنا درحقیقت حسن مبالغ کی معراج ہے جس کی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی۔“

شعر۔۱۶ رونے کی تاثیر ویرانی ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ میں اسی طرح روتا رہا تو تم دیکھو گے کہ یہ تمام بستیاں ویران ہو جائیں گی۔ اگر ان کو ویرانی سے بچانے کی کوئی فکر ہے تو میرے حصول مطلب میں کوشش کرو۔ کس نئے پیرایہ سے لوگوں کو اپنے مقصد میں کوشش کرنے کی ترغیب دی ہے۔

دیوانگی سے، دوش پہ زُنّار بھی نہیں
یعنی ہمارے جَیب میں اِک تار بھی نہیں

د ل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے
دُشوار تو یہی ہے کہ، دُشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر، وبالِ دوش
صحرا میں، اے خُدا! کوئی دیوار بھی نہیں

گنجایشِ عداوتِ اغیار، یک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے، خدا کو مان
آخر نوائے مُرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے رُوکشی
حال آنکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اِس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خُدا!
لڑتے ہیں، اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے، تو ہُشیار بھی نہیں

شعر۔۱ شاعر کہتا ہے کہ میرے جنوں کی عجیب کیفیت ہے کہ میں نے چاک کرتے کرتے گریبان میں ایک تار (تاگہ) تک نہیں چھوڑا تا کہ وہی زنار کا کام دیتا اور مذہب صنم پرستی کے خلاف نہ ہوتا۔

شعر۔۲ یعنی جب اس کے دیدار کی حسرت میں دل مٹا چکے تو اس کے بعد ہم کو یہ احساس ہوا کہ ہم میں تو طاقتِ دیدار بھی نہ تھی، فضول دل کو گنوایا۔

شعر۔۳ ایک واقعہ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے۔ اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لے جاؤ اور چاہو مجاز پر محمول کرو، دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ دقت نہ تھی کیونکہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق وآرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں اور اس طرح شوق وآرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی۔“ (یادگار غالب)

حسرت موہانی صاحب اس کے معنی اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ ”تحصیل دشوار آسان نہیں ہوتی۔ شاعر کہتا ہے کہ ملنا تیرا آسان نہ ہو یعنی دشوار ہوتا ہم سہل ہے مگر مشکل تو یہ ہے کہ دشوار بھی نہیں، محال ہے جس میں میرا کسی طرح قابو نہیں۔ محض مجبور ہوں۔“

شعر۔۴ یعنی بغیر عشق تو عمر کٹ نہیں سکتی، لیکن عشق میں آزار وتکلیف لازمی ہے اور یہاں (مجھ میں) اتنی طاقت بھی نہیں کہ تکلیف اٹھا سکیں، پھر ہو تو کیونکر ہو۔

شعر۔۵ وبال: مصیبت۔ دوش: کندھا۔ شاعر کہتا ہے کہ جنوں کی وجہ سے میری ایسی حالت ہو گئی ہے کہ سر تک بھی کندھوں کو گراں معلوم ہوتا ہے۔ صحرا میں کوئی دیوار بھی تو نہیں کہ اس سے سر پھوڑ کر اپنے اس بوجھ کو ہلکا کر لیتا:

کہاں تک روؤں اس کے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے
میری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

شعر۔۶ مطلب یہ ہے کہ یاں ہمارے دل کی کمزوری کی یہ حالت ہے کہ وہ کثرت ضعف سے

ہوسِ یار تک کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا۔ پھر اس میں عداوت اغیار کی گنجائش کہاں سے ہوسکتی ہے، یعنی جب آرزوئے دوست جیسی عزیز چیز اس کو دوبھر معلوم ہوتی ہے تو پھر عداوت اغیار کا کیا کہنا ہے۔

شعر۔٧ نوائے مرغ گرفتار: مرغ گرفتار کی (اپنی قید پر) نوحہ گری۔ مطلب یہ ہے کہ میرے نالہائے زار سے تجھ کو ڈرنا چاہیے اور خدا کا خوف کرنا چاہیے کیونکہ یہ مرغ گرفتار کی نوحہ گری نہیں ہے کہ کچھ اثر ہی نہ ہو۔ ان کا ضرور اثر ہوگا۔

شعر۔٨ روکشی: مقابلہ۔ مطلب یہ ہے کہ دل میں اگرچہ خلش خار برداشت کرنے کی بھی طاقت نہیں لیکن وہ پھر بھی صف مژگاں سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

شعر۔٩ صاف ہے۔

شعر۔١٠ مخاطب کو غالب کے دیوانہ ہونے کا یقین نہیں ہے تو شاعر ہشیار بھی نہیں کہہ کر، اپنے اور اس کے درمیان اختلاف کو دور کرنا چاہتا ہے یعنی اگر آپ اس کو دیوانہ نہیں کہتے ہیں تو اس کو ہشیار بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ میں نے اس کی حالت کو خلوت وجلوت، دونوں حالتوں میں خوب اچھی طرح غور کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے اور اس سے یہی نتیجہ نکلا ہے کہ ”دیوانہ گر......“

نہیں ہے زخم کوئی، بخیے کے درخُور مرے تن میں　　　ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتۂ چشم سوزن میں
ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا، خانہ ویرانی　　　کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں
ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں　　　نگینِ نامِ شاہد، ہے مرے ہر قطرہ خوں، تن میں
بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی　　　شبِ مہ ہو، جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں
نکوہش، مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی　　　ہوا ہے خندۂ احباب، بخیہ جیب و دامن میں
ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے　　　پرافشاں جوہر آیئنے میں، مثلِ ذرہ روزن میں
نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے　　　جو گُل ہوں تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
ہزاروں دل دِیے، جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو　　　سیہ ہو کر سویدا ہوگیا، ہر قطرہ خوں تن میں

اسدؔ! زندانیِ تاثیرِ اُلفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہوگیا ہے، طوق گردن میں

شعر۔١ چشم سوزن: سوئی کا نکوا۔ بخیہ کے درخور: سیے جانے کے لائق۔ تارِ اشک یاس کو رشتہ (چشم) سوزن کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ میرے بدن میں کوئی ایسا زخم نہیں کہ وہ سیا جاسکے، (یعنی بہت بڑے بڑے زخم ہیں) اس لیے رشتہ چشم سوزن تار اشک یاس بن گیا، یعنی اس کو مایوسی و ناامیدی ہوئی۔

شعر۔٢ پنبہ: روئی۔ کف سیلاب: سیلاب کے جھاگ ”جو شہر کہ دریا کے کنارے واقع ہوتے ہیں بعض اوقات شدت آب کی وجہ سے غرق ہوجاتے ہیں۔ بلاد حیدرآباد اور لکھنؤ کے واقعات سب کو یاد ہیں جب آب دریا طغیانی کے ساتھ شارعات سے مکان میں داخل ہوتا ہے تو جہاں سے راہ پاتا ہے، اندر چلا جاتا ہے۔ جہاں داخل ہونے میں مزاحمت ہوتی ہے، پانی کف لے آتا ہے۔ جب جوش دریا فرو ہوچکتا ہے تو سطح آب نیچی ہوجاتی ہے اور پانی واپس دریا کی جانب روانہ ہوتا ہے لیکن کف سیلاب جس جس جوف اور سوراخ میں پیدا ہوا تھا، وہ وہیں باقی رہ جاتا ہے اور تار عنکبوت کی طرح اس رخنہ کو بند کردیتا ہے۔“ (پس خانہ ویرانی ذوق تماشا کی مانع ہے۔ (ڈاکٹر عبدالرحمٰن)

شعر۔٣ ودیعت: امانت۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بدن کے خون کا ہر قطرہ ایک نگینہ بنا ہوا ہے جس پر (سوزن) مژگان معشوق نے اس کا نام کھود دیا ہے اور میں گویا مژگان یار کی کاوشوں کے ظلم کا (یعنی ان سب نگینوں کا) امانت خانہ ہوں۔ قریب قریب اسی مضمون کا ایک شعر اس سے پہلے بھی آچکا ہے:

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب　　　خون جگر ودیعت مژگان یار تھا

شعر۔٤ یعنی میرے گھر میں اس قدر تاریکی ہے کہ اگر اس کے دیواروں کے روزن میں روئی رکھ دی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ گویا چاند نکل آیا۔ اسی مضمون کا ایک دوسرا شعر بھی ہے:

کیا کہوں تاریکی زندان غم اندھیر ہے　　　پنبہ نور صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

شعر۔٥ خندۂ دنداں نما کو بخیہ کہا ہے۔ وجہ تشبیہ ظاہر ہے۔ نکوہش: سرزنش ملامت۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنے احباب کی ملامت کی وجہ سے بے ربطی جنوں سے باز رہا اور میں نے اپنے دامن کو چاک نہیں کیا، گویا ان کے ہنسنے (یعنی خندہ دنداں نما) نے میرے جیب وگریبان کے حق میں بخیہ کا کام کیا۔

شعر۔۶ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے شعاعِ آفتاب سے روزن میں ذرے پُرافشاں معلوم ہوتے ہیں، اسی طرح اس مہروش کے عکس رخ سے آئینہ میں جوہر (کے ذرے) پُرافشاں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم لکھتے ہیں ’’جو لوگ علم مناظر و مرایا سے آگاہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر کسی ذرے کو کسی روزن میں آنکھ لگا کر دیکھا جائے تو ذرہ کے بے مقدار جسم سے ہر سمت شعائیں نکلی ہوئی نظر آئی ہیں۔ اس کا باعث آفتاب کی روشنی ہے جس کے عکس سے ذرہ کا جسم خارجا روشن ہو جاتا ہے۔ یہ شعائیں بعینہ ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا پھلجھڑی چھوٹ رہی ہے۔ مرزا غالب اس کو ذرہ کا پُرافشاں ہونا کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مرزا کے وقت میں تو کیا اس زمانہ میں بھی جب کہ انکسار اور انعکاس کے مسائل زبان زد عام ہیں، کتنے شخص ایسے جو اس کیفیت سے واقف ہیں۔ ایک اور معنی اس شعر کے ممکن ہیں۔ مرزا نے بعض اوقات پُرافشانی، پُرزنی کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً:

کروں بیداد ذوقِ پُرفشانی عرض کیا قدرت
کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

اگر یہاں بھی یہی معنی ہیں تو ذرات کی پرواز مراد ہے۔ چنانچہ ایام گرما میں دوپہر کے وقت تاریک کمرے میں اگر کوئی آفتاب کی کرن سیاہ پوش روشن دان کے کسی رخنہ سے اندر آجاتی ہے، تو غبار کے باریک ذرے جو خطِ شعاع سے روشن ہو جاتے ہیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

شعر۔۷ گلخن: آتشگاہ۔ مطلب یہ ہے کہ میں یہ تو جانتا نہیں کہ میں اچھا ہوں یا بُرا۔ البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میری صحبت مخالف ہے: یعنی جیسا میں ہوں میری صحبت ویسی نہیں ہے اگر میں گل (یعنی اچھا) ہوں تو میں گلخن میں ہوں (یعنی صحبت بہت بری ہے) اور اگر خس (یعنی برا) ہوں تو گویا گلشن میں ہوں (یعنی صحبت بہت اچھی ہے اور میں اس کے قابل نہیں)

شعر۔۸ مطلب یہ ہے کہ جوشِ جنونِ عشق سے میرا ہر قطرۂ خون سیہ ہو کر سویدا بن گیا ہے اور سویدا اس داغ کو کہتے ہیں جو دل میں ہوتا ہے۔ پس گویا جنون کی بدولت (ہزاروں قطرۂ خون سیہ ہونے کی رعایت سے) ہم کو ہزاروں دل مل گئے۔

شعر۔۹ مطلب یہ ہے کہ اے اسد، میں معشوق کی تاثیر محبت کا اسیر ہوں۔ اس نے جو از راہ نوازش میرے گلے میں باہیں ڈالی ہیں، وہ میری گردن کے لیے طوق بن گئیں ہیں۔

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
مگر غبار ہوئے پر، ہوا اُڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں
یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے!
کہ غیرِ جلوۂ گُل رہگزر میں خاک نہیں
بھلا اسے نہ سہی، کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں
خیالِ جلوۂ گُل سے، خراب ہیں میکش
شرابخانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں
ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے، اسدؔ!
کھُلا کہ، فائدہ عرضِ ہُنر میں خاک نہیں

شعر۔۱ خاک نہیں: کچھ بھی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سوائے خون جگر پینے کے مجھ کو دنیا کی کسی لذت میں مزا نہیں آتا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ بھی میرے جگر میں بالکل باقی نہیں رہا۔

شعر۔۲ یعنی میرے بال و پر میں تو اتنی قوت نہیں کہ میں اڑ کر کوئے معشوق تک پہنچ سکوں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ شاید مرنے پر میری خاک کو ہوا وہاں تک اڑا لے جائے۔

شعر۔۳ شمائل جمع ہے شمیلہ کی بمعنی خصلت و عادت۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا کون بہشت شمائل (معشوق) آنے والا ہے جو راستہ میں سوائے جلوۂ گل اور کچھ نظر نہیں آتا۔

شعر۔۴ نفس: آہ، گریہ وزاری۔ مطلب یہ ہے کہ میری آہ وزاری بالکل ہی بے اثر نکلی۔ اگر اس کا اس سنگ دل پر کچھ اثر نہ ہوا تھا تو کم از کم مجھی کو اپنے حال پر رحم آیا ہوتا، اور عشق سے باز آتا۔

شعر۔۵ یعنی میخانہ میں تو کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ یہ میکش جو مست نظر آتے ہیں تو اس کا باعث خیالِ جلوۂ گل (آمد فصل بہار) ہے۔

شعر۔۶ مرزا صاحب دہلی میں تقریباً پچاس سال تک رہے لیکن ہمیشہ کرایے کے مکان میں۔ خود مکان بنانے کی دل میں حسرت رہی۔ چنانچہ اس شعر میں اس کا اظہار کیا ہے۔ مطلب یہ

ہے کہ عشق کی غارت گری کی وجہ سے نہایت شرمندہ ہوں۔ اس نے مجھ کو بالکل پامال اور محتاج کردیا ہے۔ میرے گھر میں (یعنی میرے پاس) اب کچھ باقی نہیں۔ صرف ایک حسرت تعمیر باقی رہ گئی ہے۔ اسی خیال کو آگے چل کر کر بھی بیان فرماتے ہیں:

گھر میں تھا کیا کہ تیرا غم اسے غارت کرتا   وہ جو رکھتے تھے ایک حسرت تعمیر، سو ہے

طباطبائی صاحب اس کے معنی اس طرح لکھتے ہیں ''شرمندگی کی وجہ یہ ہے کہ جب کچھ بھی نہیں تو عشق غارت کیا کرے گا؟

شعر۔۷ کھلا: یعنی یہ حال کھلا، یہ بات معلوم ہوئی۔ مرزا صاحب جس پایہ کے شاعر تھے، اس کے شایان ان کی قدر نہ ہوئی۔ مہر نیمروز میں بہادر شاہ کو خطاب کر کے ظاہر کیا ہے کہ شاہجہاں کے عہد میں حکیم شاعر کو سیم و زر میں تولا گیا تھا لیکن میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی حکیم کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے۔ لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ مرزا صاحب اس ناقدردانی کی شکایت جو کہ بالکل مناسب اور بجا ہے، اکثر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ منشی حبیب اللہ ذکا کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ''ایک کم ستر برس کی عمر ہوئی۔ سوائے شہرت خشک کے فن شعر کا کچھ پھل نہ پایا۔ فرمان دہان عصر معتقد ہوئے مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ چنانچہ اس میں اپنی اسی ناقدردانی اور مضحکہ خیزی کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے اشعار کیا ہیں، محض سامانِ دل لگی ہیں (کیا خوب!) بس معلوم ہوگیا کہ اظہار ہنر بالکل بیکار ہے۔

دل ہی تو ہے، نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں!   روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں!
دَیر نہیں، حرم نہیں، دَر نہیں، آستاں نہیں   بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں!
جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیم روز   آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں مُنھ چھپائے کیوں!
دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ   تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں!
قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے، آدمی غم سے نجات پائے کیوں!
حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم   اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں!
واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع   راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بُلائے کیوں!

ہاں وہ نہیں خُدا پرست، جاؤ وہ بیوفا سہی   جس کو ہو دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں!

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں!
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں!

شعر۔۱ معشوق عاشق کی گریہ وزاری سے تنگ و آزردہ ہو کر اس کو منع کرتا ہے کہ آخر کیوں روتے ہو؟ کوئی وجہ بھی ہے۔ اس کے جواب میں عاشق کہتا ہے کہ روئیں کیسے نہیں! آخر ہم بھی دل رکھتے ہیں۔ اس میں کہاں تک ظلم کی برداشت ہو۔ کوئی اینٹ پتھر تو ہے نہیں کہ کچھ اثر ہی نہ ہو۔ اگر آپ کو یہ منظور ہے کہ ہم نہ روئیں تو ستانا چھوڑ دیجیے ورنہ ہم بھی اچھے روئیں گے۔ آخر ہمیں کوئی کیوں ستائے؟ سنگ وخشت سے معشوق کی سنگدلی کی طرف اشارہ ہے۔

شعر۔۲ دیر: بت خانہ، مندر: حرم۔ احاطہ جو گرداگرد خانہ کعبہ کے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نہ مندر میں بیٹھا ہوں، نہ مسجد میں۔ نہ کسی کے دروازے پر، نہ کسی کی چوکھٹ پر۔ بلکہ راہ عام پر بیٹھا ہوں جو کسی کی بھی ملکیت نہیں ہے۔ پھر وہ (غیر) ہم کو وہاں سے کیوں اٹھاتا ہے۔

شعر۔۳ جمال نظارہ سوز: وہ حسن کہ جس کا نظارہ نہ ہو سکے۔ یہ شعر و مجاز، دونوں پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے دوپہر کو سورج کی طرف نہیں دیکھ سکتے اسی طریقہ سے جبکہ میرے محبوب کا جمال دلفروز اپنے آپ ہی نظارہ سوز ہو تو پھر اس کو پردے میں منہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ منہ چھپانے سے جو فائدہ تھا، وہ اب بھی حاصل ہے کہ اس کا نظارہ نہیں ہوسکتا۔ حاصل یہ ہے کہ وہ مستور نہیں ہے۔ اس کا جلوہ نظارہ سوز ہے جس کی وجہ سے ہم محروم ہیں۔

شعر۔۴ ناوک: تیر۔ دشنہ: خنجر۔ مطلب یہ ہے کہ تیرا دشنۂ غمزۂ جاں ستاں (جان لینے والا) ہے۔ اور ناوک ناز بے پناہ ہے (یعنی اس سے پناہ نہیں مل سکتی) جب تیری یہ حالت ہے تو پھر میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھی، خواہ تیرا عکس ہی کیوں نہ ہو، تیرے سامنے آئے ورنہ وہ بھی تباہ ہوگا۔

شعر۔۵ مطلب یہ ہے کہ اصل میں حیات و غم ایک ہی چیز ہیں تو پھر مرنے سے پیشتر غم سے کیونکر نجات مل سکتی ہے۔

شعر۔۶ بوالہوس: جس کو ہوس زیادہ ہو۔ رقیب کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے مصرعہ میں غیر کے معنی بھی رقیب کے ہیں۔ مرزا صاحب نے خود ایک خط میں اس کی شرح لکھی ہے۔ لکھتے ہیں ''حسن

عارض اور حسن ظن دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں۔ یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اس کا صحیح ہے۔ کبھی خطا نہیں کرتا۔ اور یہ گمان اس کو اپنی نسبت ہے کہ میرا مارا کبھی بچتا نہیں اور میرا تیر غمزہ خطا نہیں کرتا۔ پس جب اس کو ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے۔ اس حسن ظنی نے رقیب کی شرم رکھ لی ورنہ رقیب عاشق صادق نہ تھا۔ اگر پائے امتحان درمیان آتا تو حقیقت کھل جاتی۔"

شعر۔۷ اس شعر میں صنعت لف ونشر غیر مرتب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم کو تو حجاب پاس وضع مانع ہے۔ اس لیے اس سے راستہ میں نہیں ملتے (کیونکہ یہ وضع کے خلاف ہے) اور اس کو اپنے عز و ناز پر غرور ہے، اس لیے وہ مجھ کو محفل میں نہیں بلاتا۔ پھر ملاقات ہو تو کیسے ہو۔

شعر۔۸ 'ہاں اور جاؤ' پر ذرا زور دے کر پڑھنے سے مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ لوگ عاشق کو سمجھاتے ہیں کہ معشوق بڑا بے وفا اور کافر ہے۔ عشق سے باز آؤ۔ فضول دین و دل کیوں گنواتے ہو۔ تو اس پر وہ برہم زدہ ہو کر کہتا ہے کہ اگر وہ بے وفا اور کافر ہے تو ہونے دو، کوئی حرج نہیں۔ میں اس کو ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ یہ دونوں چیزیں اس کے پیچھے کھودوں۔ تم کو اگر دین و دل عزیز ہے تو تم اس کافر اور بے وفا کے کوچہ میں مت جاؤ۔

شعر۔۹ شاعر اپنے مرنے کے بعد زبان حال سے اپنے احباب کو تسکین دیتا ہے کہ رونے کی کیا بات ہے۔ صبر کرنا چاہیے۔ اگر وہ مر گیا ہے تو مر جانے دو۔ تم کو اس سے فائدہ ہی کیا تھا۔

غُنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ "یوں"
بوسے کو پُوچھتا ہوں میں، مُنھ سے مجھے بتا کہ "یوں"

"پُرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے
اُس کے ہر ایک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ "یوں"

رات کے وقت مَے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خُدا کرے، پر نہ کرے خُدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی ؟ یہ جو کہا، تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا، اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں، اُس کے رُوبرُو، کیوں نہ خموش بیٹھیے
اُس کی تو خامُشی میں بھی ہے یہی مُدّعا کہ یوں

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے، تہی"
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ "یوں"؟

مجھ سے کہا جو یار نے، "جاتے ہیں ہوش کس طرح؟"
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ "یوں"

کب مجھے کُوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موج، محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ "یوں"

جو یہ کہے کہ "ریختہ کیوں کے ہو رشکِ فارسی"
گُفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ "یوں"

شعر۔۱ یعنی میں یہ پوچھتا ہوں کہ بوسہ کس طریقہ سے لیا کرتے ہیں۔ مجھ کو اپنے منہ سے بوسہ لے کر بتا کہ یوں لیا کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ دور سے ہی غنچہ (دہن) ناشگفتہ کو دکھلا دیا۔ یہ کافی نہیں۔

شعر۔۲ مطلب یہ ہے کہ ان کی طرز (ادائے) دلبری کے متعلق دریافت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ بغیر کہے ہی ان کا ہر ایک اشارہ، طرز دلبری کا نمونہ ہے۔

شعر۔۳ یعنی خدا کرے وہ میرے گھر آئے، لیکن خدا نہ کرے کہ اس طریقہ سے کہ رات کا وقت ہو شراب پیے ہوئے رقیب کے ساتھ ہو۔

شعر۔۴ مطلب یہ ہے کہ میں نے جو اس سے پوچھا کہ غیر کے ساتھ رات کیسی گزری؟ تو وہ میرے سامنے آ بیٹھا اور خشم آلودہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا کہ کیوں تم بھی یوں گستاخی کرنے لگے۔

شعر۔۵ یعنی اس کی خاموشی کا یہی مطلب ہے کہ ہم بھی اس کی طرح خاموش بیٹھے رہیں۔ اس لیے خاموش بیٹھے ہیں۔

شعر۔۶ "ستم ظرف: وہ ظریف جس کی ظرافت کے ساتھ ظلم بھی ملا ہوا ہو۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں نے رقیب کو غیر سمجھ کر کہا تھا کہ آپ کی محفل، غیر سے خالی ہونی چاہیے۔ (اس نے) یہ سن کر مجھے بزم سے اٹھوا دیا یعنی یہاں ایک تو ہی غیر نظر آتا ہے۔" (یادگار غالب)

شعر۔۷ یار نے جو مجھ سے پوچھا کہ ہوش کس طرح اڑا کرتے ہیں تو میری بیخودی دیکھ کر فوراً ہوا چلنے لگی کہ اس طرح اڑتے ہیں۔

شعر۔۸ یعنی تیری حیرت نقش پا نے آئینہ بن کر مجھے بتلا دیا کہ کوچۂ معشوق میں خاک آلودہ تحیر و بیخودی کی حالت میں پڑا رہنا چاہیے، ورنہ میں کب جانتا تھا کہ معشوق کے اس طرح کوچہ میں کس وضع سے رہتے ہیں۔

شعر۔۹ یعنی اگر تیرے دل میں یہ خیال ہے کہ بھلا وصل میں (یعنی وصل ہونے پر) شوق کیسے کم

ہوجاتا ہے، تو موج بحر کی مثال دیکھ کہ وہ وصل بحر ہونے کے بعد کنارے پر پہنچنے کے واسطے کیسے ہاتھ پانو مار رہی ہے۔

مولانا آسی نے اس شعر کا مطلب اس طرح لکھا ہے ''یعنی اگر تیرے دل میں یہ خیال ہے کہ وصل حاصل ہونے پر اضطراب شوق کا زوال ہوجاتا ہے تو یہ غلط ہے۔ موج کو دیکھو کہ اس میں باوجود وصال بحر نصیب ہونے کے، اضطراب باقی ہے اور وہ ہاتھ پانو مار رہی ہے۔'' لیکن یہ مطلب واقعات کے بالکل خلاف ہے حقیقت یہی ہے کہ وصل سے شوق کم ہوجاتا ہے۔

شعر۔۱۰ کیونکہ یعنی کیونکر۔ ریختہ: اردو۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ریختہ کیونکر رشک فارسی ہوسکتی ہے، تو تو ان کو ایک مرتبہ غالب کا کلام پڑھ کر سنادے کہ اس طرح ہوسکتی ہے۔

ردیف و

حسد سے، دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو　　　کہ چشمِ تنگ، شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو
بقدرِ حسرتِ دل ، چاہیے ذوقِ معاصی بھی　　　بھروں یک گوشۂ دامن، گر آبِ ہفت دریا ہو
اگر وہ سرو قد، گرمِ خرامِ ناز آجاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن، شکلِ قُمری نالہ فرسا ہو

شعر۔۱ یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے بلکہ حقیقت واقعی کو ایک نہایت عمدہ پیرایے میں بیان کیا ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چاردیواری میں محصور دنیا کے حالات سے ناواقف اور لوگوں کی ترقی وتنزلی کے اسباب سے بے خبر ہوتا ہے تو اپنی جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن جس قدر اس کا دائرہ وسیع، تعارف زیادہ ہے اسی قدر اس پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ لوگوں کی خوش حالی محض اتفاقی نہیں ہے جس پر حسد ورشک کیا جاوے، بلکہ ان کی محنت وتدبیر کا نتیجہ ہے اور اس لیے انصاف اور فیاضی دل میں پیدا ہوتی ہے اور خود بھی کوشش وتدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجائے حسد ورشک کے، اوروں کی ریس اور پیروی کرنے میں متوجہ ہوجاتا ہے۔ اس طرح وہ ایک اچھی بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو، جس طرح شعراء نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے، اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے۔'' (یادگار غالب)

شعر۔۲ معاصی جمع ہے معصیت کی بمعنی گناہ: بھروں: آلودہ کروں۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دل میں گناہوں کی بہت زیادہ حسرت ہے۔ اسی لیے میری حسرتِ دل کے مطابق میرا ذوق معاصی بھی کہیں زیادہ ہے۔ میرے اس ذوق کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اگر ہفت دریا بے گناہ بھی ہوں تو بھی میرے دامن کا ایک کونہ تر ہوگا۔ تر دامن گنہگار کو کہتے ہیں اور اس لفظ کے استعمال میں یہی رعایت مقصود ہے۔ اسی مضمون کا ایک شعر پہلے بھی گزر چکا ہے:

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک　　　میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

شعر۔۳ کف ہر خاک: ہر کف خاک۔ قمری کا رنگ خاکستر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ سرو قد (معشوق) سرگرم خرام ناز ہو، تو قمری کی طرح ہر کف خاک گلشن نالہ کرنے لگے۔

کعبے میں جارہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں　　　بھولا ہوں حقِّ صحبتِ اہلِ کُنِشت کو!
طاعت میں، تا رہے نہ مَے و انگبیں کی لاگ　　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہوں مُنحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے　　　ٹیڑھا لگا ہے قط قلَمِ سرنوشت کو
غالبؔ! کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خِرمن جلے! اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

شعر۔۱ کنشت: بت کدہ۔ مطلب یہ ہے کہ میں جو کعبہ میں رہنے لگا ہوں تو اس سے مجھ کو طعنہ مت دو کہ میں نے اپنے قدیم ہم نشینوں کو چھوڑ دیا۔ اگر میں کعبہ میں آگیا ہوں تو کہیں اہل کنشت کی حق صحبت کو تھوڑا ہی بھول سکتا ہوں۔

شعر۔۲ انگبیں: شہد۔ ''یعنی جب تک بہشت قائم ہے، لوگ عبادت اسی امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شراب طہور وغیرہ ملیں گی۔ پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیے تاکہ لالچ باقی

نہ رہے، اور لوگ خالصاً لوجہ اللہ عبادت کریں۔'' (یادگارِ غالب)

شعر۔۳ یعنی میں رہ و رسم ثواب سے کیونکر منحرف نہ ہوں کہ مقدر ہی میں یہ انھیں کا لکھا ہوا ہے کیونکہ ہماری سرنوشت جس قلم سے لکھی گئی تھی، اس کا قط بھی ٹیڑھا تھا۔

شعر۔۴ ایرا: ایراب، اروب۔ اردب ڈالنا، ایک شطرنج کا محاورہ ہے۔ جب بادشاہ کو کشت آتی ہے تو اس کو بچانے کے لیے کبھی کبھی کوئی اور مہرہ بیچ میں ڈال دیا کرتے ہیں۔ اسی کا نام اردب ہے مطلب یہ ہے کہ اگر ہم پر کوئی مصیبت بھی آئی تو ہم اس سے ہراساں نہیں ہوئے بلکہ ہم نے نہایت ثابت قدمی کے ساتھ ان مصائب کا مقابلہ کیا اور بغیر کسی لغزش یا پست ہمتی دکھلائے ہم نے اپنی تجاویز و مساعی کو سپر بنا کر ان کے وار کو بے ضرر مسترد کر دیا۔ اپنے استقلال اور ثابت قدمی کا اظہار کیا ہے۔

شعر۔۵ ملخ: ٹڈی۔ مطلب یہ ہے کہ اے غالب مجھ کو اپنی کوشش کا ثمرہ کبھی نصیب نہ ہوگا۔ اگر بالفرض محال میری کھیتی ٹڈیوں کے منہ سے بچ گئی، تو خرمن (بجلی سے) جل جاوے گا۔ یعنی ہمیشہ ناکامی و نامرادی ہی قسمت میں لکھی ہے:

مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

ایک دوسرا شعر ہے:

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

وارستہ اِس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بارِ نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گِلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں، ہر دَرد کی دَوا
یوں ہو، تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بیکسی نے کِسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں، خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خَلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونیِ ہمت، ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

مِٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صَرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ!
اِس میں ہمارے سَر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو!

شعر۔۱ وارستہ: بے پروا، آزاد۔ یعنی ہم کو اس بات کی ہرگز پروا نہیں کہ تم ہمارے ساتھ محبت ہی کرو۔ اگر محبت نہیں کرتے تو نہ سہی، عداوت ہی سہی۔ غرض ہمارے ساتھ کچھ نہ کچھ لگاؤ ضرور رہنا چاہیے۔ یہ تعلقات کا بالکل قطع کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

شعر۔۲ اختلاط: میل جول، محبت۔ مطلب یہ ہے کہ ضعف کی وجہ سے مجھ میں محبت کی بھی طاقت نہیں رہی یہاں تک کہ نقش محبت بھی دل پر بار معلوم ہوتا ہے۔

شعر۔۳ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ تو نے مجھ سے غیر کی شکایت کی ہے، لیکن مجھ کو یہ بھی ناگوار ہے مجھ کو تو تیری زبان سے اس کا تذکرہ سننا گوارا ہی نہیں، خواہ بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو۔

شعر۔۴ یعنی لوگ کہتے ہیں کہ ہر درد کی دوا پیدا ہوئی ہے، اگر ایسا ہے تو پھر غم الفت کا کوئی علاج کیوں نہیں؟

شعر۔۵ شاعر اپنی بے کسی پر خوش ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے کسی کا ممنون احسان نہیں ہونا پڑا۔ اور کہتا ہے کہ اگر اس بے کسی کی وجہ سے کوئی خجالت بھی ہو، تو کوئی حرج نہیں۔ تھوڑی دیر اپنے ہی دل میں اس پر نادم ہو لیتا ہوں۔ دوسروں کے سامنے تو بار احسان سے گردن نیچی نہیں ہوئی۔ بیکسی میں تسکین کا نیا پہلو نکالا ہے۔

شعر۔۶ جب کسی مجلس میں لوگ بیٹھتے ہیں تو قسم بہ قسم اور طرح طرح کی باتیں کیا کرتے ہیں اور مختلف مضامین پر بحث کیا کرتے ہیں لیکن تنہا انسان بھی بہ نفس نفیس خود ایک محشر خیال ہے۔ یعنی جب وہ خلوت میں (تنہا) ہوتا ہے تو طرح طرح کے خیالات و تصورات کا اس کے دل پر ہجوم ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی خلوت بھی جلوت سے کم نہیں۔

شعر۔۷ انفعال: منفعل ہونا، دوسروں کا اثر قبول کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ دوسروں کا اثر قبول کرنا

اور تحمّلِ احسان اٹھانا، زبونیِ ہمت کی دلیل ہے۔ اس لیے دنیا سے کوئی چیز، یہاں تک کہ عبرت تک بھی نہیں لینی چاہیے۔ وارستگی اور آزادگی کی تعلیم دی ہے۔

شعر۔۸ شاعر کہتا ہے کہ آزادگی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تم اس کے عذر سے ہر شخص سے تعلقات قطع کر کے ان سے بیگانگی برتنے اور وحشت کرنے لگو کہ میں آزاد ہوں اور اسی وجہ سے ایسا کرتا ہوں۔ تمھارا یہ عذر ٹھیک نہیں کیونکہ اگر تم کو وحشت اور بیگانگی کرنی ہو تو تم اپنے ہی ساتھ کرو، نہ کہ دوسروں کے ساتھ۔

شعر۔۹ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اپنی تمام عمر عبادت ہی میں کیوں نہ کٹی ہو، لیکن تب بھی عمر تمام ہونے کا غم ضرور ہوتا ہے۔

نظامی صاحب اس کے معنی یوں بیان فرماتے ہیں ''عبادت کا جو نتیجہ ہے، اس سے کچھ اور بڑھ کر بھی انسان حاصل کر سکتا ہے۔ پھر محض عبادت میں اگر زندگی صَرف کر دی جاوے تو اس کا غم دل سے کیونکہ جا سکتا ہے۔'' طباطبائی صاحب کے ہم خیال ہیں، لیکن الفاظِ شعر سے یہ معنی برَزَ ترشح نہیں ہوتے۔ شعر نہایت صاف اور سیدھا ہے۔

شعر۔۱۰ فتنہ خو: جس کی عادت فتنہ کرنے کی ہو۔ شاعر کہتا ہے کہ خواہ ہمارے سر پر قیامت ہی کیوں نہ گزر جائے لیکن ہم پھر بھی اب اس فتنہ خو کے در سے نہیں اٹھیں گے۔ ''سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو'' کے استعمال میں ایک خاص خوبی ہے اور اس کی وجہ سے شعر میں ایک عجیب لطافت پیدا ہو گئی ہے۔ اس سے ایک تو یہ معنی نکلتے ہیں کہ قیامت تک آستان یار پر بیٹھے رہیں گے اور قیامت کو بھی جبکہ مردے تک بھی زندہ ہو ہو کر اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے، ہم وہاں سے نہیں ہٹیں گے اور دوسرے ''سر پہ قیامت گزرنے'' کے معنی یہ بھی ہیں کہ کسی بڑی آفت و مصیبت اور ظلم و تعدی میں گرفتار ہونا، یعنی ہم کو کیسے ہی مصائب و بلیاء کا سامنا کرنا پڑے اور ہم پر کیسے ہی مظالم کیوں نہ گزریں، ہم آستان یار سے ہرگز اٹھنے والے نہیں۔

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو   مرا ہونا بُرا کیا ہے نواسنجانِ گلشن کو
نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے   نہ دی ہوتی، خدایا! آرزوے دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اِک آنسو، اُس جراحت پر   کیا سینے میں جس نے خونچکاں، مژگانِ سوزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں   کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو
ابھی ہم قتلگہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں   نہیں دیکھا شناور جوے خوں میں تیرے توسن کو
ہوا چرچا جو میرے پانْو کی زنجیر بننے کا   کیا بیتاب کاں میں جُنبشِ جوہر نے آہن کو
خوشی کیا، کھیت پر میرے، اگر سو بار ابر آوے   سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برق خرمن کو
وفاداری بہ شرطِ اُستواری، اصلِ ایماں ہے   مَرے بُت خانے میں، تو کعبے میں گاڑو برہمن کو
شہادت تھی مری قسمت میں، جو دی تھی یہ خُو مجھ کو   جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو
نہ لُٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا   رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو
سخن کیا کہہ نہیں سکتے، کہ جویا ہوں جواہر کے   جگر کیا ہم نہیں رکھتے، کہ کھودیں جا کے معدن کو

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب!
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

شعر۔۱ شیون: نالہ و فریاد یعنی میری باغ میں موجودگی سے آخر نواسنجانِ گلشن کا نقصان کیا ہے۔ اگر وہ میرے نالوں کو اچھا نہیں سمجھتے تو کوئی بات نہیں کہ میں تو ایک اسیر قفس ہوں۔ اسی میں پڑا ہوا نالہ کیا کرتا ہوں۔ اس لیے ان سے چمن (کی زادی و خوشی) کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ اگر سچ پوچھو تو ان سے چمن کی کچھ نہ کچھ رونق ہی ہے۔

شعر۔۲ ہمدمی: دوستی۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نے یہ مانا کہ رقیب کی میرے محبوب کے ساتھ دوستی ہونا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میرے لیے یہ رشک کیا کم ہے کہ میرے رقیب کو میرے دوست کی آرزو ہے۔ اے خدا تو نے رقیب کو میرے دوست کی آرزو بھی نہ دی ہوتی (تو بہت اچھا تھا)

شعر۔۳ سینے سے مراد فعل 'سینا' ہے۔ سوزن: سوئی۔ مطلب صاف ہے۔ یعنی اے معشوق تو کیسا سخت دل اور بے رحم ہے کہ جس زخم کے سینے سے سوئی کی پلکوں تک سے خون ٹپکنے لگا، اس پر تیری آنکھ سے ایک آنسو تک نہ نکلا۔

شعر۔۴ کیا خوب شعر کہا ہے۔ محاورے اور بندش کی جو خوبی ہے وہ معنی کے چند الفاظ میں بیان

نہیں کی جاسکتی۔ مطلب یہ ہے کہ میرے ہاتھ، جو یہ ہر وقت کسی نہ کسی کشاکش (کھینچ تان) میں لگے رہتے ہیں کہ اگر معشوق رخصت ہو رہا ہے تو اس کے دامن کو کھینچ لیتے ہیں اور اگر وہ نہیں ہے تو (غم فراق) میں میرے گریبان کو پھاڑے ڈالتے ہیں، تو اے خدا، ان کو اپنے اس جنون پر کبھی شرم بھی آئے گی یا نہیں؟

شعر۔۵ شناور: تیرتا ہوا۔ جوئے خوں، خون کی ندی (فعل عشاق سے) سوسن: گھوڑا۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔۶ شاعر کہتا ہے کہ میرے جنوں کا یہ مرتبہ ہے کہ لوگوں نے جو میرے پاٹو میں ایک زنجیر بنا کر ڈالنے کا ارادہ کیا تو کان میں لوہا از فرط شوق و بغرض شرف یابی، بیتاب ہونے لگا۔

شعر۔۷ یعنی لوگ جو کہتے ہیں کہ ابر آیا ہے، پانی برسے گا۔ اس لیے خوش ہونا چاہیے کہ خوب غلہ پیدا ہوگا۔ اس کے جواب میں شاعر کہتا ہے کہ اگر اس طرح سو مرتبہ ابر آوے تو بھی مجھ کو خوشی نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ بجلی ابھی سے میرے خرمن کی تاک میں ہے اور اس کو بار بار دیکھ جاتی ہے۔ پھر خوشی ہو تو کیونکر ہو۔ اپنی بدقسمتی اور مخالفت ایام کا اظہار کیا ہے۔ اسی قسم کا اور بھی ایک شعر گزرا ہے:

غالب کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے   خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

شعر۔۸ ”یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بت خانہ میں کاٹ دے اور وہیں مر رہے تو اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو کعبہ میں دفن کیا جائے کیونکہ اس نے وفاداری کا حق پورا پورا ادا کر دیا اور یہی ایمان کی اصل ہے۔“ (یادگار غالب)

شعر۔۹ یعنی مجھ میں جو یہ عادت تھی کہ جہاں کہیں تلوار دیکھی، وہیں اس کے سامنے سر جھکا دیا، اس کا مطلب یہی تھا کہ میری قسمت میں شہادت لکھی تھی۔

شعر۔۱۰ یعنی چونکہ میرا مال و اسباب سب دن کو لُٹ چکا ہے، اس لیے رات کو اب بے خطر ہو کر سکھ کی نیند سوتا ہوں اور رہزن کو دعا دیتا ہوں کہ اس کی وجہ سے چوری کا ڈر اور تحفظ مال کی تشویش جاتی رہی۔

شعر۔۱۱ مطلب یہ ہے کہ جب ہم جگر کاوی کر کے اچھے اچھے مضامین کہہ سکتے ہیں جو جواہر سے کہیں قیمتی ہیں، تو پھر ہم کو کان کھود کر جواہر تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

شعر۔۱۲ چونکہ سلیمان علیہ السلام کا رتبہ سلاطین میں سب سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ آپ جن و انس سب کے بادشاہ تھے اس لیے اپنے ممدوح بادشاہ کو ان کے ساتھ منسوب کر کے فریدوں و جم و کیخسرو و داراب و بہمن جو جو بڑے بادشاہ گزرے ہیں، ان سب پر ترجیح دی ہے۔

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو   رکھتا ہے، ضد سے، کھینچ کے باہر لگن کے پانو
دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پانو   ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو
بھاگے تھے ہم بہت، سو اُسی کی سزا ہے یہ   ہو کر اسیر، دابتے ہیں، راہزن کے پانو
مرہم کی جستجو میں، پھرا ہوں جو دُور دُور   تن سے سوا فگار ہیں، اِس خستہ تن کے پانو
اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ، بعدِ مرگ   ہلتے ہیں خود بخود مرے، اندر کفن کے، پانو
ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ، ہر طرف   اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مُرغِ چمن کے پانو
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں!   دُکھتے ہیں آج، اُس بُتِ نازک بدن کے پانو

غالب! مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

شعر۔۱ دھو کر پینا: عظمت کرنا، اظہار خلوص کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کی میرے ساتھ اس درجہ منافرت و مخالفت بڑھ گئی ہے، اگر میں پینے کو اس کے پانو بھی دھوتا ہوں تو وہ ضد سے ان کو باہر کھینچ لیتا ہے۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار   یا الٰہی یہ ماجرا کیسا ہے

شعر۔۲ کسی کے پانو پڑنا ایک محاورہ ہے جو اکثر کسی کی مصیبت میں اُس سے ہمدردی اور محبت جتلانے کے لیے بولا جاتا ہے کہ ہے ہے میں اس کے پانو پڑوں، اس پر کیا مصیبت آ گئی (اس کے علاوہ اس کے معنی عاجزی دکھلانے کے بھی ہیں)۔ اسی طرح شاعر نے اس شعر میں فرہاد عاشقِ شیریں پر اس کی مصیبت میں یعنی (پیرزن کے دھوکے میں آ کر) سادگی سے جان دینے پر اظہار ہمدردی کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب بادشاہ خسرو کے حسب الارشاد فرہاد نے جوئے شیریں کھود کر اس نے قلعہ تک پہنچا دی تو خسرو کو اس کی فکر ہوئی، کیونکہ وہ فرہاد سے وعدہ کر چکا تھا کہ اگر یہاں

تک نہر لے آیا تو میں شیریں تجھ کو دے دوں گا۔ اس غم میں بادشاہ کو مبتلا دیکھ کر اس کے ایک مصاحب نے اس بات کا بیڑا اٹھایا کہ وہ فرہاد کو مار کر اس کو اس مصیبت سے بچادے گا۔ چنانچہ وہ ایک پیرزن بن کر جنگل میں جا کر، جہاں فرہاد نہر کھودنے میں مشغول تھا، زار زار رونے لگا۔ فرہاد کی اس کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ دریافت کیا کہ ”کیوں روتی ہے۔“ پیرزن اس سوال پر اور رونے لگی۔ فرہاد کے اصرار کرنے سے اس نے بتایا کہ میں اس کی شیریں کی دایہ ہوں اور اس کی اچانک موت کی وجہ سے روتی ہوں۔ فرہاد شیریں کی وفات کی خبر سن کر تاب نہ لا سکا اور اسی تیشہ کو، جس سے وہ نہر کھود رہا تھا، مار کر مر گیا۔

پس شاعر فرہاد کی اس سادگی سے جان دینے پر افسوس کرتا ہے اور پیرزن کو جس کی بدولت یہ سب کچھ ظہور میں آیا، بددعا دیتا ہے کہ اس کے پانو کیوں نہ ٹوٹ گئے تا کہ وہ وہاں تک پہنچ ہی نہ سکتی اور اس کو یہ جھوٹی خبر نہ سنا سکتی۔

شعر۔۳ مطلب یہ ہے کہ جس چیز سے ہم بھاگتے ہیں، وہی ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہزار آزادی کی کوشش کی، آخر قید ہو ہی گئے۔

شعر۔۴ یعنی بدن کے زخموں پر لگانے کے لیے مرہم کی تلاش میں گئے تھے کہ پانو میں بدن سے بھی زیادہ زخم ہو گئے۔ یہ شعر بھی قریب قریب گذشتہ شعر کا ہم معنی ہے۔

شعر۔۵ کسی ذوق وشوق کی حالت میں پانو ہلنا خصلت فطری ہے۔ شاعر نے اسی حالت کو اس شعر میں نظم کیا ہے۔

شعر۔۶ یعنی اس مرتبہ اس زور وشور ہی بہار آئی ہے، اس افراط سے پھول کھلے ہیں اور چمن کثرت نمو سے اس قدر گنجان ہو گیا ہے کہ مرغان چمن کو پرواز کے لیے بھی جگہ نہیں ملتی اور اڑنے میں ان کے جا بجا پانو الجھتے ہیں۔

شعر۔۷ معشوق کی نزاکت اور اپنی بدگمانی بیان کرنے میں انتہا کر دی ہے کہ آج اس بت نازک بدن کے جو پانو دکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ رات کو کہیں کسی کے پاس خواب میں گیا ہے اور یہ پانو کا دُکھنا اسی کی تکان سے ہے۔

شعر۔۸ اس شعر میں صنعت مراعاۃ النظیر ہے۔ اپنے کلام کو مزے دار بتلانے کی غرض سے

بادشاہ کو خسرو شیریں سخن کہا ہے۔

واں اُس کو ہولِ دل ہے، تو یاں میں ہوں شرمسار　　یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تا کہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

شعر۔۱ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو جو ہول دل ہے تو اس سے میں شرمندہ ہوں کیونکہ ایسا نہ ہو کہ اس کی یہ ہول دل میری آہ کی تاثیر سے ہو۔

شعر۔۲ نخچیر: شکار۔ تا کہ بمعنی جب تک کہ، یعنی معشوق کا ذرا ذوق ستم تو ملاحظہ کیجیے کہ جب تک کسی شکار (یعنی عاشق) کی آنکھ کا آئینہ نہ ہو، وہ اپنی صورت ہی نہیں دیکھتا۔

واں پہنچ کر جو غش آتا پیہم ہے ہم کو　　صدرہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو
دل کو میں، اور مجھے دل، محوِ وفا رکھتا ہے　　کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو
ضعف سے، نقشِ پئے مور، ہے طوقِ گردن　　تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو!
جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو　　یہ نگاہِ غلط انداز تو سَم ہے ہم کو
رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں　　نالۂ مُرغِ سحر، تیغِ دودم ہے ہم کو
سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرّر چاہا　　ہنس کے بولے کہ ”ترے سر کی قسم ہے ہم کو“
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ! ولیکن ناچار　　پاسِ بے رونقیِ دیدہ، اہم ہے ہم کو
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو　　ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

قطعہ

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھُلتا، یعنی　　ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر　　عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقّع، غالبؔ!
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

شعر۔۱ پیہم: لگاتار، متواتر۔ صدرہ: سوطرح سے مطلب یہ ہے کہ معشوق کے کوچہ میں پہنچ کر جو مجھ کو بار بار غش آتا ہے: اس کا مطلب یہ ہے کہ میں سوسوطرح سے اپنے قدموں کی زمین بوسی کروں، کیونکہ انھیں کی بدولت مجھ کو کوچۂ محبوب نصیب ہوا۔

شعر۔۲ صاف ہے۔

شعر۔۳ رم: بھاگنا۔ نقش پے مور: چیونٹی کے پانو کا نقش۔ مطلب یہ ہے کہ جب میں اتنا ضعیف ہوں کہ چیونٹی کے پانو کا نقش قدم بھی میرے لیے طوق گردن بن جاتا ہے (یعنی بار معلوم ہوتا ہے) تو پھر تیرے کوچہ سے بھاگنے کی طاقت کہاں۔

شعر۔۴ نگاہ غلط انداز: بھول کر کسی چیز کی طرف دیکھنا۔ سم: زہر۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو تغافل ہی کرنا ہے تو مجھ کو اپنا عاشق جان کر کرو، کیونکہ اس صورت تو ایک قسم کا التفات پنہاں ہے۔ اس لیے مجھ کو تمھارے رحم آجانے کی کچھ امید بھی ہوسکتی ہے، ورنہ تمھاری یہ نگاہ ناآشنایانہ تو میرے واسطے زہر قاتل ہے۔

شعر۔۵ تیغ دودم: وہ تلوار کہ جس کی دونوں طرف دھار ہو۔ مصرعہ اول میں 'ہم طرحی' اور ''دردِ اثر بانگ حزیں، دونوں لفظ رشک کے مضاف ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مرغ سحر کا نالہ میرے واسطے تیغ دودم ہے کیونکہ اس سے مجھ کو دو رشک پیدا ہوتے ہیں۔ ایک رشک تو ہمطرحی کا یعنی جیسا کہ میرا نالہ ہے، ویسا ہی اس کا ہے اور دوسرا دردِ اثر بانگ حزیں کا جیسا کہ میری غمگین آواز میں درد پیدا کرنے کا اثر ہے، ویسا ہی اثر اس کی آواز میں ہے۔ اس شعر میں شاعر نے اپنے رشک کو انتہائی غلو کے ساتھ بیان کیا ہے۔ عاشق و معشوق کا رشک تو الگ رہا، اس کو تو صرف اشتراک محبت ہی موجب رشک ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کے ساتھ کیوں محبت کرے اور کسی کی آواز میں کیوں سوز و گداز ہو۔

شعر۔۶ ''اس شعر میں تیرے سر کی قسم ہے ہم کو، اس جملہ کے دو معنی ہیں ایک یہ ہے کہ تیرے سر کی قسم ہے، ہم ضرور اڑائیں گے اور دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اڑائیں گے، جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے یاں کھانے کی قسم ہے یعنی کبھی ہمارے یاں کھانا نہیں کھاتے۔'' (یادگار غالب)

شعر۔۷ مطلب یہ ہے کہ دل کے خون کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ بغیر خونفشانی کے آنکھیں بے رونق رہتی ہیں، جن کی بے رونقی مجھ کو گوارا نہیں۔

شعر۔۸ مطلب یہ ہے کہ ہم ایسے عاجز و ناتواں ہیں کہ تمھارا تغافل کرنا ہی یعنی ظلم و ستم سے ہاتھ اٹھانا ہی ہمارے واسطے ایک ستم ہے اور تم ایسے نازک ہو کہ اگر ہم خاموش بھی رہتے ہیں تو تم اس کو بھی فریاد قرار دیتے ہو۔

آئندہ تینوں شعر قطعہ بند ہیں۔ ان میں مرزا صاحب نے اپنی تمنائے حج کا اظہار کیا ہے۔

شعر۔۹ یہ نہیں معلوم کہ آخر ہمارے لکھنؤ آنے کا باعث کیا ہے۔ اگر لوگ یہ کہیں کہ ہم محض سیر و تفریح کی غرض سے آئے ہیں، تو یہ غلط ہے کیونکہ ہم کو سیر و تماشہ کا شوق نہیں ہے۔

شعر۔۱۰ یعنی لکھنؤ پہنچ کر ہمارے عزم و شوق کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ ہمارا نصب العین محض لکھنؤ نہیں، بلکہ سیر نجف شریف اور طواف حرم کعبہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔

شعر۔۱۱ 'لفظ کرم' کے کاف کے مرکز کو جادۂ راہ سے تشبیہ دے کر اپنے آپ کو بادشاہ کے کرم کا مستحق بتایا ہے۔ مصرعہ ثانی کی بندش اور طرز طلب کرم تفریح سے خالی نہیں۔

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم وراہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو، تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتلِ اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بیگنہ کُش و حق ناشناس ہیں؟
مانا کہ تم بشر نہیں، خُرشیدو ماہ ہو
اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کِسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
سُنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست
لیکن خُدا کرے، وہ ترا جلوہ گاہ ہو
غالبؔ بھی گر نہ ہو، تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دُنیا ہو، یارب! اور مِرا بادشاہ ہو

شعر۔۱ یعنی تمھاری جو غیر سے رسم وراہ ہے مجھ کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ تم جانو تمھارا کام جانے۔ لیکن اتنی گذارش ضرور ہے کہ غیر کے ساتھ ساتھ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کوئی حرج نہیں۔

شعر۔۲ مواخذہ: گرفت، پرسش۔ مطلب یہ کہ حشر کے روز تم میرے قتل کی باز پرس سے بچ نہیں سکتے کیونکہ اگر چہ قاتل رقیب ہی ہے لیکن بنا تو تم ہو۔ اس لیے ضرور شہادت میں پکڑے جاؤ گے۔

شعر۔۳ مطلب یہ ہے کہ آپ جو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں آدمی مت کہو ہم آدمی نہیں ہیں بلکہ خورشید و ماہ ہیں تو ہم نے مانا کہ آپ ضرور ایسے ہی ہیں۔ لیکن اس کا آپ کے پاس کیا جواب ہے کہ خورشید و ماہ تو آپ جیسے بے گناہ کش اور ناحق شناس نہیں۔

شعر۔۴ اپنی کمال بدگمانی کا اظہار کیا ہے کہتے ہیں کہ اس کی نقاب میں جو ایک تار ابھرا ہوا ہے تو مجھ کو یہ خوف ہے کہ وہ کہیں کسی کی نگاہ (کا تار) نہ ہو۔

شعر۔۵ ”اس شعر میں از راہ تہذیب اس کام کا ذکر نہیں کیا، جس کے کرنے کے لیے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا، جب وہی چھُٹ گیا، اب مسجد میں مل جاوے تو اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آ جائے تو سب جگہ پی لینا برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص از راہ شوخی کے کی گئی ہے۔ یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لایق نہیں، وہاں بھی میکدہ چھُٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا، عین مقتضائے بلاغت ہے۔“ (یادگار غالب)

شعر۔۶ یعنی ہم کو تو بہشت کا صرف اس وجہ سے اشتیاق ہے کہ وہاں تیرے جلوے کی امید ہے۔ یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

شعر۔۷ یعنی میری عمر بادشاہ پر قربان ہے۔

گئی وہ بات کہ، ہو گفتگو، تو کیوں کر ہو!
کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیوں کر ہو!
ہمارے ذہن میں اِس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو، تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو!
اِدب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو، تو کیوں کر ہو!
تمھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بُتوں کی ہو اگر ایسی ہی خُو، تو کیوں کر ہو!
اُلجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو، تو کیوں کر ہو!
جسے نصیب ہو، روزِ سیاہ، میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو، تو کیوں کر ہو!

ہمیں پھر اُن سے اُمید، اور اُنھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وو، تو کیوں کر ہو!
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گُماں تسلّی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو، تو کیوں کر ہو!
بتاؤ، اُس مژہ کو دیکھ کر ہو مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیوں کر ہو!
مجھے جنوں نہیں غالب و لے بقول حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو!

شعر۔۱ پہلے تو یہ فکر تھی کہ کسی طرح سے اس سے گفتگو کا موقع مل جاوے کیونکہ یہ امید تھی کہ اگر ایسا ہو گیا تو کام بن جائے گا۔ مگر اب وہ بات بھی جاتی رہی۔ اس سے سب کچھ کہہ سُن بھی لیا لیکن اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا، اور ہنوز روز اول ہے۔ اب آپ بتلائیے کہ کیا کیا جاوے۔

شعر۔۲ مطلب یہ ہے کہ ہم کو وصال تو میسر نہیں ہوتا لیکن ہم اس فکر ہی میں (یعنی خیال وصال ہی میں) کہ گر وصال نہ ہو گا تو کہاں جائیں گے اور اگر ہو گا تو کیونکر ہو گا، خوش رہتے ہیں اور یہی ہمارے نزدیک وصال ہے۔ ع: دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

شعر۔۳ مطلب یہ ہے کہ مجھ کو تو اس کا پاسِ ادب ہے اور اس کو حیا مانع ہے، تو پھر کام بنے تو کیونکر بنے۔

شعر۔۴ صنم پرست: بتوں کو پوجنے والے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر بتوں کی (معشوقوں کی) تمھاری جیسی عادت ہو تو پھر ان کے پجاریوں (یعنی عشاق) کا کیسے گزارا ہو۔

شعر۔۵ ”اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج، شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا حال کیا حال ہو، اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو۔“ (یادگار غالب)

شعر۔۶ مطلب یہ ہے کہ میرا دن (میری بد نصیبی کی وجہ سے) اتنا تاریک ہے کہ رات بھی اس کے آگے دن معلوم ہوتی ہے۔

شعر۔۷ مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری بات ہی نہ پوچھیں تو پھر ہمیں ان سے امید اور انھیں ہماری قدر کیونکر ہو۔

شعر۔۸ یعنی ہم کو تو یہ خیال تھا کہ اس (معشوق) کے پاس سے خط آنے سے تسلی ہو جائے گی

لیکن اب اگر دیدۂ دیدار جو نہیں مانتی (یعنی بغیر دیکھے تسلی نہیں ہوتی) تو پھر کیا کیا جائے؟

شعر۔۹ کیونکر ہو کا فاعل 'قرار' ہے۔ نیش: تیزی نوک کی، جیسے چھری کی نوک ہوتی ہے، ڈنک مژۂ یار کو نیش سے تشبیہ دی ہے۔ اس شعر کی نثر اس طرح ہوئی۔ ''اس کی مژہ کو دیکھ کر یہ بتاؤ کہ یہ نیش (اگر) رگ و جاں میں فرو ہو تو مجھ کو کیونکر قرار ہو۔''

شعر۔۱۰ مصرعہ ثانی سلطان بہادر شاہ کا ہے: مرزا نے یہ غزل بادشاہ کی فرمایش پر لکھی تھی۔

کِسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فُغاں کیوں ہو!   نہ ہو جب دل ہی سینے میں، تو پھر مُنھ میں زباں کیوں ہو!
وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں   سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ''ہم سے سرگراں کیوں ہو''!
کیا غمخوار نے رُسوا، لگے آگ اِس محبت کو   نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو!
وفا کیسی، کہاں کا عِشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا   تو پھر اے سنگ دل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو!
قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے، نہ ڈر ہمدم!   گِری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو!
یہ کہہ سکتے ہو، ''ہم دل میں نہیں ہیں''، پر یہ بتلاؤ   کہ جب دل میں تمھیں تم ہو، تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو!
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کِس کا ہے   نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو!
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے   ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو!
یہی ہے آزمانا، تو ستانا کِس کو کہتے ہیں   عدو کے ہو لیے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو!
کہا تم نے کہ ''کیوں ہو غیر کے مِلنے میں رُسوائی''   بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو پھر کہیو، کہ ہاں، کیوں ہو!

نِکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو، غالب!
ترے بے مہر کہنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

شعر۔۱ یعنی کسی کو دل دے کر اس کی فریاد کرنا کیا معنی؟ دل دے دیا سو دے دیا۔ جب دل ہی سینہ میں نہیں رہا تو پھر زباں داری کیسی؟ جہاں دل دیا ہے، زبان کو بھی نذر کر دینا چاہیے۔

شعر۔۲ مطلب یہ ہے کہ جب وہ ہی اپنی عادت نہیں چھوڑتے تو پھر ہم بھی اپنی وضع کیوں چھوڑیں اور کیوں ان سے جا کر نادانوں کی طرح پوچھیں کہ ہم سے کیوں خفا ہو۔ ہماری وضع خاموشی ہے۔ اسی پر قانع رہیں گے۔ سبک سر اور سرگراں میں صنعت تضاد ہے۔

شعر۔۳ یعنی میرے غمخوار کی محبت ہی میرے لیے موجب رسوائی ہوئی۔ بس میں ایسی محبت اور

ایسے رازداں سے باز آیا کہ جو تابِ غم نہ لا سکے اور اس طرح باعث بدنامی ہو۔

شعر۔۴ مطلب یہ ہے کہ عاشق کا صلہ اگر یہی سر پھوڑنا ہے، تو معشوق کے سنگِ در کی کیا خصوصیت ہے۔

شعر۔۵ ''اس قدر معانی ان دونوں مصرعوں میں سما گئے ہیں کہ اس کی تفصیل یہاں لطف سے خالی نہیں۔

۱۔ 'ایک طائر چمن اپنے نشیمن سے جدا ہو کر اسیر ہو گیا ہے، اس مضمون پر فقط ایک لفظ 'قفس' اشارہ کرتا ہے۔

۲۔ 'اس نے اپنی آنکھوں سے باغ میں بجلی گرتی ہوئی دیکھی ہے اور قفس میں متردد ہے کہ نجانے میرا آشیاں بچا، یا جل گیا۔ اس تمام معنی پر فقط 'کل' کی لفظ دلالت کرتا ہے۔

۳۔ ''ایک اور طائر جو اس کا ہمصفیر اور ہمدم ہے، وہ سامنے کسی درخت پر آ کر بیٹھا ہے اور اسیر قفس نے اس سے روداد چمن کو دریافت کرنا چاہا ہے، مگر اس سبب سے کہ اسی کا نشیمن جل گیا ہے، طائر ہمصفیر مفصل حال کہتے ہوئے پس و پیش کرتا ہے کہ اس آفت اسیری میں نشیمن کے جلنے کی خبر کیا سناؤں' اس تمام مضمون نے جو دوسرے مصرعہ میں ہے، تمام واقعہ کو کیسا دردناک کر دیا ہے۔ یعنی جس گرفتار قفس پر ایک ایسی تازہ آفت و بلائے آسمانی نازل ہوئی ہے، اس نے کیسا اپنے دل کو سمجھا کر مطمئن کر لیا ہے کہ باغ میں ہزاروں آشیانے ہیں کیا میرے ہی نشیمن پر بجلی گری ہوگی۔ یہ حالت ایسی ہے کہ دیکھنے والوں کا اور سننے والوں کا دل کڑھتا ہے اور ترس آتا ہے اور یہ ترس آ جانا وہی اثر ہے جو شعر نے پیدا کیا ہے۔'' (طباطبائی)

شعر۔۶ مصرعہ اول میں استفہام انکاری ہے۔ یعنی تم یہ نہیں کہہ سکتے ہو کہ ہم دل میں نہیں ہیں۔ پس جب دل میں تم ہی تم ہو تو پھر آنکھوں سے کیوں پوشیدہ ہو۔ اس میں مخاطب معشوق حقیقی ہے۔

شعر۔۷ یعنی جذب دل تم کو اس طرف کھینچتا ہے اور تم اپنے آپ کو اُس طرف کھینچتے ہو اور یہی وجہ کشاکش کی ہے۔ پس ایسی صورت میں جذب دل کا شکوہ کرنا بالکل غلط ہے آپ خود دیکھیے کہ کس کا قصور ہے۔

شعر۔۸ یہ فتنہ یعنی معشوق کا دوست ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارا کسی پر مہربان ہونا اور اس کے ساتھ دوست بننا ہی اس کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے جو آسمان بھی اس کا دشمن ہے۔

شعر۔۹ یعنی جب تم ایک مرتبہ طے کر چکے اور عدو کے ہو لیے تو پھر میرا امتحان کیسا اور کس بات کا؟ یہ تو آزمانا نہیں ہے کہ بلکہ محض ستانا ہے۔

شعر۔ ۱۰ دوسرے مصرعہ میں معشوق کی غلطی کا اظہار ہے۔ یعنی اگر غیر کے ملنے میں رسوائی نہیں ہے تو پھر دنیا میں اور کس چیز میں رسوائی ہے؟

شعر۔۱۱ یعنی تو جو یہ چاہتا ہے کہ طعنہ دے کر اس سے کام نکال لے، ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ وہ تیرے بے مہر کہنے سے کبھی مہربان نہیں ہو سکتا۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر، جہاں کوئی نہ ہو   ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے درو دیوار سا، اک گھر بنایا چاہیے   کوئی ہمسایہ نہ ہو، اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار، تو کوئی نہ ہو تیماردار   اور گر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

شعر۔۱ لفظ اب سے یہ بات نکلتی ہے کہ شاعر کو اس شعر کے کہنے سے پیشتر ہم سخن و ہم زبان اشخاص سے نقصان پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ اس قطعہ میں مرزا صاحب نے اپنی اس بیزاری کا اظہار کیا ہے جو ان کو لوگوں کے منافقانہ رویہ اور جھوٹی ہمدردی سے ہو گئی تھی۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔۲ ہمسایہ و پاسبان سے ملول ہو کر کہتے ہیں کہ کوئی ایسا گھر بنانا چاہیے کہ جس میں نہ در ہو، نہ دیوار کیونکہ ان دونوں چیزوں کے نہ ہونے سے نہ کسی پاسبان کی ضرورت ہوگی اور نہ کوئی پڑوسی ہوگا۔

شعر۔۳ یعنی جن کے ہاتھوں رنج پہنچ چکا ہے، اپنی بیماری میں ان کی تیمارداری اور مر جانے پر ان کی نوحہ خوانی بھی پسند نہیں ہے (کیونکہ یہ سب منافق ہیں)۔

ردیف ہ

از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئینہ   طوطی کو شش جہت سے مُقابل ہے آئینہ

شعر۔۱ طوطی مراد عارف۔ مطلب یہ کہ سورج سے لے کر ذرے تک ہر چیز دل بنی ہوئی ہے اور دل (سے مراد) آئینہ ہے۔ پس جب عارف اس عالم کو دیکھتا ہے تو اس کو گویا ہر سمت آئینہ ہی آئینہ مقابل نظر آتے ہیں اور ان میں صرف اسی ذات واحد کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ حاصل شعر کا محض یہ ہے کہ اگر چشم بصیرت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہستی مطلق کے سوا اور کوئی ہستی نہیں۔

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ   جس کی بہار یہ ہو، پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ
ناچار بیکسی کی بھی حسرت اُٹھایئے
دُشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

شعر۔۱ درودیوار پر سبزہ اسی وقت اُگتا ہے جب کہ وہ ٹوٹی پھوٹی حالت میں پڑے ہوں۔ کوئی ان کا نگراں نہ ہو۔ پس سبزہ اُگنے سے ویرانی ظاہر ہوتی ہے اور چونکہ سبزہ موسم بہار میں اُگتا ہے، اس لیے مرزا صاحب نے درودیوار پر سبزہ اُگنے کو بہار بتلا کر اپنے غم خانہ کی کثرت ویرانی کی تصویر کھینچی ہے کہ جس کی بہار یہ ہو، اُس کی خزاں کیا ہوگی۔

شعر۔۲ کسی مقام کے سفر میں مرزا صاحب کو راستے کی تکلیف اور ہمراہیوں کی بدسلوکی سے سابقہ پڑا تھا، اسی پر یہ شعر کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک تو راستہ ہی دشوار تھا اور اس پر طرہ یہ کہ ہم کو جو ساتھی ملے، وہ بھی ظالم نکلے۔ قطع نظر اس کے ہم اپنے آپ کو بیکس بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ گو وہ ظالم ہی تھے لیکن ہمارے ساتھ تو موجود تھے۔ پس مجبوراً بے کسی کی بھی حسرت دل ہی میں رہی۔

ردیف ی

صد جلوہ رُو بہ رُو ہے، جو مژگاں اُٹھایئے   طاقت کہاں کہ دید کا اِحساں اُٹھایئے
ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق   یعنی ہنوز منّتِ طفلاں اٹھایئے
دیوار، بارِ منّتِ مزدُور سے ہے خم   اے خانماں خراب! نہ احساں اٹھایئے
یا میرے زخمِ رشک کو رُسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اُٹھایئے

شعر۔۱ ''اہل تصوف نے اس راہ کو جو طالب کو مطلوب حقیقی تک پہنچاتی ہے، تین عوالم یا سات واسطوں میں تقسیم کیا ہے۔ ابتدائی عالم، عالم ناصوت ہے۔ اس میں ذہن اسرار ہستی کی عقدہ کشائی کرتا ہے اور عقل راہ معرفت کا راستہ دکھاتی ہے۔ غالب اس عالم ناصوت میں ہیں جبکہ انھوں نے یہ شعر کہا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ اگر نظر اٹھائی جائے تو (خداوند تعالیٰ کا) جلوہ سامنے موجود ہے لیکن ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ اس کو دیکھ سکیں۔

شعر۔۲ براتِ: فرمان، جس کے بموجب خزانہ سے روپیہ ملے۔ مطلب یہ ہے کہ جنوں کا فرمانِ معاش سنگ پر ہے یعنی مجنوں کی معاش سنگِ طفلاں مقرر ہوئی ہے، تو گویا جنوں میں بھی لڑکوں کا احسان اٹھانا پڑے گا (کہ وہ پتھر ماریں)

شعر۔۳ مطلب یہ ہے کہ دیوار کو مزدور نے بنایا ہے، پس وہ اسی احسان کے بار سے ٹیڑھی ہے لہٰذا اے خانماں خراب تو اس سے عبرت حاصل کر اور کسی کا بار احسان نہ اٹھا کیونکہ یہ بوجھ قابل برداشت نہیں۔

شعر۔۴ معشوق، عاشق کے رشک کو خلاف واقعہ ظاہر کر کے اس کو مطمئن کرنا چاہتا ہے لیکن عاشق اس کے تبسم پنہاں سے پھر بدگمان ہوتا ہے کہ اس کی یہ اطمینان دہی تصنع سے خالی نہیں، ورنہ تبسم پنہاں کی کیا وجہ؟ اس لیے وہ اپنے معشوق سے خطاب کرتا ہے کہ تو میرے زخم رشک کو فضول بدنام نہ کر کہ میرا رشک کرنا بالکل فضول ہے، اور تجھ سے ایسی کوئی حرکت نہیں ہوئی جس سے مجھ کو رشک ہونا چاہیے، ورنہ یہ چھپ چھپ کر چپکے چپکے ہنسنا چھوڑ دے کیونکہ اس سے مجھ کو بدگمانی ہوتی ہے۔

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے   بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر   آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
دے داد اے فلک! دلِ حسرت پرست کی   ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے
سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوّری   تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے
مَے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو   اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے
ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا   ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سر، پائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی   رُو، سوے قبلہ وقتِ مُناجات چاہیے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات   عارف ہمیشہ مستِ مَے ذات چاہیے
نشوونما ہے اصل سے، غالبؔ! فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے، جو بات چاہیے

شعر۔۱ خرابات: شراب خانہ۔ بھوں کو محراب مسجد سے اور آنکھ کو میخانہ سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔۲ مکافات: بدلہ۔ یعنی میں جب آپ پر عاشق ہوا تو آپ نے میرے اوپر بیجا ستم کیے۔ اب آپ دوسرے پر عاشق ہوئے ہیں، اس کے ناروا ظلم آپ کو اٹھانے پڑیں گے۔ اس طرح جو ستم مجھ پر کیے تھے، ان کا بدلہ ہو جائے گا۔

شعر۔۳ مافات: جو فوت ہو گیا ہو، جو گزر گیا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اے فلک سینکڑوں حسرتوں کا تو خون ہو چکا، کوئی حسرت تو پوری کر۔

شعر۔۴ مطلب یہ ہے کہ معشوق سے ملاقات کرنے کے واسطے کچھ نہ کچھ فن یا کمال کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہم نے اس سے ملاقات کرنے کے لیے مصوری سیکھ لی ہے تا کہ اس سلسلہ میں وہاں تک پہنچ ہو جائے۔ فرہاد کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اس کو بھی شیریں تک فن مصوری ہی کی بدولت

رسائی ہوئی تھی۔

شعر۔۵ یعنی شراب پینے سے میری غرض مزے اڑانا اور لطف اندوز ہونا نہیں ہے بلکہ میں اس کو صرف اس وجہ سے پیتا ہوں کہ دن ورات بیخود و بیہوش رہوں، تا کہ غم محسوس نہ ہو۔

شعر۔۶ اثبات: ثابت کرنا، وضد نفی۔ یعنی گو کائنات کی شکلیں مختلف ہیں لیکن ہر ایک میں جلوۂ حقیقی موجود ہے۔

شعر۔۷۔۸ یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں۔ ”صوفیہ کے نزدیک کفر بھی مظہر ذات ہے۔ کیونکہ کفر دین کی ضد ہے اور اضداد کا مخزج بھی وہی واجب الوجود ہے۔ پس اگر بیخودی اور استغراق کے وقت سر، پائے خم پر رکھا ہو اور دعا کے وقت منہ قبلہ کی طرف کر لیا جاوے تو کوئی حرج نہیں۔ لہٰذا ابلا پس و پیش پیمانہ صفات الٰہی کی گردش کے مطابق عارف کو ہمیشہ اس کی ذات کی طرف متوجہ رہنا چاہیے۔“ خم اور بیخودی میں رعایت لفظی ہے۔

شعر۔۹ فروع: ٹہنی۔ خاموشی کو اصل اور تمام باتوں کو فروع قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے تمام ٹہنیاں (فروع) جڑ (اصل) ہی سے پیدا ہوتی ہیں، اسی طرح جو بات نکلتی ہے وہ خاموشی ہی سے نکلتی ہے۔ کیونکہ بات کہنے سے پہلے آدمی خاموش ہوتا ہے۔

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی   سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلّف سے   تکلّف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے   مِرے دامِ تمنّا میں ہے اِک صیدِ زبوں وہ بھی
نہ کرتا کاش نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم!   کہ ہوگا باعثِ افزایشِ دردِ دُروں وہ بھی
نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ   مِرے دریاے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی
مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے   لیے بیٹھا ہے اِک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی
مِرے دل میں ہے، غالبؔ! شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے، جو اُس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی

شعر۔۱ اپنے دل کی، خون کے ایک ٹپکتے ہوئے قطرے سے تشبیہ دے کر اس کی لاچاری و

عاجزی کی کیا خوب تصویر کھینچی ہے۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔۲ یعنی اس شوخ سے کچھ دنوں تک میں بناوٹ سے آزردہ رہا کہ شاید میری آزردگی دیکھ کر وہ مہربانی سے پیش آئے، لیکن اب صاف کہنا پڑتا ہے کہ وہ بھی میرا ایک اندازِ جنوں تھا کیونکہ یہ سنگ دل معشوق ایسی باتوں سے کہیں پگھلا کرتے ہیں۔

شعر۔۳ زبوں: بدتر۔ عاجز: بیچارہ۔ تمنا کو دام سے اور خیال مرگ کو صید زبوں سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ منجملہ میری اور دعاؤں کے جو درجہ میں تمنائے موت سے کہیں زیادہ ہیں، ایک تمنائے موت بھی ہے۔ پھر ایسی صورت میں خیال موت سے دل آزردہ کو کب تسکین ہو سکتی ہے۔

شعر۔۴ باعث افزایش درد دروں: دل کے درد کے بڑھانے کا باعث۔ یعنی کاش اگر مجھ کو یہ معلوم ہو جاتا کہ نالہ کرنے سے میرے درد دل میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا تو میں پھر نالہ کیوں کرتا۔

شعر۔۵ برش: کاٹ۔ تلوار کو بر بنائے جوہر، موج سے تشبیہ دی ہے اور اس کو موج خوں اس وجہ سے کہا ہے کہ وہی خون بہانے کا باعث ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو جو اپنی تیغ جفا کی بُرّش پر ناز ہے، تو مقتول عاشق اس سے کہتا ہے کہ آخر آپ کو اس پر اتنا غرور کیوں ہے۔ کیونکہ میری نظر میں تو اس کی حقیقت محض اتنی ہے کہ جہاں میرے دریائے بیتابی میں آلام و شدائد کی اور بہت سی موجیں ہیں، انھیں میں ایک موج خوں یہ بھی ہے۔

شعر۔۶ واژگوں: بدنصیب، نامبارک۔ منحوس۔ ایک دو چار، یعنی سات (آسمان)۔ گردش آسمان نامبارک مشہور ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ساقی گردوں (خدا) سے بھی مے عشرت کی خواہش کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کیونکہ وہ بھی جام واژگوں (ساتوں آسمان) لیے بیٹھا ہے۔

شعر۔۷ اس شعر میں لفظ ’غالب‘ سے دو معنی ہیں۔ ایک تو تخلص اور دوسرے غلبہ پایا ہوا۔ یہ بھی کہوں: یعنی شکوۂ ہجراں۔ وہ بھی کہوں یعنی شوق وصل۔ صنعتِ لف و نشر غیر مرتب ہے۔

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے   تنگ آئے ہیں ہم، ایسے خوشامد طلبوں سے
ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا   یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں، زاہد!   زنہار نہ ہونا طَرَف اِن بے اَدبوں سے

بیداد وفا دیکھ، کہ جاتی رہی آخر   ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

شعر۔۱ یعنی ان معشوقوں کی خوشامد اور دلجوئی کرتے کرتے ہمارا منہ تھک گیا۔ بات تک مشکل سے نکلتی ہے۔ بس ایسے خوشامد طلبوں سے باز آئے۔

شعر۔۲ صہبا: شراب انگوری۔ خم: مٹکا۔ ہے دورِ قدح وجہ پریشانیِ صہبا' اس وجہ سے کہ جو جو شریک دور ہیں، سب پئیں گے اور شراب تقسیم ہو جائے گی (یعنی پریشان ہو جائے گی)، شاعر کہتا ہے کہ اگر سارے خُم کی شراب صرف میں ہی پی لوں تو وہ پریشانی سے بچ جائے گی، کیونکہ اس طریقہ سے وہ ایک ہی جگہ رہے گی (کیا مطلب کی کہی ہے؟)

شعر۔۳ طرف نہ ہونا: منہ نہ لگنا۔ مطلب یہ ہے کہ اے زاہد، یہ جو رند شراب خانہ کے دروازے پر بیٹھے ہیں، یہ بہت ہی بے ادب اور گستاخ ہیں۔ تم ان کے منہ ہرگز نہ لگنا۔

شعر۔۴ جاتی رہی: یعنی جان! مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میری جان کو لبوں سے ربط (تعلق) تھا، یعنی ہمیشہ لبوں پر رہا کرتی تھی۔ لیکن وفا کا ظلم دیکھ کر وہ آخر کار لبوں سے بھی جاتی رہی۔

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا   سُن لیتے ہیں، گو ذِکر ہمارا نہیں کرتے
غالبؔ! ترا احوال سُنا دینگے ہم اُن کو
وہ سُن کے بُلالیں، یہ اِجارا نہیں کرتے

شعر۔۱ شاعر کہتا ہے کہ میرا معشوق کھلم کھلا مجھ سے ناراض نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وہ از خود میرا ذکر نہیں کرتا تو یہ بھی نہیں ہے کہ اگر کوئی میرا ذکر اس کے سامنے چھیڑ دے تو وہ اس کو نہ سنے، بلکہ وہ اس کو سُن ضرور لیتا ہے تاکہ مجھ کو شکایت کرنے کا موقع نہ ملے۔

شعر۔۲ اجارہ: ٹھیکہ۔ ٹھیکہ لینا۔ مطلب صاف ہے۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اِک حسرتِ تعمیر سو ہے

شعر۔۱ مرزا صاحب جب عشق کے ہاتھوں بالکل برباد و مفلس ہو چکے ہیں، اس وقت انھوں

نے یہ شعر لکھا ہے۔ یعنی میرے گھر میں رکھا ہی کیا تھا کہ جو یہ میرا غم اسے غارت کرتا۔ ایک حسرت تعمیر (مکان) تھی، سو اب بھی موجود ہے۔ اس سے پیشتر بھی لکھ چکے ہیں۔

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ   سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

غمِ دُنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی   فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی
کھلیگا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب!   قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے   ولے مشکل ہے حکمت، دل میں سوزِ غم چھپانے کی
اُنھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا   اُٹھے تھے سیرِ گُل کو، دیکھنا شوخی بہانے کی
ہماری سادگی تھی، اِلتفاتِ ناز پر مرنا   ترا آنا، نہ تھا ظالم! مگر تمہید جانے کی
لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی   مری طاقت کہ ضامن تھی بُتوں کے ناز اٹھانے کی
کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ اِبنائے زماں غالبؔ!
بدی کی اس نے، جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

شعر۔۱ "یعنی جب غم دنیا اٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اٹھاتے ہیں۔ آسمان پر نظر جاتی ہے اور چونکہ وہ (بھی تیری طرح) جفا پیشہ ہے، اس لیے اس کو دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے (اور تیرے یاد آنے سے) اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے۔ غرض کہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں۔"

(یادگار غالب)

شعر۔۲ یعنی میرے خط کا مضمون اس پر کس طرح ظاہر ہوگا، کیونکہ اُس نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ جو خط جاتا ہے اُس جلا دیتا ہے اور پڑھتا نہیں۔

شعر۔۳ پرنیاں: ایک باریک ریشمی کپڑا ہوتا ہے (جس میں باریکی کی وجہ سے بہت جلد آگ لگ جاتی ہے)۔ مطلب یہ ہے کہ گو پرنیاں میں آگ کا شعلہ چھپ نہیں سکتا، بلکہ اس میں شعلہ لگتے ہی وہ خود بھڑک اٹھتا ہے۔ لیکن اس میں شعلہ چھپانا پھر بھی سوزِ غم، دل میں چھپانے سے آسان ہے کیونکہ دل پرنیاں سے بھی زیادہ نازک اور آگ پذیر اور سوزِ غم شعلہ سے بھی زیادہ تیز ہے۔

شعر۔۴ شاعر کہتا ہے کہ ذرا میرے معشوق کے بہانہ کی شوخی تو ملاحظہ ہو کہ سیر گل کا بہانہ کر کے

اپنے زخمیوں کو دیکھنے گئے تھے۔ گویا کہ ان کے نزدیک اپنے زخمیوں کا دیکھنا باغ کی سیر ہے۔

شعر۔۵ اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ جب تو میرے پاس آیا تو میں اپنی سادگی سے اس کو تیرا التفات سمجھا اور اس پر مرنے لگا۔ لیکن میں یہ نہ سمجھا تھا کہ تو آتے ہی فوراً چلا جاوے گا۔

شعر۔۶ لکد: لات۔ لکد کوب: لات مارنا۔ شاعر کہتا ہے کہ میری طاقت جو کسی زمانہ میں بتوں کا ناز اٹھایا کرتی تھی، اب اتنی زائل ہوگئی ہے کہ حوادث زمانہ کے تھپیڑوں کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ گویا شاعر کے نزدیک معشوق کا ناز اٹھانا حوادث زمانہ کے برداشت کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔

شعر۔۷ اوضاع جمع وضع کی۔ ابناء جمع ہے ابن کی، بمعنی بیٹا، ساتھی۔ ہم جنس۔ ابنائے زماں: لوگ۔ شاعر لوگوں کی بدسلوکی کی شکایت کرتا ہے کہ اس کو ہمیشہ نیکی کا صلہ بدی ملا۔

حاصلِ سے ہاتھ دھو بیٹھ، اے آرزو خرامی!
دل جوشِ گریہ میں، ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اُس شمع کی طرح سے، جس کو کوئی بُجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں، ہوں داغِ ناتمامی

شعر۔۱ حاصل: محصول۔ ہاتھ دھو بیٹھ یعنی صبر کر، ناامید ہو جا۔ آرزو خرامی: خرام (یعنی ناز کی چال) حسبِ آرزو اسامی: کاشتکار۔ ڈوبی ہوئی آسامی: وہ کاشت کار جو کسی ارضی یا سماوی آفت سے برباد ہو جاوے اور جس سے محصول وصول ہونے کی امید نہ ہو۔

شعر۔۲ میں ہوں داغ ناتمامی، یعنی مجھ کو اپنے ناتمام رہ جانے کا داغ ہے۔

کیا تنگ ہم سِتم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مُور، آسمان ہے

ہے کائنات کو حَرکت تیرے ذوق سے
پَرتو سے آفتاب کے، ذرّے میں جان ہے

حال آنکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مَے کا گمان ہے

کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
بس چُپ رہو، ہمارے بھی مُنھ میں زبان ہے

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مِٹا دیا
کِس سے کہوں کہ داغ، جگر کا نشان ہے

ہے بارے اعتمادِ وفاداری اِس قدر
غالبؔ! ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

شعر۔۱ بیضۂ مور: چیونٹی کا انڈا۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم اس قدر مظلوم وستم زدہ ہیں کہ چیونٹی کا انڈا بھی (جس کی کوئی حقیقت نہیں) ہم پر ظلم کرنے کو آسمان بنا ہوا ہے۔

شعر۔۲ ذرے میں جان ہے: اس لحاظ سے کہ وہ حرکت پذیر ہے۔ مادّہ خود بے جان اور جامد ہے جو چیز مادّہ کو تحریک وجنبش میں لاتی ہے، وہ حرکت ہے۔ مگر حرکت خود اپنی ذات سے آفرینش کی قدرت نہیں رکھتی، جب تک کہ متعین نہ ہو۔ اگر حرکت میں قاعدہ نہ ہوتا تو دنیا عالم فساد سے عالم کون میں نہ آسکتی۔ پس علت العلل وہ ذات یا طاقت ہے جو حرکت کے پس پشت حرکت کو تعین دیتی ہے۔" لہٰذا شاعر کہتا ہے کہ جس طرح سے کہ ذرے کو زندگی (حرکت) آفتاب کے پرتو سے ہے اسی طرح سے تمام کائنات تیرے ہی ذوق سے حرکت پذیر ہے (یعنی اس کی حیات تجھ ہی پر منحصر ہے)

ہے تجلی تری سامان وجود
ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

شعر۔۳ سیلی خارا: پتھر کی چوٹ، مراد حوادث زمانہ کے تھپیڑے۔ شیشہ یعنی شیشۂ دل۔ شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ میرا دل تو مصائب وحوادث زمانہ کے تھپیڑوں کی وجہ سے خون ہو رہا ہے لیکن غافل کو یہی گمان ہے کہ اس شیشہ (دل) میں شراب بھری ہوئی ہے۔ شراب اور خون میں بلحاظ سرخی مناسبت ظاہر ہے۔

شعر۔۴ اہل ہوس: رقیب، اور چونکہ اس کے سینہ میں سوز عشق نہیں ہوتا (کیونکہ اس کی محبت جھوٹی ہوتی ہے) اس لیے اس کے سینہ کو ٹھنڈا مکان کہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ معشوق، رقیب کے سینہ میں جگہ گرم کیوں نہ کرے (اس کا سینہ) ٹھنڈا مکان ہے، اس لیے اس کو مرغوب ہے۔

شعر۔۵ "ہمارے بھی منہ میں زبان ہے۔ اس میں دو معنی رکھے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو قائل کر دیں گے اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا یا نہیں۔" (یادگار غالب)

شعر۔۶ کشور: اقلیم۔ سلطنت

شعر۔۷ یعنی میرے سوزِ غم نے میرے جگر کر بالکل جلا دیا۔ اس کا نشان محض ایک سیاہ داغ رہ گیا ہے جو جگرداری کے ثبوت کے واسطے کافی نہیں۔

شعر۔۸ یعنی معشوق جو ہم سے نامہربان ہے تو ہم اس بات سے بہت خوش ہیں کیونکہ اس کی نامہربانی کے یہ معنی ہیں کہ اس کو میری وفاداری پر پورا پورا اعتماد ہے اور وہ جانتا ہے کہ اگر وہ مجھ پر نامہربانی کرے گا تو میں ترک وفا نہ کروں گا۔

دردسے میرے ہے، تجھ کو بیقراری ہائے ہائے!
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری، ہائے ہائے!
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری، ہائے ہائے!
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟
دُشمنی اپنی تھی، میری دوستداری، ہائے ہائے!
عُمر بھر کا تو نے پیانِ وفا باندھا تو کیا!
عُمر کو بھی تو نہیں ہے پایداری، ہائے ہائے!
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اِسے ناسازگاری، ہائے ہائے!
گُل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہوگیا؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری، ہائے ہائے!
شرمِ رسوائی سے، جا چھپنا نِقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری، ہائے ہائے!
خاک میں ناموسِ پیانِ محبت مِل گئی
اُٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری، ہائے ہائے!
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اِک لگنے نہ پایا زخمِ کاری، ہائے ہائے!
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشِگال
ہے نظر خُو کردۂ اختر شماری، ہائے ہائے!
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل، تِس پر یہ نا امیدواری، ہائے ہائے!
عشق نے پکڑا نہ تھا، غالبؔ! ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا، تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری، ہائے ہائے!

شعر۔۱ یعنی افسوس کہ تو میرے درد کی وجہ سے اس قدر مضطرب و بے چین ہے۔ ہائے اس وقت وہ تیری غفلت شعاری کیا ہوئی۔ عاشق چونکہ اپنے معشوق کی تکلیف کو نہیں دیکھ سکتا اور چاہتا ہے کہ اس کو اس حالت نزع سے خلاصی ہو، تو اس سے کہتا ہے کہ جس طرح سے کہ تم میرے ساتھ ہمیشہ سے غفلت شعاری برتتے آئے ہو، ویسا ہی اس وقت بھی کرو۔ اس وقت میرے درد سے ایسے بے قرار ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ پوری غزل اپنے معشوق کے مرثیہ میں لکھی ہے۔

شعر۔۲ آشوب: گھبراہٹ تکلیف۔ یعنی جب تجھ میں آشوب غم کے برداشت کرنے کی طاقت ہی نہ تھی تو پھر ہائے افسوس، تو نے میری غمگساری ہی کیوں کی؟

شعر۔۳ یعنی جب تجھ میں تاب غم ہی نہ تھی تو پھر میری غمخوارگی کا تجھ کو خیال ہی کیوں پیدا ہوا۔ افسوس ایسی حالت میں تو مجھ سے ہمدردی اور تسلی کرنا صاف اپنے حق میں دشمنی تھی۔ قریب قریب گذشتہ شعر کے ہم معنی ہے۔

شعر۔۴ یعنی گو کہ تو نے مجھ سے عمر بھر باوفا رہنے کا عہد کیا لیکن پھر بھی میرے کس کام کا؟ کیونکہ افسوس عمر کو بھی تو ثبات نہیں ہے۔

شعر۔۵ یعنی چونکہ زندگی نے تجھ سے موافقت نہیں کی، اس لیے میں بھی زندگی سے بیزار ہوں اور اس کی آب و ہوا مجھ کو زہر معلوم ہوتی ہے۔

شعر۔۶ گلفشانی اور لالہ کاری میں رعایت لفظی ہے اور صرف یہی اس شعر میں خوبی ہے۔

شعر۔۷ یعنی معشوق نے میرے ساتھ عمر بھر کے لیے پیمان وفا باندھا لیکن اس شرم سے کہ ایسا نہ ہو کہ یہ راز الفت کھل جائے اور باعث رسوائی ہو، اس نے عالم ہستی کو ہی خیر باد کہہ دیا کہ نہ زندگی ہوگی نہ پیمان رہے گا اور نہ رسوائی ہوگی۔ ہائے اس سے زیادہ الفت کی اور کیا پردہ داری ہوسکتی ہے۔ یہ تمام شعر لفظی رعایت سے پُر ہے جن کے استعمال سے شعر میں یک گونہ لطافت پیدا ہوگئی ہے۔

شعر۔۸ صاف ہے۔

شعر۔۹ تیغ آزما: یعنی معشوق۔ شاعر کہتا ہے کہ میری یہ آرزو تھی کہ معشوق کے ہاتھ سے میرے ایک زخم کاری لگتا۔ لیکن افسوس ہے کہ میری یہ تمنا پوری نہ ہوئی تھی، کہ (اس کے مرجانے کی وجہ سے) اس کا ہاتھ ہی بیکار ہوگیا۔

شعر۔۱۰ یعنی جب کہ مجھ کو فراق محبوب میں نیند نہ آنے کی وجہ سے ستارے گن گن کر رات کاٹنے کی عادت پڑگئی ہے، تو پھر برسات کی یہ اندھیری راتیں کس طرح کٹیں گی (کیوں کہ برسات میں ابر رہنے کی وجہ سے تارے نہیں نکلتے) غائبانہ لہجہ میں اپنے سوز دروں اور شبہائے غم کی خوب تصویر کھینچی ہے۔

شعر۔۱۱ یعنی میرے کان پیام (معشوق) سے اور آنکھیں جمال (معشوق) سے محروم ہیں۔ میں ایک تو دل رکھتا ہوں۔ افسوس کہ وہ بھی اس قدر ناامیدی سے آزردہ ہے۔

شعر۔۱۲ یعنی میرا عشق ابھی درجۂ وحشت کو نہ پہنچا تھا کہ معشوق رخصت ہوا۔ افسوس کہ میرے دل میں جو کچھ ذوق خواری تھا، وہ یوں کا یونہی رہ گیا۔

سرگشتگی میں، عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک، وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سُرورِ تبِ غم کہاں تلک
ہر مُو مرے بدن پہ، زبانِ سپاس ہے
ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے
پی، جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اِس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
ہریک مکان کو ہے مکیں سے شرف، اسدؔ!
مجنوں جو مرگیا ہے، تو جنگل اُداس ہے

شعر۔۱ نوید: خوشخبری۔ یعنی اے تسکین تجھ کو مژدہ ہو کہ ہم نے وادیٔ عشق میں قدم رکھا ہے، اس کی وجہ سے خاتم الحن یعنی موت آجانے کی امید ہے، کیونکہ سرگشتگی وجنون عشق کی حالت میں مرجانا ایک امر مسلمہ ہے۔

شعر۔۲ یعنی معشوق میرے دل کو میرے پاس سمجھ کر مطمئن ہے اور خبر نہیں لیتا حالانکہ وہ دل، جنون عشق میں آوارہ گرد اور سرگشتہ ہو چکا ہے۔

شعر۔۳ مو:- بال۔ یعنی مجھ کو تپ غم میں جو سرور حاصل ہوتا ہے، میں اس کو کہاں تک بیان کروں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ میرے بدن کا رونگٹا رونگٹا زبان پاس بنا ہوا ہے۔ قاعدہ ہے کہ تپ ولرزہ میں رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

شعر۔۴ یعنی میرا حق شناس دل (جو کہ حق وفا کو خوب پہچانتا ہے) اس کے پاس موجود ہے لیکن وہ اس کی وفاداری کی داد نہیں دیتا بلکہ اپنے غرور حسن کی وجہ سے اس سے بالکل بیگانہ رہتا ہے۔

شعر۔۵ بلغمی مزاج مرطوب ہوتا ہے اور شب مہتاب کے مزاج کو بھی مرطوب کہتے ہیں۔ اسی رعایت سے شب مہتاب کے ساتھ بلغمی مزاج لایا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ چاندنی رات میں خوب شراب پینی چاہیے کیونکہ اس کا مزاج بلغمی ہے، لہٰذا شراب (جو گرم ہے) مصلح ہے۔

شعر۔۶ مکیں: مکان میں رہنے والا۔ یعنی چونکہ ہر مکان کی عظمت اس کے مکیں سے ہے، اس لیے جنگل اپنے مکینِ باوقار یعنی مجنوں کے مرنے سے اُداس ہے۔

گر خامُشی سے فائدہ اِخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
کِس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
دل، فردِ جمع وخرجِ زباں ہائے لال ہے
کِس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا!
رحمت، کہ عذر خواہِ لبِ بے سوال ہے
ہے ہے، خدانخواستہ، وہ اور دشمنی!
اے شوق! منفعِل، یہ تجھے کیا خیال ہے
مشکیں لباسِ کعبہ، علیؑ کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے، نہ کہ نافِ غزال ہے
وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا، زمین کو عَرَقِ انفعال ہے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسدؔ!
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

شعر۔۱ یعنی اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ حال دل ظاہر نہیں ہوتا، تو میں خوش ہوں کہ میرا بولنا بھی خاموشی ہی کا فائدہ دیتا ہے، کیونکہ میرا کلام کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔"

کنایہ اس میں یہ ہے کہ میں اسرار بیان کرتا ہوں جنھیں لوگ سمجھ نہیں سکتے۔

رباعی

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

شعر۔۲ لال: گنگ، گونگا۔ اس شعر کے معنی کے متعلق شارحین کی مختلف رائیں ہیں۔ ہمارے نزدیک حسرت صاحب کے معنی سب سے زیادہ قرین قیاس ہیں۔

نظامی صاحب اس کے معنی یوں بیان فرماتے ہیں" شاعر کہتا ہے کہ میں اپنے بیان کی حسرت کا شکوہ کس کے سامنے کروں۔ میرا دل گونگی زبانوں کے جمع وخرچ کی فرد یعنی ان احباب

کے شکوہ کا دفتر بنا ہوا ہے جو نہ سنتے ہیں، نہ جواب دیتے ہیں۔"

حسرت صاحب لکھتے ہیں کہ "ہزاروں حسرتیں ایسی تھیں جن کے اظہار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ بس گویا کہ ہمارا دل زبانِ نہائے لال کی فرد جمع و خرچ ہے۔ یعنی شکوہ کا ایک دفتر ہے۔"

طباطبائی صاحب اس کی شرح یوں لکھتے ہیں "حسرت اظہار زبان کے گویا نہ ہونے سے گلہ مند ہے۔ کس کے آگے اس گلہ کو بیان کروں، اور فرد جمع و خرچ سے طومار شکایت مراد ہے۔ یعنی اظہار شوق زبان سے نہ ہوگا تو دل میں زبان کی شکایتیں بھری ہوئی ہیں۔ شاعر نے زبان کو جمع اس اعتبار سے کہا ہے کہ بہت سے موقعوں پر زبان نے اظہار شوق میں کوتاہی کی ہے اور ممکن ہے کہ احباب کی زبانیں مراد لیں۔"

شعر۔۳ آئینہ پرداز: مصروف آرائش۔ اس شعر کی ترکیب ذرا دشوار ہے۔ اس کی نثر یوں ہوئی "اے خدا! رحمت (جو) کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے کس پردے میں آئینہ پرداز ہے" مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خاموش اور راضی برضائے الٰہی ہیں، اے خدا ان پر رحمت نازل ہونے میں کیا دیر ہے؟

شعر۔۴ منفعل: شرمندہ ہونا۔ شاعر اپنے شوق کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ "اے شوق تجھ کو یہ غلط خیال پیدا ہوا ہے کہ وہ دشمنی کرے گا۔ تو اپنے اس نازیبا خیال پر نادم ہو۔ خدانخواستہ وہ اور دشمنی کرے۔ نہیں وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔"

شعر۔۵ غزال: ہرن کا بچہ، ہرن۔ ناف: کستوری کی تھیلی جو ہرن سے نکلتی ہے۔ لباس کعبہ کو مشکیں، اس کے غلاف سیاہ کی وجہ سے کہا ہے اور اس میں یہ رعایت بھی ہے کہ جس طرح مشک کی خوشبو پھیل جاتی ہے، اسی طرح کعبہ کی (برکت) دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں مشکیں کی رعایت سے ناف غزال کہا گیا ہے۔ نافِ زمین: وسط زمین۔ مطلب یہ ہے کہ کعبہ کی خوشبو (برکت) جو مشک کی طرح دنیا میں پھیل رہی ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس میں پیدا ہوئے ہیں، ورنہ کعبہ نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال، جو اس کی اس طرح خوشبو پھیلتی۔ آپ کے قدم مبارک نے ہی اس کو نافہ غزال بنا رکھا ہے۔ تحقیقات جدید سے ثابت ہوا ہے کہ کسی زمانہ میں ممالک شمالی منطقہ حارہ میں تھے کیونکہ وہاں ایسے جانوروں کی ہڈیاں پائی گئی ہیں جو گرم ممالک کے سوا کہیں نہیں رہ سکتے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کعبہ کا کسی زمانہ

میں خط استوا (وسط زمین پر) ہونا بعید الفہم نہیں معلوم ہوتا۔

شعر۔۶ شاعر کہتا ہے کہ میری وحشت کے لیے زمین باوجود اپنی وسعت کے تنگ ثابت ہوئی، اس لیے وہ اس شرم سے پسینہ پسینہ ہو رہی ہے، اور یہ جو ہم دریا و سمندر دیکھتے ہیں، اسی کا عرق انفعال ہیں۔

شعر۔۷ کرۂ زمین کو حلقۂ دامِ خیال سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے اسدؔ تو ہستی کے دھوکے میں نہ آجائیو۔ ہرگز اس پر بھروسہ مت کرنا۔ یہ تمام عالم محض خیالی و بے بود ہے۔ ہستی کی کوئی اصل نہیں:

ہائے کھائیو مت فریب ہستی   ہرچند کہیں کہ ہے نہیں، ہے

ایک جگہ اور فرماتے ہیں:

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور   جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو   حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
دلا! یہ درد و الم بھی تو مُغتنم ہے، کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی ہے

شعر۔۱ کھود کھود کر: یعنی بہ تجسس۔ اپنے شکوہ ہائے پُرسوز کو آگ سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے شکوے کی باتیں زیادہ کھود کھود کر نہ پوچھو۔ اور میرے دل سے ڈرو کیونکہ اس میں آگ دبی ہوئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کریدنے سے وہ بھڑک اٹھے۔

شعر۔۲ مغتنم: غنیمت۔ یعنی اے دل تو درد و الم ہی کو غنیمت سمجھ کیونکہ یہ بھی چند روزہ ہے۔ بالآخر کچھ بھی نہ رہے گا۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے   بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، وہ بھی مٹ گیا   ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر، نہ کیوں!   ہم نہیں جلتے، نفَس ہر چند آتش بار ہے

آگ سے، پانی میں بُجھتے وقت اُٹھتی ہے صَدا ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے
ہے وہی بدمستیِ ہر ذرّہ کا خود عُذر خواہ جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے
مجھ سے مت کہہ، تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی زندگی سے بھی مِرا جی اِن دنوں بیزار ہے
آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے، کہ تا تجھ پہ کُھل جاوے کہ اِس کو حسرتِ دیدار ہے

شعر۔۱ ’’غلط بردار اس کاغذ کو کہتے ہیں جس پر سے حرف بآسانی کذلک وغیرہ سے اڑ سکے اور کاغذ پر اس کا نشان باقی نہ رہے۔ مگر یہاں از راہ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لیے ہیں جس پر سے حرف غلط خود بخود اڑ جائے۔ کہتا ہے کہ تو نے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرف وفا لکھا تھا۔ سو وہ بھی مٹ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خط کا کاغذ غلط بردار ہے کہ جو بات سچے دل سے اس پر نہیں لکھی جاتی ہے، وہ خود بخود مٹ جاتی ہے۔‘‘ (یادگار غالب)

شعر۔۲ آدمی کے سینہ میں جو شعلۂ روح روشن ہے، اس کو ہر سانس جو اندر جاتا ہے، مشتعل کرتا ہے اور اسی اشتعال کی بنا پر انسان زندہ ہے۔ علاوہ ازیں (اس سانس کے) ہر اشتعال میں کچھ نہ کچھ بدن کا ہیزم فنا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جو چیز کہ باعث حیات ہے، وہی ساتھ کے ساتھ کچھ نہ کچھ جزو فنا بھی کرتی جاتی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ انسان (بلکہ ہر ذی روح) کو طبعاً و فطرتاً ذوق فنا ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ مجھ کو اپنے ذوق فنا کی ناتمامی پر افسوس ہوتا ہے کہ باوجودیکہ نفس آتش بار ہے لیکن پھر بھی ہم جان کر فنا نہیں ہو جاتے۔

شعر۔۳ نالہ سے ناچار ہے: یعنی نالہ کرنے پر مجبور ہے۔ آگ کے پانی میں بجھنے کو اس کی درماندگی اور بجھتے وقت جو آواز اٹھتی ہے اس کو اس کا نالہ کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آگ جیسی چیز بھی جس کی خاموشی مسلّم ہے، درماندگی میں (بجھتے وقت) چیخ اٹھتی ہے اور یہ (اپنی مثال پیش کر کے) بہ زبان حال کہہ رہی ہے کہ ہر شخص اپنی درماندگی میں نالہ کرنے پر مجبور ہے۔

ڈاکٹر مرحوم لکھتے ہیں: ’’کس شاعر نے آج تک آتش کے فرو ہونے کی اس ظاہر و ادنیٰ کیفیت کو مشاہدہ اور محسوس کیا ہے؟ لفظ ہر کوئی میں آگ کے طبعاً مغرور اور سرکش ہونے کا اشارہ نہایت خوبی سے مضمر ہے۔

شعر۔۴ ’’ہر ذرہ یعنی ہر مخلوق۔ عذر خواہ یعنی معافی چاہنے والا یا عذر رکھنے والا۔ اس شعر میں دعویٰ ایسے طریقہ سے کیا گیا ہے کہ خود دعویٰ متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذرات عالم یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں، ان کی بدمستی اور غفلت کا عذر خواہ وہی ہے جس کے پرتوِ وجود سے یہ تمام معدومات، وجود کا دم بھرتے ہیں۔‘‘ (یادگار غالب)

شعر۔۵ ’’تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی۔‘‘ یہ جملہ معشوق کا ہے جو اس نے عاشق کے سنانے کے لیے کہا ہے۔ معشوق عاشق سے کہتا ہے کہ تم تو ہم کو اپنی زندگی بتلاتے تھے، پھر کیوں خفا ہو۔ اس پر عاشق جواب دیتا ہے کہ یہ نہ کہہ، کیونکہ آج کل میرا دل تو زندگی سے بھی بیزار ہے۔ اس لیے تو اگر زندگی بھی ہو تب بھی میں مائل نہیں ہو سکتا۔

شعر۔۶ سرنامہ: لفافہ پر جو پتہ اور نشان مکتوب الیہ کا لکھتے ہیں۔ مجاز الفافہ۔ کھل جائے: ظاہر ہو جائے۔ باقی مطلب صاف ہے۔

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

شعر۔۱ یعنی اُن کو مجھ سے اتنی بیزاری ہے کہ اگر قضارا اُن کا میرے کوچہ کی طرف گزر بھی ہوتا ہے تو نہایت سُرعت کے ساتھ سیدھے نکلے چلے جاتے ہیں۔

مری ہستی، فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے جسے کہتے ہیں نالہ، وہ اِسی عالَم کا عَنقا ہے
خزاں کیا، فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
وفائے دِلبراں ہے اتفاقی، ورنہ، اے ہمدم! اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کِس نے دیکھا ہے!
نہ لائی شوخیِ اندیشہ تاب، رنجِ نومیدی کفِ افسوس ملنا، عہدِ تجدیدِ تمنّا ہے

شعر۔۱ فضا: صحن خانہ، میدان۔ اپنی ہستی کو حیرت آباد تمنا کی فضا سے تشبیہ دی ہے۔ عنقا: ایک معدوم پرندہ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنی تمنا میں بالکل متحیر اور مبہوت ہو گیا ہوں اور (چونکہ متحیر اور مبہوت آدمی کے منہ سے آواز نہیں نکلتی) اس لیے میرا نالہ اسی عالم کا عنقا ہے یعنی حیرت کی وجہ سے نالہ بھی منہ سے نہیں نکلتا۔

شعر۔۲ یعنی ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں۔

شعر۔۳ حزیں: غمگین۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کا باوفا ہونا محض ایک امر اتفاقیہ ہے۔ ورنہ ان پر فریاد دلہائے حزیں کا کب اثر ہوتا ہے؟

شعر۔۴ تجدید: نیا کرنا، نئے سرے سے کوئی کام کرنا۔ عہد باندھتے وقت ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہیں۔ بس شاعر کہتا ہے کہ میری شوخی، اندیشۂ ناامیدی اور مایوسی کا صدمہ نہیں اٹھا سکی، اس لیے ناامیدی کی وجہ سے جو اس نے کفِ افسوس ملا تھا، وہ تجدید تمنا کا پیمان ہو گیا۔ یعنی جس کا افسوس کیا تھا پھر اسی کی تمنا کی۔ انتہائی بوالہوسی کی طرف اشارہ ہے۔

رحم کر، ظالم! کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے   نبضِ بیمارِ وفا دُودِ چراغِ کشتہ ہے
دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سُودِ چراغِ کشتہ ہے

شعر۔۱ بود: ہستی۔ پہلے مصرعہ میں چراغ کشتہ استعارہ ہے بیمار وفا سے اور دوسرے مصرعہ میں معنی حقیقی میں مستعمل ہے۔ اصطلاح طب میں مرتے وقت کی نبض کو دودی کہتے ہیں۔ شاعر معشوق سے خطاب کرتا ہے کہ اے ظالم اب تو اپنے بیمار وفا پر رحم کر۔ کیونکہ وہ قریب المرگ ہے اور اس کی نبض بجھے ہوئے چراغ کے دھوئیں کی طرح یعنی ذرا سی دیر میں ختم ہو جانے والی ہے۔

شعر۔۲ بے رونقی سود چراغ کشتہ ہے: کیونکہ جب تک چراغ خاموش رہتا ہے، اس وقت تک تیل صَرف نہیں ہوتا۔ اس لیے بے رونقی یعنی چراغ کی خاموشی میں فائدہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا دل جو شعلۂ عشق ہونے کی وجہ سے بے رونق ہے، تو اگرچہ اس بے رونقی میں اس کا فائدہ ہے لیکن وہ دل لگی کی خواہش کی وجہ سے بے چین ہے کہ شاید اس میں ہی (یعنی رونق شعلہ و عشق میں ہی) کوئی دل لگی کا سامان نکل آئے۔

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے   سُرمہ، تو کہوے کہ دودِ شُعلۂ آواز ہے
پیکرِ عُشّاق، سازِ طالعِ ناساز ہے   نالہ، گویا گردشِ سیّارہ کی آواز ہے

دست گاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا   یک بیاباں جلوۂ گُل، فرشِ پا انداز ہے

شعر۔۱ تو کہوے: ترجمہ ہے تو گوئی کا؟ نوا پرداز: سخن گو۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کی آنکھیں خاموشی کی حالت میں بھی نوا پرداز ہیں جیسا کہ سرمہ سے ثابت ہے جو کہ شعلۂ آواز کا دھواں ہے۔

شعر۔۲ پیکر: جسم۔ سیارہ: مراد سیارۂ بدبختی۔ نالہ و فریاد اور بدبختی کی بنا پر جسم عشاق کو طالع ناساز کا ساز (باجا) کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشاق کا جسم بدنصیبی کا ساز بنا ہوا ہے اور اس کی آواز (نالہ) گویا دراصل گردش سیاہ بدبختی کی آواز ہے۔

شعر۔۳ دستگاہ: قدرت۔ یک بیاباں بمعنی کثرت۔ پا انداز: وہ بچھونا جو آمد و رفت کی جگہ دروازہ پر بچھا دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مجنوں کی دیدۂ خونفشاں سے اتنا خون بہا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فرش پا انداز، گویا گل ہی گل سے بنا ہوا ہے۔ دستگاہ اور پا انداز میں رعایت لفظی ہے۔

عِشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی   میری وحشت، تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ، تعلّق ہم سے   کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں، ہے کیا رُسوائی؟   اے، وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی
ہم بھی دُشمن تو نہیں ہیں اپنے!   غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو   آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام   دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں!   نہ سہی عِشق، مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے، اے فلکِ نا انصاف!   آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالینگے   بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے، اسد
گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

شعر۔۱ یعنی اگر میرے عشق سے تم کو بدنامی ہوتی ہے اور اس کو وحشت کہنا تمھارے لیے شہرت و سرخروئی کا باعث ہوتا ہے، تو تم میرے عشق کو وحشت ہی کہو۔ مجھے یہ بھی منظور ہے۔

شعر۔۲ اسی مضمون کا ایک دوسرا شعر بھی ہے:

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہو   کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہو

شعر۔۳ یعنی میرے ہونے سے آخر تمھاری کیا رسوائی ہو سکتی ہے؟ بہر حال اگر تم سب کے سامنے ملنا نہیں چاہتے تو در پردہ ہی سہی۔

شعر۔۴ یعنی جب کہ تجھ کو غیر کی محبت کا یقین ہو گیا تو پھر ہم تجھ سے محبت کر کے فضول اپنے آپ کو تکلیف کیوں پہنچائیں۔

شعر۔۵ ماسوا کی حقیقت سے واقفیت و غفلت کوئی چیز نہیں۔ ضرورت اپنی ہستی سے ہی واقفیت یا غفلت کی ہے۔ اگر اپنی ہستی سے آگاہی حاصل ہو گئی تو معرفت رب بھی حاصل ہو جائے گی، اور اگر اپنی ہستی سے غفلت ہو گئی (یعنی اپنے تئیں قیمت سمجھنے لگے) تو اس صورت میں بھی مشاہدہ حقیقی کے جلوہ سے محروم نہ رہیں گے۔"

(مہدی از رسالہ اردو)

پروفیسر مولوی علی احمد خانصاحب اسیر بدایونی اس کا مطلب اس طرح بیان کرتے ہیں "اپنی ہستی سے آگاہی کا تعلق حدیث نبوی (من عرف نفسه فقد عرف ربه) کے موافق عرفان الٰہی کا زینہ ہے اور اپنی ہستی سے غافل ہونا بھی تمام احادیث اور اقوال صوفیہ کے موافق وحدت ذاتی کا اعلیٰ پایہ ہے۔ جیسے کہ کسی صوفی کا قول ہے: "خودی مٹی جب ملی خدائی، سرسوں پھولی آنکھوں میں" نتیجہ یہ ہے کہ سالک کو ہمیشہ آگاہی اور غفلت کا تعلق اپنی ہستی سے رکھنا چاہیے۔" (از دیوان نظامی)

شعر۔۶ برق خرام: بجلی کی طرح جلد غائب ہو جانے والی۔ فرصت: زمانہ، عرصہ۔ باقی مطلب صاف ہے۔

شعر۔۷ یعنی کیسی ہی تکلیف کیوں نہ ہو، ہم باوقار رہیں گے۔

شعر۔۸ رخصت:- اجازت یعنی اے فلک ناانصاف کچھ تو مجھ کو دے۔ اگر اور کچھ نہیں تو آہ و فریاد کی اجازت ہی سہی۔

شعر۔۹ یعنی ابھی طینت کو بے نیازی کی برداشت نہیں ہے۔ اگر تیری بے نیازی (لاپروائی) ہی کی عادت ہے تو ہم بھی اس کو برداشت کرنے کی عادت ڈالیں گے۔

شعر۔۱۰ حسرت: مراد حسرت وصل کا اظہار۔ مطلب یہ ہے کہ یار کے ساتھ کچھ نہ کچھ چھیڑ ضرور رہنی چاہیے۔ اگر وصل میسر نہ آئے نہ سہی۔ لاؤ اظہار حسرت (وصل) ہی کریں۔

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے   صبحِ وطن، ہے خندۂ دنداں نما مجھے
ڈھونڈے ہے اُس مُغنّی آتش نفس کو جی   جس کی صدا، ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے
مستانہ طے کروں ہوں، رہِ وادیِ خیال   تا بازگشت سے نہ رہے مُدّعا مجھے
کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں   آنے لگی ہے نکہتِ گُل سے حیا مجھے
کھُلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ!   شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

شعر۔۱ آرمیدگی: آرام طلب ہونا۔ نکوہش: سرزنش، ملامت خندۂ صبح، ایک مشہور استعارہ ہے مطلب یہ ہے کہ یہ صبح وطن جو میرے اوپر خنداں ہے تو میں اپنی کاہلی اور آرام طلبی کی وجہ سے واقعی اسی مضحکہ اور سرزنش کے قابل ہوں۔

شعر۔۲ مغنی: گانے والا۔ گویا: ڈوم۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ کو ایک ایسے آتش نفس گویے کی تلاش ہے کہ جس کی آواز (گانے) سے مجھ کو برق فنا کا جلوہ نصیب ہو جائے۔ یعنی جس کے سننے سے وہ عالی درجہ کی کیفیت طاری ہو کہ بس فنا ہی ہو جاؤں۔

شعر۔۳ جب کوئی شخص بے خبری اور استغراق کی حالت میں کسی راستہ کو طے کرتا ہے تو چونکہ اس کو بے خبری کے عالم میں راستہ کے موڑ وغیرہ کی خبر نہیں رہتی، اس لیے اس کا اس راستہ سے واپس آنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ میں وادی خیال (محبوب) کا راستہ مستانہ وار طے کرتا ہوں تا کہ پھر واپس نہ آسکوں، یعنی ہمیشہ خیال معشوق ہی میں مستغرق رہوں۔

شعر۔۴ یعنی تو باغ میں جو بے حجابی کرنے لگا ہے اس لیے مجھ کو پھولوں کی خوشبو سے شرم آنے لگی ہے کہ میں تو اسی کو بے حجاب کہا کرتا تھا۔

شعر۔۵ یعنی میرے انتخاب اشعار نے مجھ کو رسوا کر دیا کیونکہ اس سے لوگ یہ سمجھ گئے کہ یہ شخص عاشق مزاج ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گُزری، غالبؔ!
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خُدا رکھتے تھے

شعر۔ ۱ اس رنگ سے: یعنی بُری طرح سے۔ مطلب صاف ہے۔ اسی خیال کو مرزا صاحب نے تھوڑے تغیر کے ساتھ ایک فارسی شعر میں بھی ادا کیا ہے:

گفتنی نیست کہ بر غالبؔ ناکام چہ رفت
میتواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہُوا کیے
دل ہی تو ہے، سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں، اور جاؤں در سے ترے بِن صدا کیے!
رکھتا پھِروں ہوں خرقہ و سجّادہ رہنِ مَے
مدّت ہوئی ہے، دعوتِ آب و ہوا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہینگے کہ ہم کیا کیا کیے!
مقدور ہو، تو خاک سے پوچھوں کہ، اے لئیم!
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے؟
کِس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کِس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
ضِد کی ہے اور بات، مگر خُو بُری نہیں
بھُولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے
غالبؔ! تمھیں کہو کہ ملیگا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے، اور وہ سُنا کیے

شعر۔ ۱ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ لوگ میرے اوپر اشارے کیا کیے اور آوازیں کستے رہے لیکن میں بے حیا بنا ہوا محفل میں بیٹھا رہا کیونکہ بغیر بے حیا بنے اور کوئی چارہ ٔ کار نہ تھا۔

شعر۔ ۲ سیاست: خوف، دبدبہ مراد سزا۔ مصرعہ ثانی میں لفظ 'میں' کو ذرا زور دے کر پڑھنا چاہیے۔ شاعر اپنے معشوق سے کہتا ہے کہ بھلا یہ کب ممکن تھا کہ میں تیرے دروازے سے بغیر آواز دیے چلا جاتا ہے، لیکن کیا کروں کہ میرا دل ہی دربان کی سزا سے ڈر گیا۔ اس لیے مجبور تھا۔

شعر۔ ۳ خرقہ: پرانا چیتھڑا، فقیروں کا لباس۔ سجادہ: مصلّٰی نماز پڑھنے کا بچھونا، دعوتِ آب و ہوا: یعنی دعوت بہار۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔ ۴ بے صرفہ: بے فائدہ۔ کل: یعنی قیامت۔ ہم کیا کیا کیے یعنی ہم نے کیا کیا۔ مطلب یہ ہے یہ کہ عمر خواہ کتنی ہی دراز ہو (تعلقات دنیا کے جھگڑوں میں منہمک رہنے کی وجہ سے) وہ سب یونہی فضول گزر جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام بھی، جنھوں نے حیات جاوید پائی ہے، کل قیامت کے دن۔ یہی کہیں گے کہ باوجود اتنی عمر کے ہم نے کچھ بھی نہیں کیا۔

شعر۔ ۵ لئیم: ناکس، بخیل: کنجوس، گنجہائے گرانمایہ: بیش قیمت خزانے، مراد وہ لوگ جو دفن ہیں۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔ ۶ تہمت تراشنا: تہمت لگانا۔ یعنی ہم ہمیشہ اپنے اعدا کی تہمتوں اور مظالم کا نشانہ رہے۔

شعر۔ ۷ اس شعر میں شاعر نے دو باتیں دکھلائی ہیں۔ ایک تو فلسفہ کے اس مسئلہ کو قلم بند کیا ہے کہ جن افعال کی کسی شخص کو عادت پڑ جاتی ہے، وہ آئندہ بھی اس سے عمل میں آتے رہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ معشوق کا التفات بھی عاشق کے واسطے رنج سے خالی نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق نے جو عاشق سے شب وصال بے تکلفی برتی، اور بغیر کہے بوسہ دینے لگا تو عاشق کو یہ بدگمانی پیدا ہوئی کہ معشوق کی یہ سب عادت رقیب کی بگاڑی ہوئی ہے۔ اور اس خیال نے اس کی اس ساری خوشی کو مکدر کر دی۔

شعر۔ ۸ کسی نے مرزا صاحب کو سمجھایا ہوگا کہ معشوقوں سے زیادہ دل نہ لگایئے۔ یہ سب بڑے وعدہ خلاف اور بے وفا ہوتے ہیں، تو اس پر اس کو جواب دیتے ہیں کہ ضد کی تو بات دوسری ہے، ورنہ میرے محبوب کی عادت تو بہت اچھی ہے۔ اس نے بھولے سے ہی سینکڑوں وعدے پورے کر دیے۔

شعر۔ ۹ یعنی ہم نے مانا کہ جو کچھ تم نے کہا وہ اس نے سن لیا لیکن تمھیں بتلاؤ کہ جو کچھ تم نے کہا ہے اس کا آخر جواب کیا ہوگا؟ (یعنی جواب ہی نہیں دے گا، یا اگر دے گا تو نفی میں)

رفتارِ عُمر، قطعِ رہِ اِضطراب ہے
اِس سال کے حساب کو برق، آفتاب ہے
مینائے مَے ہے سرو، نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو، جلوۂ موجِ شراب ہے
زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے
جادادِ بادہ نوشی، رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

نظّارہ کیا حریف ہو، اُس برقِ حُسن کا   جوشِ بہار، جلوے کو جس کے نقاب ہے
میں نامراد، دل کی تسلّی کو کیا کروں   مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

گُزرا اسدؔ! مسرّتِ پیغامِ یار سے
قاصِد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

شعر۔١ قطع: طے کرنا۔ راہ اضطراب: وہ راستہ جو حالت اضطراب میں طے ہو۔ سال، مراد سال عمر۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے سال کا حساب گردش آفتاب سے کیا جاتا ہے۔ اسی طرح عمر گریزاں کے سال کا حساب برق کی رفتار سے کرنا چاہیے۔ یعنی یہ کہ انسان کی عمر کی مقدار وفرصت ایک ہی چشمکِ برق کے برابر ہے۔

شعر۔٢ تذرو: کبک، ایک مشہور پرند ہے۔ بال، تذرو فارسی میں نگہ ابرو کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نشاطِ بہار شراب میں مینائے کے سرو کا لطف دے رہی ہے اور جلوۂ موجِ شراب بالِ تذرو کا۔

شعر۔٣ پاشنہ: پانو کی ایڑی۔ ثبات: پائیداری۔ قیام: اقامت، ٹھہرنا۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔٤ جاداد یعنی جائداد۔ بادہ سے دراصل مراد شراب عرفان، اور رند سے عارف مراد ہے۔ شش جہت: تمام عالم۔ گیتی خراب: رسوائے زمانہ۔ مطلب یہ ہے کہ غافل تو یہ خیال کرتا ہے کہ ہم بادہ نوش بادہ نوشی کی وجہ سے رسوائے زمانہ ہیں، اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ تمام عالم ہماری بادہ نوشی کی جائیداد ہے۔

شعر۔٥ ”مسئلہ رویت باری تعالیٰ مختلف فیہ ہے کہ ذات واجب الوجود کا مشاہدہ آنکھوں سے ہوسکتا ہے یا نہیں۔ علمائے ظاہری کا عقیدہ ہے کہ اس ذات واجب تعالیٰ کو اسی طرح دیکھیں گے جس طرح آفتاب وماہتاب کو دیکھتے ہیں۔ لیکن اہل باطن اور علمائے محققین کا مذہب لاتدرکہ الابصار ہی رہا ہے۔ مرزا صاحب نے اس آخری خیال کو اس شعر میں نہایت دل کش طریقہ سے نظم کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قوت باصرہ اس برق حسن کا مقابلہ نہیں کرسکتی یعنی آنکھ اس شاہد حقیقی کو نہیں دیکھ سکتی۔ دلیل اس کی دوسرے مصرعہ میں ہے کہ جوش بہار نقاب بن گئی۔ یعنی رنگارنگی نے آڑ کرلی۔“ (از رسالہ اردو)

شعر۔٦ دل کی تسلی کو یعنی دل کی تسلی کے واسطے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے یہ مانا کہ تیرے رخ

(کے دیکھنے) سے میری نگاہ کو تسلی ہوگئی ہے لیکن میں اپنے نامراد دل کو کیا کروں کہ اس کو اس سے تسلی نہیں ہوتی۔ کچھ تغیر کے ساتھ اسی قسم کا شعر پہلے بھی آچکا ہے:

غلط تھا ہمیں خط پر گُماں تسلی کا   نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

شعر۔٧ یعنی اسدؔ کو یہ تو خوشی جاتی رہی کہ یار تک پیغام پہنچ جائے گا اور اُلٹا یہ رشک پیدا ہوگیا کہ قاصد اس کے ساتھ ہم کلام ہوگا۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے   میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
ہاتھ دھو دل سے، یہی گرمی گر اندیشے میں ہے   آبگینہ تُندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے
غیر کو یارب، وہ کیونکر منعِ گُستاخی کرے   گر حیا بھی اُس کو آتی ہے، تو شرما جائے ہے
شوق کو یہ لَت کہ ہر دم نالہ کھینچے جایئے   دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے
دُور چشمِ بد، تری بزمِ طرب سے، واہ واہ!   نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے
گرچہ ہے طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق   پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ، وہ پا جائے ہے
اُس کی بزم آرائیاں سُن کر دلِ رنجور، یاں   مثلِ نقشِ مدّعائے غیر بیٹھا جائے ہے
ہو کے عاشق، وہ پری رُخ اور نازک بن گیا   رنگ کُھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے
نقش کو اس کے مُصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں!   کھینچتا ہے جس قدر، اتنا ہی کِھنچتا جائے ہے
سایہ میرا، مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے، اسدؔ!   پاس مجھ آتش بجاں کے کِس سے ٹھہرا جائے ہے!

شعر۔١ انتہائے رشک کی مثال ہے۔ رشک کی وجہ سے عاشق اس بات کو بھی گوارا نہیں کرتا کہ وہ خود بھی اپنے معشوق کو دیکھے:

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے   مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

اسی مضمون کا حافظ کا بھی ایک شعر ہے:

بخدا کہ رشکم آید کہ نظر کنم بروئش   کہ نظر دریغ باشد بہ چنیں لطیف روئے

شعر۔٢ دل کو آئینہ اور گرمیِ اندیشہ کو تندی صہبا سے تشبیہ دی ہے، اور شراب کو بلحاظ رنگ و تاثیر گلخن کا مقابل بیان کیا ہے۔ اس کی حدت وشدت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ساغر کو پگھلا

کر بے صورت کیے دیتی ہے۔ پھر یہ کہتے ہیں کہ یہی کیفیت میرے دل کی ہے جو فکر اور اندیشہ کی گرمی کی تاب نہ لا کر کملایا جاتا ہے۔

شعر۔۳ ”یہ شعر معاملہ کا ہے جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گزرتا ہے اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرعہ میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے حیا آنی اور شرما جانا درحقیقت ایک ہی چیز ہے، پھر اس کے کیا معنی؟ کیا حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرما جانے کا متعلق اور۔ اگر حیا بھی اس کو آتی ہے، یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بیجا سے، اور شرما جائے ہے یعنی غیر سے یا اس کے ساتھ تکرار کرنے سے۔“ (یادگار غالب)

شعر۔۴ لت: (بُری) عادت۔ مطلب یہ ہے کہ میرا دل تو ایسا ناتواں اور کمزور ہے کہ سانس تک لینے سے بھی تکلیف ہوتی ہے، لیکن شوق (نالہ کشی) کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر دم نالہ کشی کیے جاؤں پھر ہو تو کیونکر ہو۔ سانس لینے کی تو طاقت نہیں۔ نالہ کہاں سے کھینچوں۔

شعر۔۵ یعنی نظر بد دور ہو، میرے محبوب کی بزم طلب میں ایسی تاثیر ہے کہ میرا نالہ بھی وہاں جا کر نغمہ بن جاتا ہے۔

شعر۔۶ اس شعر کے معنی میں اختلاف ہے۔ مولانا حسرت موہانی، نظامی اور طباطبائی تینوں کی رائے میں تغافل سے مراد تغافل عاشق ہے۔ یعنی شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ ہم معشوق کے سامنے بالکل الگ تھلگ اور بے تعلق رہتے ہیں لیکن ہم اس کو دیکھ کر ایسے کھوئے جاتے ہیں (یعنی ایسے ازخود رفتہ ہو جاتے ہیں) کہ وہ ہمارے عشق کا سارا حال سمجھ جاتا ہے لیکن دراصل تغافل سے مراد تغافل معشوق ہے اور کھوئے جانے کے معنی شرمندہ ہونے کے ہیں۔ لہٰذا شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ اگرچہ معشوق کے طرز تغافل سے ہمارے عشق پر پردہ پوشی ہوتی ہے لیکن اس کے تغافل سے مجھ کو ایسی شرمندگی ہوتی ہے کہ لوگ تاڑ جاتے ہیں کہ اس کو ضرور اس سے تعلق (عشق) ہے۔ مومن خاں کا یہ شعر نظیراً پیش کیا جاتا ہے:

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے   کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

شعر۔۷ ”بیٹھا جائے“ کا تعلق دونوں لفظوں سے ہے۔ یعنی ایک تو نقش مدعا غیر کا بیٹھنا بمعنی رقیب کی مطلب برآری ہونا اور دوسرے (عاشق کے) دل کا بیٹھنا بے طاقتی و مایوسی کی وجہ سے

مطلب یہ ہے کہ جتنا کہ بزم یار میں رقیب کا نقش مدعا بیٹھا ہے، یعنی جتنی کہ اس کو مطلب برآری ہوئی ہے، اُتنا ہی اس کی بزم کی آرائی کا حال سن کر میرا دل رنجور بھی بیٹھا جاتا ہے۔ یعنی کمزوری و مایوسی کی وجہ سے ٹوٹا جاتا ہے۔

شعر۔۸ عشق میں رنگ کے اُڑنے، یعنی ہلکے ہونے کو رنگ کا کھلنا کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب سے کہ معشوق پری چہرہ عاشق ہوا ہے، عشق کی وجہ سے جو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے تو وہ اور بھی بھلا معلوم ہوتا ہے۔

شعر۔۹ لفظ کھنچنا میں ایہام ہے۔ اک تو تصویر کا کھینچنا اور دوسرے کشیدگی اختیار کرنا۔ شاعر نے تصویر کے کھنچنے کو کشیدگی کے معنی پہنا کر اس کو اس کے ناز سے منسوب کیا ہے۔ بس مطلب صاف ہے۔

شعر۔۱۰ آگ سے دھوئیں کے اٹھنے کو اس کا بھاگنا کہا ہے اور اپنے آپ کو آتش بجاں بتلا کر اپنے سایہ کو اس دھوئیں سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں ایسا آتش بجاں ہوں اور ایسی مصیبتوں کا مارا ہوا ہوں کہ دھوئیں کی طرح میرا سایہ بھی مجھ سے دور بھاگتا ہے:

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے   کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انساں سے رہتا ہے

گرمِ فریاد رکھا، شکلِ نہالی نے مجھے   تب اماں ہجر میں دی، بَردِ لیالی نے مجھے
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت، معلوم!   لے لیا مجھ سے مری ہمّتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم   کردیا کافر اِن اصنامِ خیالی نے مُجھے
ہوسِ گُل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا   عجب آرام دیا بے پروبالی نے مُجھے

شعر۔۱ برد: سردی۔ لیالی جمع ہے لیل کی بمعنی رات۔ مطلب یہ ہے کہ شکل نہالی کو دیکھ کر مجھے شکل معشوق یاد آئی اور معشوق کے یاد آنے سے میں پھر گرم فریاد ہوا۔ اس طریقہ سے کہیں جا کر مجھ کو شبہائے ہجر کی سردی سے اماں ملی۔

شعر۔۲ نسیہ: اُدھار، قرض، مجازاً عقبیٰ۔ نقد مراد دنیا۔ مطلب یہ ہے کہ میری ہمت عالی کی وجہ سے میرا رتبہ دونوں عالم سے بھی بالاتر ہے۔ میں ان دونوں کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔

شعر۔۳ اصنام جمع ہے صنم کی بمعنی معشوق، بت۔ مطلب یہ ہے کہ وحدت کو کثرت میں جلوہ گر

سمجھنا یعنی یہ خیال کرنا کہ واجب الوجود ہر چیز میں موجود ہے، وہم پرستی ہے۔ ان اصنام خیالی یعنی کثرت میں وحدت کو جلوہ گر سمجھنے نے مجھ کو کافر بنا دیا ہے، کیونکہ کہاں وحدت اور کہاں کثرت۔ وحدت کو کثرت میں جلوہ گر سمجھنا دوئی ہے جو کھلا ہوا شرک ہے اور شرکت کرنے والا کافر ہوتا ہے۔

شعر۔۴ مطلب صاف ہے۔ ''اس شعر میں نفس کا یہ خاصّہ بتایا ہے کہ انسان کسی مقصد کے حاصل کرنے میں اسی وقت کوشش کرتا ہے اور اس کو توقع ہوتی ہے جب تک اسباب حصول بھی مہیا ہوتے ہیں، جب تمام اسباب و ذرائع مفقود ہو جاتے ہیں، تو مفقود کا خیال بھی دل سے نکل جاتا ہے۔'' (مہدی)

کارگاہِ ہستی میں لالہ، داغ ساماں ہے   برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے
غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم   باوجودِ دلجمعی، خوابِ گُل پریشاں ہے
ہم سے رنجِ بے تابی، کس طرح اٹھایا جائے!   داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بہ دنداں ہے

شعر۔۱ اس شعر کے اور آیندہ دونوں شعروں کے معنی مرزا صاحب نے مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہوئے خود بیان فرمائے ہیں۔ لکھتے ہیں ''داغ سامان'' مثل انجمن وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و سامان ہو، موجودیت لالہ کی منحصر نمایش داغ پر ہے، ورنہ رنگ و بو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجیے کہ پھول کے درخت، یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے، دہقان کے جوتنے، بونے، پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہوتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج والم ہے و مزارع کا وہ لہو جو کشت وکار میں گرم ہوا ہے، وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے۔ حاصل موجودیت داغ اور داغ مخالفِ راحت اور صورت رنج'' (از عود ہندی)

شعر۔۲ ''کلی جب نئی نکلے بصورت قلب صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول بنے، برگ عافیت معلوم۔ یہاں معلوم بمعنی معدوم ہے اور برگ عافیت بمعنی مایۂ آرام۔ مصرع:

برگ عیشی بگور خویش فرست

برگ اور سرو برگ بمعنی ساز و سامان ہے۔ خواب گل و شخصیت گل باعتبار خاموشی و برجاماندگی، پریشانی ظاہر ہے یعنی شگفتگی وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا۔ غنچہ بصورت دل جمع ہے۔ باوصف جمعیت دل گل کو خواب پریشاں نصیب ہے۔'' (از عود ہندی)

شعر۔۳ پشت دست: صورت عجز۔ اور خس بدنداں و کاہ بدنداں گرفتن بھی اظہار عجز ہے۔'' پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت دست زمیں پر رکھ دی ہو اور شعلہ نے تنکا دانتوں میں لیا ہو، ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو۔'' (از عود ہندی)

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

شعر۔۱ اس شعر میں شاعر نے دکھایا ہے کہ جنون و دیوانگی، ویرانگی پسند ہوتے ہیں۔ پس گھر میں در و دیوار پر سبزہ اُگنے کو جو کہ ویرانی کی علامت ہے، بہار سے تشبیہ دی ہے۔

سادگی پر اُس کی، مرجانے کی حسرت دل میں ہے   بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذّت کہ، جو اُس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ، گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے، کس کس بُرائی سے، ولے با ایں ہمہ   ذِکر میرا، مُجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفِل میں ہے
بس ہجومِ نا امیدی! خاک میں مل جائیگی   یہ جو اِک لذّت ہماری سعیِ بے حاصِل میں ہے
رنجِ رہ کیوں کھینچیے، واماندگی کو عشق ہے   اُٹھ نہیں سکتا، ہمارا جو قدم منزل میں ہے
جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل سہی   فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گِل میں ہے؟
ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طِلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کس مشکِل میں ہے

شعر۔۱ یعنی میرے دل میں معشوق کی سادگی پر مرجانے کی حسرت ہے لیکن چونکہ خنجر پھر قاتل کے ہاتھ میں ہے، اس لیے میرا اس پر قابو نہ ہونے کی وجہ سے، میری اس کی سادگی پر مرجانے کی حسرت پوری نہیں ہوتی۔

دیگر شارحین نے اس کے مختلف پہلوؤں سے اور بھی مختلف معنی بیان کیے ہیں۔ حسرت صاحب اس کے معنی اس طرح بیان فرماتے ہیں: ''ہمارے دل میں اس کی سادگی پر مرجانے کی

حسرت ہے لیکن پھر بھی بس نہیں چلتا، کیونکہ اس کے ہاتھ میں خنجر ہے یا یہ کہ اس کی سادہ لوحی پر مر جانے کی حسرت ہے، جو ہم کو خنجر سے مارنا چاہتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ ہمیں بے خنجر ہی شہید کر سکتا ہے۔"

طباطبائی صاحب اس شعر کی یوں تشریح کرتے ہیں "سادگی سے یہاں ترک الفت و آرایش مراد ہے جو کہ بے تلوار کے قتل کرتی ہے، یعنی بے تلوار باندھے ہوئے جو عالم اس پر ہوتا ہے میں اسی انداز پر گلا گھونٹ کر مر جانے کی حسرت میں ہوں لیکن وہ گلا کاٹنے نہیں دیتا اور خنجر اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور خنجر اس کے ہاتھ میں ہونے سے دو وجہوں سے حسرت نہیں نکل سکتی۔ ایک تو یہ کہ جب خنجر اس کے قابو میں ہے تو ہم گلا کیونکر کاٹیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب خنجر اس کے ہاتھ میں ہو تو وہ سادگی کہاں رہی جس پر ہم جان قربان کرتے تھے اور 'پھر' کے لفظ سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے کہ ہم گلا کاٹتے تھے مگر اس نے خنجر ہاتھ میں لے لیا کہ پھر وہ نہ سادگی باقی رہی، جس انداز پر ہم جان دیتے تھے، نہ خنجر ہی پر ہم قابو پا سکے۔"

شعر۔۲ "کسی کے حسن بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اس طرح اُتر جائے کہ اس کو یہ شبہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی۔" (یادگار غالب)

شعر۔۳ چونکہ میرا ذکر اُس کی محفل میں ہوتا ہے، خواہ وہ بُرائی کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس حیثیت سے کہ اس کو محفل معشوق میں موجودگی کا شرف حاصل ہے اور مجھ کو نہیں، وہ مجھ سے بہتر ہے۔

شعر۔۴ بس یعنی بس کہ۔ شاعر کہتا ہے کہ گو ہماری کوششیں بار آور نہیں ہوتیں اور ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا لیکن تاہم یہ بھی غنیمت ہے کیونکہ ہم کو اپنی ناکامی میں بھی ایک لذت حاصل ہوتی ہے پس اے ہجوم ناامیدی (کثرت یاس) تو بس کر تاکہ ایسا نہ ہو کہ تیری وجہ سے (یعنی ہمیشہ ناکام و نامراد رہنے سے) کہیں میں اس لذت وسعی بے حاصل سے بھی ناامیدی اور نامراد ہو جاؤں۔

شعر۔۵ اس شعر کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ چونکہ واماندگی کو ہم سے عشق ہے اس لیے ہم رنج راہ کیوں کھینچیں۔ ہمارا جو قدم نہیں اٹھتا (یعنی وامانده ہے) ہم کو سمجھنا چاہیے کہ گویا وہ منزل میں ہے۔

دوسرے یہ کہ چونکہ واماندگی کو ہمارے ساتھ عشق ہے اس لیے ہمارا جو قدم منزل (راہ) میں ہے وہ (واماندگی کے عشق کی وجہ سے) اٹھ نہیں سکتا، بس پھر ہم کیوں رنج راہ کھینچیں۔

شعر۔۶ کس کی آب و گل میں ہے، بطور طنز کہا ہے۔ یعنی شاعر معشوق سے طنزاً کہتا ہے کہ تمھارے ضمیر میں تو فتنہ شور قیامت ہے۔ اگر ہمارے دل میں دوزخ کی آگ ہی بھری ہے تو کیا ہے؟

شعر۔۷ کس خوبی کے ساتھ معشوق سے اپنی تمنا پوری کرنے کی درخواست کی ہے۔ شاعر اپنے معشوق کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ غالب کا دل ایک طلسم پیچ و تاب ہے اور تیری تمنا اس میں پھنسی ہوئی ہے، اس لیے تو اپنی تمنا پر رحم کر اور اس کو اس مشکل سے نکال (یعنی میرا ارمان نکال دے)

دل سے تری نگاہ، جگر تک اُتر گئی　　دونوں کو اِک ادا میں رضا مند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذّتِ فراغ!　　تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں!　　اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی
اُڑتی پھرے ہے خاک مری، کوئے یار میں　　بارے اب اے ہوا! ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا　　موجِ خرامِ یار بھی، کیا گُل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی　　اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظّارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا　　مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی
فردا و دِی کا تفرقہ یک بار مِٹ گیا　　کل تم گئے کہ، ہم پہ قیامت گُزر گئی

مارا زمانے نے، اسداللہ خاں! تمھیں
وہ وَلولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟

شعر۔۱ مطلب یہ ہے کہ چونکہ میرے دل و جگر دونوں کو تیرے تیر نگاہ کی آرزو تھی اور وہ (ان کی حسب آرزو) ایک ہی وار میں دل کو چیرتا ہوا جگر تک پہنچ گیا، اس لیے وہ دونوں اس سے خوش ہیں۔

شعر۔۲ سینہ کے شق ہو جانے پر اظہار خوشی کیا ہے کہ خوشا لذت فراق! اس وجہ سے کہ (جیسا کہ مصرعہ ثانی میں ہی لکھتے ہیں) سینہ کے شق ہو جانے کی وجہ سے زخم جگر کو چھپائے رہنے کی تکلیف سے فراغت حاصل ہو گئی۔

شعر۔۳ یعنی جب بادۂ شبانہ کی مستیاں ہی نہیں رہیں، تو پھر اے نفس بیدار ہو۔ اب خواب سحر کی

لذت کیسی؟

شعر۔۴ یعنی چونکہ ہوا کے ذریعہ میری خاک کوے معشوق تک پہنچ گئی ہے، اس لیے اب مجھ کو بال و پر کی خواہش نہیں رہی۔

شعر۔۵ گل کترنا شگوفہ چھوڑنا، یعنی کوئی فساد کی بات کر کے اپنے آپ الگ رہنا۔ موج کی حرکت سے زمین پر نقش و نگار پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ موجِ خرام یار نے عجب گل کترا ہے کہ نقش پا کا شگوفہ چھوڑ گئی ہے جو کہ ایسا دلفریب ہے کہ دنیا اس کے پھندے میں پھنسی ہوئی ہے۔

شعر۔۶ یعنی چونکہ اہلِ ہوس کا عشق کاذب ہوتا ہے، اس لیے ان کی وجہ سے عشاق صادق کا بھی اعتبار جاتا رہتا ہے۔

شعر۔۷ ”کہتے ہیں کہ تجھے دیکھ کر ایسی ازخودرفتگی ہوئی کہ اس کے باعث تیرا جلوہ نہ دیکھ سکے۔ جو نگاہ تیرے رخ تک پہنچی وہ مست ہو کر بکھر گئی۔ اس طرح نظارہ نے بھی نقاب کا کام کیا“ (مہدی)

اسی خیال کو دوسرے پیرایہ میں مرزا ایک جگہ اور باندھتے ہیں:

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا   جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

شعر۔۸ فردا سے مراد فردائے قیامت ہے اور دی کہتے ہیں گزشتہ کل کو، اور ان دونوں میں فرق ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ کل (گذشتہ) جس وقت تم میرے پاس سے اٹھ کر گئے تو رنج و غم کی وجہ سے مجھ پر وہ حالت طاری ہوئی کہ قیامت برپا ہو گئی۔ گویا دی (گذشتہ کل) میرے لیے فردائے قیامت بن گیا اور ان کا فرق جو تھا، مٹ گیا۔

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ ”تمھارے جاتے ہی بہ سبب ازخودرفتگی و خود فراموشی کی یہ حالت ہو گئی کہ آج کل کی مطلق تمیز نہیں رہی، اور ایسا ہی قیامت کے نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدل بہ زمانہ حال ہو جائیں گے۔ پس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گزر گئی۔ قیامت گزر جانے کے دونوں معنی ہیں۔ نہایت سختی کا زمانہ گزرنا اور خود قیامت کا آجانا۔“ (یادگارِ غالب)

شعر۔۹ صاف ہے۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظر ملے   حورانِ خُلد میں تری صورت مگر ملے
اپنی گلی میں مُجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل   میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم   ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مَے جس قدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم!   میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا   فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خِضر کی ہم پیروی کریں   مانا کہ اِک بُزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار! دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبؔ آشُفتہ سر ملے

شعر۔۱ تسکین: یعنی تسکین دل۔ مطلب یہ ہے کہ تسکین دل تو تیرے بغیر ممکن نہیں، مگر ہاں اگر تجھ جیسی شکل کا کوئی دوسرا معشوق مل جاوے تو تسکین نظر البتہ ہو سکتی ہے۔ خیر اگر ایسا بھی ہو جائے (یعنی اگر کوئی ذوق نظر بھی مل جائے) تو ہم تسکین دل کا غم نہ کریں، لیکن تیری صورت کا ملنا ناگزیر ہے۔

شعر۔۲ میرے پتہ سے، یعنی میرے مدفن کے پتہ سے۔ از راہ رشک عاشق کو یہ گوارا نہیں کہ لوگ اس کے مدفن کے پتہ سے اس کے معشوق کا گھر دریافت کریں۔

شعر۔۳ ساقی گری کی شرم کرو: یعنی شراب اچھی طرح پلا دو۔ مطلب یہ ہے کہ جب کہ تم ساقی ہو تو پھر آج تو خوب اچھی طرح شراب پلا دو، ورنہ اور روز تو تھوڑی بہت جس قدر شراب ملتی تھی ہم پی ہی لیا کرتے تھے۔

شعر۔۴ کچھ کلام نہیں: یعنی کچھ شکایت نہیں۔ مرزا صاحب نے ایک خط میں خود اس شعر کا مطلب بیان فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں۔ ”شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی مگر کھٹکا یہ کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے۔ ایک دوست اس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضع دار اور معتمد الیہ ہے میں ضامن ہوں کہ ایسی حرکت نہ کرے گا۔ خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا۔ قضارا عاشق کا گمان سچ ہوا۔ قاصد، مکتوب الیہ کو دیکھ کر والہ و شیفتہ ہو گیا۔ کیسا خط کیسا جواب۔ دیوانہ بن کپڑے پھاڑ جنگل کو چل دیا۔ اب عاشق اس واقعہ کے وقوع کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہے۔ کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر ہے۔ اے ندیم تجھ سے کچھ کلام نہیں

لیکن اگر نامہ بر کہیں مل جائے تو اس کو میرا اسلام کہیو کہ کیوں صاحب تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہے؟''

شعر۔۵ مطلب یہ ہے کہ اگر غم پنہاں کی کشاکش سے نجات مل جاوے تو پھر ہم بھی مجنوں کی طرح جنگل کو نکل جاویں۔

شعر۔۶ یعنی اگر خضر راہ سلوک میں ہمارے ہم سفر تھے تو اس سے ہم پر ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ ہم ان کی متابعت کریں، کیونکہ ہمارا اور ان کا ساتھ تو مساوات کا ہے۔

شعر۔۷ کوچہ دلدار: کوچہ معشوق۔ مطلب صاف ہے۔

کوئی دن، گر زندگانی اور ہے   اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں ، یہ گرمی، کہاں   سوزِ غمہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں، اُن کی رنجشیں   پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط، مُنھ دیکھتا ہے نامہ بر   کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نُجوم   وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہوچکیں، غالبؔ! بلائیں سب تمام   ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

شعر۔۱ شعر کے پڑھتے ہی جو معنی اخذ ہوتے ہیں، وہ تو یہ ہیں کہ اگر کچھ روز اور زندہ رہے تو ہم نے یہ ٹھان لی ہے (یعنی یہ پختہ ارادہ کرلیا ہے) کہ ہم اس کی محبت کو ترک کردیں گے، لیکن مرزا صاحب اپنے ایک خط میں اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں ''اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ لفظ ہیں کہ وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا مقصود کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا۔ پیہم کہتا ہے کہ کچھ کروں گا خدا جانے شہر میں یا نواح شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ پردیس چلا جائے۔''

شعر۔۲ یعنی میرے سوز غمہائے نہانی میں آتش دوزخ سے کہیں زیادہ گرمی ہے۔

شعر۔۳ سرگرانی: خفگی۔ مطلب یہ ہے کہ یوں تو وہ ہمیشہ خفا ہوتے آئے ہیں لیکن اس مرتبہ وہ بہت ہی زیادہ ناراض ہیں۔

شعر۔۴ یعنی خط دینے کے بعد جو نامہ بر میری طرف برابر دیکھ رہا ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضرور کچھ نہ کچھ پیغام زبانی بھی اور ہے، اور وہ اس کو کہتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔

شعر۔۵ اعمار جمع ہے عمر کی۔ قاطع اعمار: مار ڈالنے والے، مہلک۔ نجوم: جمع ہے نجم کی بمعنی ستارہ۔ بلائے آسمانی: مراد ستمہائے معشوق۔ مطلب یہ ہے کہ مضرت زمانہ کے مقابلہ میں مضرت معشوق کہیں زیادہ مہلک اور ضرر رساں ہے۔

شعر۔۶ مرگ ناگہانی، اس وجہ سے کہ موت ہمیشہ اچانک آتی ہے۔ مطلب صاف ہے۔

کوئی اُمید بَر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن مُعیّن ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد   پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں   ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں   میری آواز گر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا   بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں، جہاں سے ہم کو بھی   کچھ ہماری خبَر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی   موت آتی ہے، پر نہیں آتی
کعبے کِس مُنھ سے جاؤگے غالبؔ!
شرم تم کو مگر نہیں آتی!

شعر۔۱ یعنی فلاح کی بہت تدبیریں اور کوششیں کیں، لیکن عمر تمام ہوگئی اور کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

شعر۔۲ یعنی ہم نے مصائب و آلام زندگی سے تنگ آ کر موت کی دعا مانگی مگر ہم کو موت نہیں آئی کہ اس کا ایک دن مقرر ہے۔ اپنے وقت مقررہ پر آئے گی۔ لیکن آخر رات کو نیند کیوں نہیں آتی ہے۔ اس کا تو وہی وقت ہے۔

شعر۔۳ یعنی اس سے پہلے تو اتنا بھی تھا کہ ہم کبھی کبھی اپنے دل کی حالت (زار) پر ہنس لیا

کرتے تھے، لیکن اب ناامیدی اور مایوس الحالی کا ہم پر اس قدر تسلط ہو گیا ہے کہ ہم کو کسی طرح بھی ہنسی نہیں آتی۔

شعر۔۴ یعنی میں طاعت و زہد کے ثواب سے بے خبر نہیں، لیکن طبیعت سے مجبور ہوں کہ وہ اس طرف مائل ہی نہیں ہوتی۔

شعر۔۵ یعنی میری خاموشی کسی نہ کسی مصلحت سے ہے، ورنہ میں سب کچھ باتیں کرنی جانتا ہوں۔

شعر۔۶ مطلب یہ ہے کہ چونکہ معشوق کو میرا ہمیشہ روتا رہنا ہی پسند ہے، اس لیے رویا کرتا ہوں۔

شعر۔۷ یعنی اے چارہ گر، اگر تجھ کو داغ دل نظر نہیں آتا تو کیا اس کی بو بھی نہیں آتی؟ مصرعہ ثانی میں استفہام اقراری ہے اور ایک طرح طنزیہ بھی ہے۔

شعر۔۸ یعنی ہم شاہد حقیقی کے تصور میں ایسے از خود رفتہ ہو گئے ہیں کہ ہم کو خود اپنی بھی مطلقاً خبر نہیں رہی۔

شعر۔۹ مرتے ہیں: یعنی دل و جان سے چاہتے ہیں۔ 'موت آتی ہے' مراد وہی موت جس کا مصرعہ اول میں اظہار کیا ہے یعنی مرگ در آرزوئے مرگ۔ پر نہیں: آتی یعنی مرگ حقیقی۔

شعر۔۱۰ مگر: شاید۔ یعنی غالب تمھاری ساری عمر تو میخواری اور شاہد بازی میں گزری پھر کعبہ کی سرزمین مقدس کا کس منہ سے نام لیتے ہو۔ تم کو ان افعال کے ساتھ وہاں جاتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ (ایک طریقہ سے کعبہ جانے کی تمنا کا اظہار کیا ہے۔)

دلِ ناداں! تجھے ہُوا کیا ہے؟ آخر اِس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مُشتاق، اور وہ بیزار یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی مُنھ میں زبان رکھتا ہوں کاش پُوچھو کہ "مُدّعا کیا ہے"؟

ق

جب کہ تُجھ بِن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خُدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ غمزہ و عِشوہ و ادا کیا ہے؟
شِکَنِ زُلفِ عنبریں کیوں ہے؟ نگہ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں؟ اَبر کیا چیز ہے، ہَوا کیا ہے؟
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمّید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب!
مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

شعر۔۱ درد یعنی دردِ عشق۔

شعر۔۲ "گویا ابھی عشق کے کوچہ میں قدم رکھا ہے اور معشوق و عاشق میں جو راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں ان سے ناواقف ہے۔ اس لیے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے اس کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے۔" (یادگار غالب)

شعر۔۳ یعنی میں بھی تلا ہوا بیٹھا ہوں۔ بس ذرا موقع کا منتظر ہوں۔

قطعہ ۴۔۵۔۶۔۷ سرمہ سا: سرمہ کی مانند "معدومات نہ آپس میں متمائز ہوتے ہیں اور نہ ان کی طرف کوئی صفت منسوب ہو سکتی ہے۔ امتیاز اور صفات کا انتساب، وجود میں آنے پر ہوتا ہے۔ اس لیے شاعر کہتا ہے کہ "جب تیرے سوا کوئی موجود نہیں ہے، سب چیزیں معدوم ہیں تو پھر یہ امتیازات و صفات یعنی پری چہرہ، غمزہ و عشوہ، سبزۂ و گل اور ابر و باد وغیرہ وغیرہ کیا ہیں۔" (مہدی)

شعر۔۸ "جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟" معشوق کی طرف اشارہ ہے۔

شعر۔۹ صاف ہے۔

شعر۔۱۰ یعنی میں اور لوگوں کی سی، خالی دعا نہیں دیتا بلکہ تم پر اپنی جان نثار کرتا ہوں۔

شعر۔۱۱ صاف ہے۔

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے اِک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وُہ آئے
ہوں کشمکشِ نزع میں، ہاں جذبِ محبت! کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پُوچھنے کو آئے
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

ظاہر ہے کہ، گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین   ہاں، مُنھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے
جلّاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے   ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جِس بھیس میں جو آئے
ہاں اہلِ طلب! کون سُنے طعنۂ نایافت   دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں   اُس در پہ نہیں بار، تو کعبے ہی کو ہو آئے
کی ہم نفَسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر   اچھے رہے آپ اُس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے
اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے، غالبؔ!
ہم بھی گئے واں، اور تری تقدیر کو رو آئے

شعر۔۱ غالیہ: ایک خوشبو کو کہتے ہیں، جو مشک، عنبر و کافور وغیرہ کو مرکب کر کے بناتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم سب یہ تو دعا کرتے ہو کہ خدا کرے وہ غالیہ مُو آئے لیکن میری تمنا یہ ہے کہ کوئی گھڑی ایسی بھی آوے کہ تم میں سے کوئی گھبرا کے یہ کہوے کہ لو، وہ آئے۔

شعر۔۲ یعنی اگرچہ میرا بالکل آخری وقت ہے اور گھڑی دو گھڑی جو زندہ بھی رہوں تو اس میں کشمکش نزع میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس سے ہمکلام نہیں ہو سکتا۔ تاہم بہ تقاضائے محبت میری تمنا یہی ہے کہ وہ کسی طرح میری عیادت کو آئے۔

شعر۔۳ صاعقہ: بجلی۔ سیماب: پارہ۔ یعنی ہمارا دنیا میں آنا کچھ آنا نہیں کیونکہ جتنے عرصہ یہاں رہے، بے چین ہی رہے۔ یا یہ کہ بھلا معشوق کا یہ بھی کچھ آنے میں آنا ہے کہ ذرا سی دیر بھی چین سے نہیں بیٹھے۔ آتے ہی جانے کی بے کلی پڑ گئی۔ اور بس فوراً ہی چلے گئے۔ لفظ ''صاعقہ'' سے زود روی کی طرف اشارہ ہے۔

شعر۔۴ بادۂ دوشینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی۔ "محض ازراہ شوخی کے کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ شراب پی کر مریں، تاکہ نکیرین اس کی بو کی کراہیت سے بغیر سوال و جواب کیے چلے جاویں۔'' (یادگار غالب)

یہ لحد میں بوئے مے تھی کہ نہ آسکے فرشتے
میں غضب میں پڑ گیا تھا جو نہ بادہ خوار ہوتا

شعر۔۵ جس بھیس میں جو آئے، چاہے واعظ کی صورت میں یا جلاّد کی صورت میں، ہم سمجھے

ہوئے ہیں کہ وہی معشوق حقیقی ہے جو مختلف شکلوں سے نمودار ہوتا ہے۔ پھر ہم کو کسی سے ڈرنے یا جھگڑنے کی کیا وجہ۔ اس میں شوخی یہ ہے کہ واعظ اور جلاّد کو اک درجہ پر رکھا ہے۔

شعر۔۶ مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے دیکھا کہ معرفت کا بھید ملتا ہی نہیں تو ہم نے اپنے آپ ہی کو کھو دیا تاکہ بازگشت پر یہ طعنہ ہم کو نہ سننا پڑے کہ تلاش بھی کی، لیکن نہ پایا۔

شعر۔۷ شیوہ: طریق، طور، دستور۔ مطلب یہ ہے کہ ہم کبھی آرام سے نہیں بیٹھتے، اگر اس کے دروازے پر بار نہ ملا تو کعبہ ہی ہو آئے۔ غرض پھرنے سے کام۔ گویا شاعر کی نظر میں ریاضت و عبادت محض ایک مشغلۂ بیکاری ہے۔

شعر۔۸ ہم نفس: دوست۔ اثر گریہ میں: یعنی اثر گریہ کے باب میں۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دوستوں نے جو (معشوق کے سامنے) میرے رونے کے اثر کے باب میں تقریر کی کہ غالب رو رہا ہے، لیکن اس کے رونے کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ تو ایسا کرنے سے وہ اپنے آپ تو سرخ رو بن گئے لیکن انھوں نے مجھ کو اس کی نظروں میں حقیر کر دیا کیونکہ اس سے اس پر میرے رونے کی بے اثری ثابت ہو گئی۔

شعر۔۹ **تقدیر**: مراد بدقسمتی۔ یعنی اے غالب محفل معشوق میں تو کچھ عجب ہی لطف ہے۔ وائے تیری قسمت کہ تو اس سے لطف اندوز نہیں۔

پھر کچھ اِک دل کو بیقراری ہے   سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخُن   آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز   پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشم، دلاّلِ جنسِ رُسوائی   دل، خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی، صد رنگ نالہ فرسائی   وہی، صد گونہ اشکباری ہے
دل، ہوائے خرامِ ناز سے پھر   محشرستانِ بیقراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے   روز بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اُسی بیوفا پہ مرتے ہیں   پھر وہی زندگی ہماری ہے

ق

پھر کھُلا ہے درِ عدالتِ ناز   گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر   زُلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال   ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق، طلب   اشکباری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدّمہ تھا   آج پھر اُس کی روبکاری ہے

بیخودی، بے سبب نہیں، غالبؔ!
کچھ تو ہے، جس کی پردہ داری ہے

شعر۔۱ جویا: متلاشی، ڈھونڈنے والا۔ زخم کاری: گہرا زخم۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دل میں پھر کچھ ولولہ، عشق پیدا ہوا ہے اور میرا سینہ پھر کسی مہ جبیں کے تیر نگاہ کا نشانہ ہوا چاہتا ہے۔

شعر۔۲ یعنی فصل بہار کی آمد ہے۔ اس لیے پھر جنون (عشق) شروع ہو گیا:

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل   خون کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

شعر۔۳ نیاز: حاجت، آرزو۔ عماری: محمل، ہودہ

شعر۔۴۔۵۔ جنس رسوائی: عشق یا طبقۂ معشوق۔ اور چونکہ جذبات عشق برانگیختہ کرنے کی زیادہ تر آنکھ ذمہ دار ہے، اس لیے اس کو اس جنس کے دلال کے نام سے موسوم کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری آنکھیں کسی معشوق کی جویا ہیں اور ہمارا دل ذوق خواری کا خریدار ہے۔ (یعنی عاشق ہونا چاہتا ہے) چنانچہ وہ پھر وہی سینکڑوں طرح سے اشکبار اور نالہ فرسا ہو رہے ہیں۔

شعر۔۶ ہوا: خواہش، تمنا، مستاں: کلمۂ ظرف ہے۔ یعنی ہمارا دل محبوب کی تمنا میں ایک محشر اضطراب بنا ہوا ہے۔

شعر۔۷ اس شعر کے معنی میں اختلاف ہے۔ حسرت صاحب لکھتے ہیں "جلوۂ یار پھر بر سرِ ناز ہے اور جاں سپاریِ عشق کا بازار گرم ہے۔"

طباطبائی صاحب اس کے معنی اس طرح بیان کرتے ہیں "جاں سپاری عاشق کا روز بازار ہے کہ جلوۂ معشوق متاع ناز کو عرض کر رہا ہے کہ کون اس کا خریدار ہوتا ہے۔" معنی اول ٹھیک ہیں۔

شعر۔۸ کہتا ہے کہ جس معشوق کی بے وفائی سے تنگ آ کر ہم اس کے عشق سے دست بردار ہو گئے تھے، اور ہمارے دل کو راحت مل گئی تھی، اب پھر اسی پر مرنے لگے ہیں اور پھر ہماری زندگی ویسی ہی ستم زدہ ہو گئی ہے جیسی پہلے تھی۔ اسی کا بیان آئندہ قطعہ بند اشعار میں ہے۔

قطعہ۔ شعر۔۹۔۱۰۔۱۱۔۱۲۔۱۳۔ ایک فریاد و آہ و زاری ہے: یعنی چاروں طرف (معشوق کی ستم شعاری ہے) آہ و بکا کا عالم برپا ہے۔ ایک کثرت کے معنی دیتا ہے۔ روبکاری ہے یعنی حاکم کے سامنے پیش ہے۔ ماحصل سارے قطعہ کا یہ ہے کہ عشق اور دلربائی کا بازار پھر از سرِ نو گرم ہو گیا ہے۔

شعر۔۱۴ یعنی بے خودی بے سبب نہیں ہے، بلکہ راز عشق کو چھپانے کی غرض سے ہے۔

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو، گر شادمانی کی   نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذّت زندگانی کی
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی   ہوئی زنجیر، موجِ آب کو، فرصت روانی کی

پس از مُردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گُل فشانی کی

شعر۔۱ "مطلب یہ ہے کہ رنج یا تکلیف کی حالت میں اگر خوشی یا راحت مل جائے تو اس کے بعد رنج و تکلیف کا احساس اور بڑھ جاتا ہے۔ اسے ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ اگر ہم نے کچھ شادمانی حاصل کی تو ہمارے جنون پر تسکین دہی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ لذت زندگانی جو مل جاتی ہے وہ زخم دل پر نمک کا کام کرتی ہے جس سے تکلیف اور زیادہ ہو جاتی ہے۔" (مہدی)

شعر۔۲ مطلب یہ ہے کہ کشاکش ہائے ہستی سے کوئی شخص آزاد نہیں ہو سکتا۔ موجِ آب ہی کی مثال لیجیے جس کی ظاہر روانی سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آزاد ہے لیکن دراصل وہی اس کی روانی اس کے واسطے زنجیر (قید) بنی ہوئی ہے۔ پانی کی روانی یعنی موج اور زنجیر میں مشابہت ظاہر ہے۔

شعر۔۳ تربت: قبر۔ شاعر کہتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی مجھ دیوانۂ عشق کی قبر بچوں کی زیارت گاہ بنی ہوئی ہے، جو میری قبر پر اتنے پتھر برساتے ہیں کہ ان کی زد سے جو شعلہ اٹھتا ہے وہی میری قبر کے واسطے پھولوں کا کام دیتا ہے۔ قاعدہ ہے کہ اپنے محبوب کی قبر پر پھول چڑھایا کرتے ہیں لیکن

غالب دیوانہ کی قبر پر بمقتضائے جنوں، لڑکے پتھر برساتے ہیں۔

نکوہش ہے سزا، فریادیِ بیدادِ دلبر کی   مبادا خندۂ دنداں نُما ہو صبح محشر کی!
رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے   اگر بودے بجائے دانہ، دہقاں نوک نشتر کی
پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا   ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض، کیا قدرت!   کہ طاقت اُڑ گئی، اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی
کہاں تک رُوؤں اُس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مِری قسمت میں، یارب! کیا نہ تھی دیوار پتھر کی؟

شعر۔ ۱ نکوہش: ملامت۔ مبادا: ایسا نہ ہو لیکن یہاں رفع تعجب کے واسطے لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کے ظلم کی فریاد کرنے والا سزائے ملامت کا مستحق ہے۔ اس لیے اگر صبح محشر (جس روز کہ محبوب کے ظلم کی فریاد کی جاوے گی) بھی خندۂ دنداں نما ہو۔ (یعنی ملامت کرے) تو کیا تعجب ہے۔

شعر۔ ۲ ریشگی: ریشہ دار ہونا، مراد اُگنا۔ مطلب یہ ہے کہ دشت مجنوں کی خاک میں اگر دہقان بجائے دانہ کے نشتر کی نوک بودے تو اس اتحاد کے اثر سے جو کہ بوجہ عشق، عاشق و معشوق نشتر و رگ میں پیدا ہے، اس میں (یعنی خاک دشت مجنوں میں) سے رگ لیلیٰ اُگے۔ اس شعر میں لیلیٰ کے فصد کھلنے کے ساتھ مجنوں کے ہاتھ کی خود بخود فصد کھل جانے کی طرف بھی تلمیح ہے۔

شعر۔ ۳ جب مجلس گرم ہوتی ہے تو شمع کا ہونا ضروری ہے اور شمع کے ہونے سے اس پر پروانہ کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے بعد یوں سمجھیے کہ دور ساغر کی روانی کا باعث گرمی محفل ہے اور چونکہ بہ بحث اول، گرمی مجلس کے وقت پروانہ کا ہونا لازمی ہے، اس لیے کشتیِ مے (ساغر) کے بادبان پر پروانہ کو ٹھہرایا ہے۔

حسرت صاحب اس کے معنی اس طرح بیان فرماتے ہیں ”چونکہ دور ساغر کی روانی گرمی مجلس پر منحصر تھی اور گرمی محفل سوز پروانہ پر، اس لیے پروانہ گویا کشتی مے کا بادبان ٹھہرا کہ اس کی وجہ سے دور ساغر و کشتی مے ظہور میں آیا۔“

شعر۔ ۴ پرفشانی: پرزنی، اڑنا، اڑگئی یعنی: زائل ہوگئی۔ شہپر: اس مخصوص پر کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے کہ پرند پرواز کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنے ذوق پرفشانی کے ظلم اور ایذا رسانی کو کیا کروں کہ (میری تمنا کے خلاف) میرے اڑنے سے پہلے ہی میرے شہپر کی طاقت اڑگئی۔ یا یہ کہ چونکہ اڑنے سے پہلے ہی میری طاقتِ پرواز زائل ہوگئی اور اس طرح میرا ذوقِ پرفشانی پورا نہیں ہوسکا، اس لیے میرے ذوق پرفشانی نے جو مجھ کو تکلیف پہنچا رکھی ہے، وہ بیان نہیں کی جاسکتی کہ وہ میرے ہر وقت چٹکیاں لیتا رہتا ہے (یعنی پرواز کی گھڑی گھڑی امنگیں اٹھتی رہتی ہیں)

شعر۔ ۵ تا کہ سر پھوڑ کر اپنا قصہ تمام کر لیتا۔

بے اعتدالیوں سے سُبک سب میں ہم ہوئے   جتنے زیادہ ہوگئے اُتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دامِ سخت، قریب آشیان کے   اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری، اپنی فنا پر دلیل ہے   یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے
سختی کشانِ عشق کی پُوچھے ہے کیا خبر!   وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا اَلم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی، کہ دہر میں   تیرے سوا بھی، ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے، جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں   ہر چند اِس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
اللہ ری تیری تندیِ خو! جس کے بیم سے   اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے
اہلِ ہوس کی فتح ہے، ترکِ نبردِ عشق   جو پانو اُٹھ گئے، وہی اُن کے علَم ہوئے
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے   جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آکے دم ہوئے
چھوڑی، اسدؔ! نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے، تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

شعر۔ ۱ سبک: ذلیل، حقیر جتنے زیادہ ہوگئے: یعنی جتنا حد اعتدال سے بڑھے یا جتنی ہماری عزت بڑھ گئی تھی۔ اتنے ہم کم ہوئے: اتنے ہی لوگوں کی نظروں میں گھٹ گئے یعنی حقیر ہوگئے۔ باقی مطلب صاف ہے۔

شعر۔ ۲ مرزا صاحب ابھی پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور نو برس کے تھے کہ

ان کے چچا مر گئے۔ ایک تو یہ واقعہ ہے اور دوسرا واقعہ یہ ہے کہ سترہ برس کی عمر میں ہی شادی ہو گئی تھی۔ گویا بقول ان کے حبس دوام کا حکم آ گیا، اور ایک بیڑی ان کے پانو میں ڈال دی گئی، یا پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا۔ بس انھیں واقعات میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ہم مصائب و افکارِ دنیوی میں مبتلا ہو گئے۔

شعر۔۳ یعنی افکار و آلام دنیوی نے ہم کو اس قدر گھلایا کہ ہماری ہستی، فنا کے درجہ تک پہنچ گئی اور ہم ایسے مٹ گئے کہ قسم کھانے کو بھی نہیں رہے۔

شعر۔۴ سختی کشاں: سختی کھینچنے والے، مصیبت برداشت کرنے والے۔ سراپا، سر سے پانو تک۔ مطلب یہ ہے کہ سختی کشان عشق (یعنی عشاق) کی کیا خبر بیان کروں، وہ تو رنج اٹھاتے اٹھاتے خود الم کے پتلے بن گئے۔

شعر۔۵ مطلب یہ ہے کہ صرف تیری وفا سے ہماری تمام مظلومیت کی تلافی نہیں ہو سکتی (تیری وفا سے تو صرف ان ظلموں کی تلافی ہو سکتی ہے کہ جو تو نے کیے ہیں) یہاں تو ہم پر زمانہ میں تیرے ظلم کے علاوہ اور بھی بہت سے مظالم گزرے ہیں، ان کی تلافی کیسے ہو؟

شعر۔۶ خونچکاں: لہو ٹپکانے والی، جس کو سن کر سوزِ غم سے آنکھوں میں خون کے آنسو آ جاتے ہیں۔ پہلے مصرعہ میں 'لکھتے رہے' کی رعایت سے دوسرے مصرعہ میں لفظ 'قلم' لایا گیا ہے۔ قلم ہوئے: یعنی کاٹے گئے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم کو کتنے ہی مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن ہم برابر جنوں کی حکایت خونچکاں لکھتے رہے۔

شعر۔۷ اللہ رے: کلمہ تعجب ہے۔ اجزائے نالہ: یعنی نالے (خود) کجرو للکل رزقهم ہو گئے۔ رزق یک دیگر۔ اس طرح سے کہ ایک نالہ پیدا ہوا لیکن وہ مارے خوف کے باہر نہ نکلا تھا کہ دوسرا پیدا ہو گیا۔ اور اسی طرح دوسرا باہر نہ آیا تھا کہ تیسرا پیدا ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ تیری تند مزاجی کا وہ رعب ہے کہ تیرے غصہ کے ڈر سے کہ کہیں تو خفا نہ ہو جائے، میرے نالے دل کے دل ہی میں فنا ہو گئے اور منہ سے نہ نکل سکے۔

شعر۔۸ اہل ہوس (عشاق کاذب) کے پانو کے اٹھنے کو علم (جھنڈا) فتح بلند ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنگ عشق کو چھوڑ کر بھاگ جانے میں۔ اہل ہوس کی فتح ہے اور میدان عشق سے ان لوگوں کے پانو کا اٹھنا، گویا ان کے لیے عَلمِ فتح بلند ہونا ہے کیونکہ جان بچ گئی اور وہ یہی چاہتے تھے۔

شعر۔۹ یعنی ازل میں ہمارے یہ کام سپرد ہوا، کہ ہم چند نالے کھینچیں۔ لیکن ہم وہاں تمام نالے نہ کھینچ سکے۔ جو نالے کہ وہاں کھینچنے سے باقی رہ گئے، وہ یہاں آ کر کھینچ رہا ہوں۔ چنانچہ یہ سانس کی آمد و رفت وہی ہے۔ عرفی نے بھی ایک شعر میں نفس کو بمنزلہ نالہ تعبیر کیا ہے:

نالہ می کشم از درد تو گاہے لیکن
تا بہ لب می رسد از ضعف نفس میگردد

شعر۔۱۰ کیا دلدادہ عشق ہیں۔

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے، بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں، جس نے نہ سُنی مری کہانی
یوں ہی دُکھ کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا
کہ ''مرے عدو کو، یارب! ملے میری زندگانی''

شعر۔۱ شعلہ: مراد شعلۂ محبت۔ داغ دل کو چونکہ اشرفی سے مشابہت ہے، اس لیے نقد۔ داغ دل کہا ہے۔ شعلہ کا پاسبانی نہ کرنا وہی اس کی بے زبانی اور اس کا بے زبان ہونا اس کی افسردگی (یعنی بجھ جانا) ہے۔ کمیں: گھات۔ مطلب یہ ہے کہ اگر شعلہ میرے داغ دل کی پاسبانی نہ کرے تو افسردگی، جو بے زبانی کے پردے میں نہاں ہے۔ (یعنی جو شعلہ کے بے زبان ہونے کا نتیجہ ہے) میرے نقد داغ دل کو چرا لے گی۔ یعنی افسردگی کی وجہ سے داغ دل مٹ جائے گا۔

شعر۔۲ کودکی: بچپن۔ یعنی جو ہمیشہ سے مجھ سے برگشتہ خاطر رہا ہو، وہ اب میرے ساتھ کیا ہمدردی کر سکتا ہے۔

شعر۔۳ یونہی: بے سبب، فضول یعنی میری زندگی اس قدر خراب و برباد ہے کہ خدا ایسی زندگانی کسی دشمن کو بھی نہ دے۔ کس خوبی کے ساتھ اور کیسے لطیف پیرایے میں اپنی مایوس الحالی اور خستگی کا اظہار کیا ہے۔

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیلِ سحَر، سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال، نہ نظّارۂ جمال
مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مَے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق! ہاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا!
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فَروش ہے
دیدارِ بادہ، حوصلۂ ساقی، نگاہِ مست
بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

ق

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل!
زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سُنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی، بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مُطرب، بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گُلِ فروش ہے
لُطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنّتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر، تو بزم میں
نے وہ سُرور و سُور، نہ جوش وخروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب! صریرِ خامہ، نوائے سروش ہے

شعر۔۱ مرزا صاحب نے مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہوئے اس شعر کے معنی خود بیان فرمائے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''پیرو مرشد: مصرع

ایک شمع ہے دلیل سحر ،سو خموش ہے

یہ خبر ہے۔ اس شعر کا پہلا مصرع ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے یہ مبتدا ہے۔ شب غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا، ظلمت غلیظ۔ سحر نا پیدا: گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں (ایک) دلیل صبح کی بود پر ہے، یعنی بجھی ہوئی شمع۔ اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا، وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسباب تاریکی کے۔ بس دیکھا چاہیے جس گھر میں علامت صبح موئد ظلمت ہوگی، وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔'' (ازعود ہندی)

شعر۔۲ آشتی: صلح۔ مدت سے آشتی چشم وگوش ہے: اس وجہ سے کہ عرصہ سے نہ تو کان کو مژدۂ وصال ہے اور نہ آنکھ کو نظارۂ جمال۔ مطلب یہ ہے کہ وہ زمانہ جاتا رہا کہ اگر کبھی چشم کو نظارۂ جمال ہوتا تھا تو کانوں کو رشک ہوتا تھا کہ ہم کو بھی مژدۂ دہاں کیوں نہ ملے یا اگر کبھی کان تک مژدہ وصال پہنچتا تھا، تو آنکھوں کو یہ رشک ہوتا تھا کہ کان نے مژدۂ وصال سن لیا لیکن ہم نظارۂ جمال سے محروم رہے۔ اب تو مدت سے ان دونوں میں صلح ہے کیونکہ عرصہ سے نہ تو کان کو مژدۂ وصال ہے اور نہ آنکھوں کو نظارۂ جمال (یعنی بنائے مخاصمت مفقود) ہے۔

شعر۔۳ تسلیم: سپرد کرنا، حوالہ کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ (ایسی حالت میں جبکہ) نشہ شراب نے حسن خود آرا کو بے حجاب کر دیا ہے، اے شوق تجھ کو بھی اجازت ہے کہ تو بھی اپنے ہوش وحواس (صبر وضبط) اس کے حوالے کر دے۔

شعر۔۴ اوج: بلندی۔ عقد: لڑی۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔۵ خروش: غل وشور۔ بے خروش: خاموش۔ مطلب یہ ہے کہ بزم خیال عاشق ایک میکدۂ بے خروش کے مانند ہے۔ اس میکدہ میں دیدار (یعنی تصور معشوق) شراب ہے۔ حوصلہ (عاشق) ساقی ہے اور نگاہ مست عاشق میخوار ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر نگاہ شوق عالم تخیل میں حسب حوصلہ خود تصور معشوق میں سرشار ہوتی ہے۔

قطعہ شعر۔۶۔۱۲ ''اپنی انقلابِ حالت کا نقشہ اس بے مثال قطعہ میں کھینچتے ہیں جو غالباً کسی واقعہ سے متاثر ہو کر ہے۔ 'اے تازہ الخ' جوانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ اگر تم کو نائے ونوش کا شوق ہے تو اس کے نتیجہ سے خبردار ہو جاؤ۔ دیکھو مجھے، اس کوچہ میں قدم رکھنے سے پہلے۔ اگر تم عبرت بیں آنکھ رکھتے ہو تو میری حالت کا مشاہدہ کر لو۔ اور گوش نصیحت نیوش ہے تو میری بات سن لو۔ ساقی بہ جلوہ الخ ان جلسوں میں یہ ہوتا ہے کہ ساقی اپنی جلوہ گری سے عقل وایمان غارت کر دیتا ہے اور مطرب اپنے نغمہ سے تمکین وہوش کھو دیتا ہے۔ پھر اس محفل کی گرمی اور لطف تھوڑی ہی دیر تک رہتا ہے۔ 'یا شب کو الخ' رات کو یہ دیکھتے تھے کہ پھولوں سے اس طرح محفل آراستہ ہے کہ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرش کا ہر گوشہ دامان باغبان اور کف گل فروش ہے۔ 'لطف خرام الخ' ساقی کی جلوہ گری

اور مطرب کی چنگ نوازی سے آنکھ اور کان کو جنت کا لطف آ رہا ہے۔ 'یا صبح دم......کو......تا خموش ہے، صبح کو بزم میں آ کر دیکھیے تو نہ وہ ساقی کی جلوہ گری ہے نہ مطرب کی نغمہ سرائی۔ نہ جوش و خروش ہے۔ نہ لطف و نشاط ہے، بس ایک سناٹا چھایا ہوا ہے۔ سامان آرائش و زینت کچھ نہیں۔ صرف ایک شمع باقی ہے، وہ بھی دم بخود ہے۔'' (مہدی)

شعر۔ ۱۳ نوا: آواز۔ سروش: فرشتہ۔ جریر: وہ آواز جو لکھتے وقت قلم سے نکلتی ہے۔ مطلب صاف ہے۔

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے　　　طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنّت حیاتِ دہر کے بدلے　　　نشّہ بہ اندازۂ خُمار نہیں ہے
گِریہ نکالے ہے تری بزم سے مُجھ کو　　　ہائے! کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر　　　خاک میں عُشّاق کی غبار نہیں ہے
دل سے اُٹھا لُطفِ جلوہ ہائے معانی　　　غیرِ گُل آئینۂ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے　　　وائے، اگر عہد استوار نہیں ہے
تو نے قسم مَے کشی کی کھائی ہے، غالبؔ!
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

شعر۔ ۱ یعنی جلدی سے آ کہ میں تیری وجہ سے بے چین ہوں اور اب انتظار (کے ظلم) کی طاقت باقی نہیں ہے:

رفتی و در تپ و تاب انداختی حزیں را　　　باز آ کہ در فراقِ جاناں ناصبور دارم

شعر۔ ۲ نشہ سے کنایہ آرام جنت اور خمار سے تکالیف دینا مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صلہ آفرینش (زیادہ سے زیادہ) جنت ہے لیکن یہ معاملہ بہت گراں ہے، کیونکہ دنیا میں جن مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کی تلافی کے لیے آرامِ جنت بہت کم ہے۔

شعر۔ ۳ یعنی میں اپنے رونے کی وجہ سے اس کی بزم سے نکالا جاتا ہوں کیونکہ اس سے اس کی سبکی و رسوائی ہوتی ہے۔ افسوس کہ مجھ کو اپنے رونے پر بھی قابو نہیں تا کہ چپ ہو جاتا اور بزم سے نہ نکالا جاتا۔

شعر۔ ۴ خاک میں: سرشت میں، طینت میں، غبار: مطلب یہ ہے کہ تیرا یہ گمان کرنا کہ میرے دل میں تیری طرف سے رنجش ہے، بالکل فضول ہے کیونکہ ہم عشاق کی طینت ہی میں رنجش نہیں ہوتی۔ 'غبار' میں صنعت ایہام ہے۔

شعر۔ ۵ لطف جلوہ ہائے معنی: یعنی لطف سخن۔ گل آئینہ: یعنی جلوہ ہائے معنی، آئینہ اور شیشۂ دل کا مشہور استعارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تجھ کو لطف اٹھانا مقصود ہے تو اپنے دل سے لطف سخن اٹھا، کیونکہ اس کے علاوہ تمام چیزیں بے مزہ ہیں۔

شعر۔ ۶ استوار:۔ مضبوط۔ عہد کیا ہے یعنی معشوق نے۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔ ۷ کیونکہ ہم کو یقین ہے کہ تجھ سے میکشی نہیں چھوٹ سکتی۔

ہجومِ غم سے، یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے　　　کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکِل ہے
رفوئے زخم سے مطلب ہے لذّت زخمِ سوزن کی　　　سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے
وہ گُل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غُنچۂ گُل کا، صدائے خندۂ دل ہے

شعر۔ ۱ یعنی غم کے بوجھ سے میرا سر اس قدر جھک گیا ہے کہ دامن پر جا رہا ہے، اور تار دامن اور تار نظر بالکل ایک معلوم ہوتے ہیں۔

شعر۔ ۲ یعنی زخم کے رفو کرنے سے میری یہ خواہش نہیں ہے کہ میرا زخم بھر جاوے اور مجھ کو آرام ہو جائے، بلکہ اس سے میرا زخم، سوزن سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہ نہ سمجھ کہ میں دیوانہ اس درد کی لذت سے غافل ہوں۔ مرزا پہلے بھی لکھ چکے ہیں:

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

شعر۔ ۳ 'غنچہ گل' دل سے مشابہ ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ جس گلستاں میں وہ معشوق جلوہ فرما ہو، اس باغ کے غنچوں کے چٹکنے کی آواز کو دراصل یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ باغ کے دل کے نغمہائے ترنم

ہیں، جو معشوق کی آمد کی خوشی میں اس کے دل سے (بے ساختہ) نکلے ہیں۔

پا بہ دامن ہو رہا ہوں بس کہ میں صحرا نورد خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت ہے نگاہِ آشنا ، تیرا سرِ ہر مُو مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ، لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

شعر۔۱ یعنی میں جو کہ صحرا نورد تھا، اب (مایوسی کے سبب سے) پا بہ دامن ہو رہا ہوں، اور میرے پاؤں میں جو صحرا نوردی کی حالت میں کانٹے لگے تھے وہ میرے آئینۂ زانو کا جوہر بنے ہوئے ہیں۔ آئینۂ زانو کا استعارہ عام اور مشہور ہے۔ ایک شارح نے خارِ پا کو بجائے مبتداء کے خبر ٹھہرا کر اس کے معنی کہے ہیں۔

شعر۔۲ کہتا ہے کہ ہم آغوشی کے وقت میرے دل کی حالت دیکھنے کے قابل ہے معشوق کا ہر سر مو میرے لیے ایک نگاہ آشنا ہے۔ اس لیے کہ میں ہمیشہ اپنے تصور میں اس کی ہم آغوشی کا خیال باندھتا رہا ہوں، جس کی وجہ سے اس کا ہر سر مو میرے قلب سے آشنا ہو گیا ہے۔

شعر۔۳ آہنگ: راگ۔ مطلب یہ ہے کہ میں سراپا ساز بنا ہوا ہوں جس میں شکایت کا راگ بھرا ہوا ہے۔ پس تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ تو مجھ کو لوگوں میں نہ چھیڑے، ورنہ تو نے مجھے چھیڑا اور مجھ سے راگ (شکایت) نکلا۔ آگے چل کر بھی مرزا لکھتے ہیں:

پُر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا ایک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

جس بزم میں تو ناز سے گُفتار میں آوے جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سایے کی طرح ساتھ پھریں سَرو و صنوبر تو اِس قدِ دلکش سے جو گُلزار میں آوے
تب نازِ گراں مایگیِ اشک بجا ہے جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے
دے مُجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر! کچھ تجھ کو مزا بھی مِرے آزار میں آوے
اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ طوطی کی طرح آینہ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سُوکھ گئی پیاس سے، یارب! اِک آبلہ پا وادیِ پُر خار میں آوے
مرجاؤں نہ کیوں رشک سے، جب وہ تنِ نازک آغوشِ خمِ حلقۂ زُنّار میں آوے
غارتگرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر کیوں شاہدِ گُل باغ سے بازار میں آوے
تب چاکِ گریباں کا مزا ہے، دلِ ناداں! جب اِک نفَس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے
آتشکدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے اے واے! اگر مَعرضِ اظہار میں آوے
گنجینۂ معنی کا طِلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ، غالب! مرے اشعار میں آوے

شعر۔۱ کالبد: قالب۔ بدن، شعراء و عشاق کے نزدیک صفاتِ دہنِ معشوق میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ اس کی آواز جاں بخش ہوتی ہے۔ پس شاعر اپنے معشوق سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ اے معشوق، تیری گفتار ناز میں وہ طاقت ہے کہ جس محفل میں تو بات چیت کرنے لگے تو بہت ممکن ہے کہ تیری آواز دہن سے کالبد صورت دیوار میں بھی جان پڑ جاوے اور وہ گویا ہو جائے۔

شعر۔۲ اس قدِ دلکش سے: یعنی بایں قدِ دلکش۔ مطلب یہ ہے کہ اے معشوق تیرا قد اس قدر دلکش اور دلفریب ہے کہ اس کے مقابلہ میں قد سرو صنوبر بھی جو کہ ضرب المثل ہے، ہیچ ہے۔ اگر تو اپنے اس قد کے ساتھ باغ میں آجاوے تو سرو صنوبر بھی ندامت سے سایہ کی طرح تیرے ساتھ ساتھ پھریں۔

شعر۔۳ لختِ جگر: جگر کا ٹکڑا۔ دیدۂ خونبار: خون برسانے والی آنکھ۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔۴ یعنی اگر میں اپنے آزار کی شکایت و فریاد کروں گا تو تجھ کو یک گونہ لطف حاصل ہوگا۔ اس لیے اے ستمگر، مجھے شکایت و فریاد کرنے کی اجازت دے دے تا کہ مجھے آزار دینے سے تجھ کو کچھ تو مزا حاصل ہو۔

شعر۔۵ فسوں گر: جادوگر۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کے آنکھ کے اشارہ میں یہ تاثیر ہے کہ اگر وہ آئینہ کی طرف اشارہ کرے تو وہ بھی طوطی کی طرح بولنے لگے۔ آئینہ اور طوطی میں یہ مناسبت ہے کہ آئینہ کی مدد سے طوطی کو بولنا سکھایا کرتے ہیں۔

شعر۔۶ یعنی کانٹوں کی پیاس کے مارے زبان سوکھ گئی ہے۔ خدا کرے کوئی آبلہ پا اس وادی پُرخار میں آجائے تاکہ اس کے آبلوں (کے پانی) سے کانٹوں کی پیاس بجھ جائے۔

شعر۔۷ یعنی معشوق کے گلے میں جو زنار آویزاں ہے تو اس کو دیکھ کر عاشق کو رشک ہوتا ہے کہ زنار جیسی ادنیٰ چیز کی تو یہ تقدیر کہ اس کو معشوق کے ساتھ ہم آغوشی کا لطف حاصل ہے، لیکن اس جیسا جاں نثار اس لطف سے محروم ہے۔

شعر۔۸ یعنی ہوس زر ایک ایسی مذموم چیز ہے کہ جہاں کہیں اس کا غلبہ ہوتا ہے، وہاں نہ عزت کا پاس رہتا ہے اور نہ اپنے محبوب کا خیال۔ عزیز سے عزیز چیز کو خیرباد کہنا پڑتا ہے (مثال کے طور پر لیجیے) اگر یہ غارت گر ناموس یعنی ہوس زر نہ ہوتی تو شاہد گل باغ سے بازار میں بکنے کے لیے کاہیکو آتا۔

شعر۔۹ یعنی اے دلِ نالاں، گریبان چاک کرنے کا لطف تو اس وقت ہے جبکہ اس کے ہر تار میں ایک نفس الجھا ہوا آئے یعنی گریبان کے ساتھ ساتھ سانس بھی کھنچ کر آئے اور دم نکل جائے۔

شعر۔۱۰ یعنی جس راز کے چھپانے سے میرا سینہ آتشکدہ بنا ہوا ہے، اگر وہ معرض اظہار میں آجائے گا، یعنی ظاہر ہو جائے گا تو بس ظلم ہی ہو جائے گا یعنی نہ معلوم کہاں کہاں تک آگ لگے گی۔

شعر۔۱۱ گنجینہ: خزانہ۔ طلسم: جادو یعنی جو لفظ کہ میرے شعر میں استعمال ہوا ہو اس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس میں ضرور سینکڑوں معنی مضمر ہیں۔ ایک قطعہ کا شعر ہے:

فکر میری گوہر اندوز اشارات کثیر
کلک میری رقم آموز عبارات قلیل

حُسنِ مہ، گرچہ بہ ہنگامِ کمال، اچھا ہے
اُس سے میرا مہِ خُرشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں، اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ، مُفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جَم سے مِرا جامِ سِفال اچھا ہے

بے طلب دیں، تو مزا اُس میں سِوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خُوئے سوال اچھا ہے

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ، بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے، پاتے ہیں عُشّاق بُتوں سے کیا فیض!
اِک برہمن نے کہا ہے کہ، یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو، کمال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مِل جائے، تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ، جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضر سُلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سَرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے، جنّت کی حقیقت، لیکن
دل کے خوش رکھنے کو، غالبؔ! یہ خیال اچھا ہے

شعر۔۱ حسن مہ ہنگام کمال: یعنی حسن بدر۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ حسن بدر اچھا ہوتا ہے لیکن میرے محبوب خورشید جمال کا حسن، اس سے بھی کہیں زیادہ اچھا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں دعویٰ متضمن دلیل ہے۔ معشوق کو مہ خورشید جمال اس لیے کہا ہے تاکہ اس کو ماہ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے۔

شعر۔۲ یعنی میرے دل کا سودا تو ایک بوسے پر ہے۔ وہ بوسہ تو دیتے نہیں ہیں لیکن ہر وقت میرے دل کی تاک میں رہتے ہیں کہ یہ مال کسی طرح مفت مل جاوے تو بہت اچھا ہے۔

شعر۔۳ سفال: ٹھیکرا ٹھیکری۔ یعنی میرا مٹی کا پیالہ جام جم سے کہیں بہتر ہے۔ کیونکہ اگر وہ ٹوٹ جائے تو دستیاب ہو سکتا ہے۔ بازار سے اور لا سکتے ہیں لیکن جام جم میں یہ خوبی نہیں، یہ شعر شاعری کے حقیقی معنوں پر دلالت کرتا ہے، صفات و محسنات شاعری میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ شاعر ایک معمولی اور ادنیٰ چیز میں، ایک غیر معمولی اور بیش بہا اوصاف پیدا کردے۔ اس قسم کا طرز بیان نہایت ہی پُرلطف اور سبق آموز ہوتا ہے۔ جام سفال کی اس سے بہترین تعریف نہیں ہو سکتی کہ اس کو ایک طریقہ سے جام جم سے بھی، جو کہ دنیا کی بہترین چیزوں میں سے ہے، اولیٰ قرار دیا ہے۔

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ ”اس شعر میں شاعر کے تخیل نے کس خوبی سی اپنا کام کیا ہے۔ شاعر کے تجربات اور مشاہدات جو پہلے سے اس کے ذہن میں مہیا تھے۔ ان کو مکرر ترکیب دے کر ایک نئی صورت بخشی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے دلکش پیرایہ میں جلوہ گر کیا ہے، جو معمولی پیرایوں سے بالکل الگ ہے۔ شاعر کے ذہن میں پہلے سے اپنی اپنی جگہ یہ باتیں ترتیب وار موجود تھیں کہ مٹی کا کوزہ ایک نہایت کم قیمت اور ارزاں چیز ہے جو بازار میں ہر وقت مل سکتا ہے۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ

جام جم جیسی چیز سے تمام عالم میں کوئی چیز افضل نہیں۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ جام جم میں شراب پی جاتی ہے اور اب مٹی کے کوزے میں شراب پی جاسکتی ہے۔ اب قوت متخیلہ نے اس تمام معلومات کو ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دے کر ایسی صورت میں جلوہ گر کر دیا کہ جام جم کی کچھ حقیقت نہ رہی اور اس قابل کر دیا کہ زبان اس کو پڑھ کر متلذذ اور کان اس کو سن کر محظوظ اور دل اس کو سمجھ کر متاثر ہو سکے۔" (از مقدمہ شعر و شاعری)

شعر۔۴ صاف ہے۔

شعر۔۵ قریب قریب اسی مضمون کا کا سعدیؒ کا بھی ایک شعر ہے:

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو گویم   چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

دونوں کا ماحصل یہ ہے کہ کسی طرح اپنی تکلیف یا رنج معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتے۔ فسون تبریزی نے بھی ایک فارسی شعر میں قریب قریب اسی خیال کو ادا کیا ہے:

با و چو میرسم آسودہ می شوم از دور   ندیدہ حال مرا بوقت بیزاری حیف

شعر۔ ۶ "گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں۔ یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال کو اچھا بتایا ہے تو اس کے اچھا ہونے کی یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہو جائیں، نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑنے کا، یا وبا نہیں آنے کی، یا لڑائیاں نہیں ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔" (یادگار غالب)

شعر۔۷ یعنی انسان میں کوئی نہ کوئی کمال ضرور ہونا چاہیے۔ خواہ وہ کسی قسم کا کیوں نہ ہو لیکن وہ ضرور کام آتا ہے۔ فرہاد کی ہی مثال لیجیے کہ اس کو سنگ تراشی میں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ اس کو اسی (تیشہ ہی) کی بدولت شیریں تک پہنچنے اور اس سے گفتگو کرنے کا موقع مل گیا۔

شعر۔۸ صوفیوں میں، جو توحید وجودی کے قائل ہیں، ان کے نزدیک ہر چیز اپنی ہستی سے نالاں ہے۔ اور طبعاً اپنے مبداء سے اتحاد و اتصال کے لیے کشش و کوشش کر رہی ہے اور اس کا مقصود یہی ہے کہ دریا میں فنا ہو جائے۔ یہی اس کا حق انجام ہے۔" (مہدی)

شعر۔۹ سلطان خضر (فرزند بہادر شاہ ظفر) کو گلستان شاہی کے ایک تازہ نہال سے تشبیہ دے کر ان کی سرسبزی کی دعا کی ہے۔

شعر۔ ۱۰ یعنی ویسے تو جنت کی حقیقت جیسی ہے، ویسی ہی ہے (یعنی کچھ نہیں ہے) لیکن ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ دل کے خوش کرنے کے لیے یہ خیال (یعنی جنت ملنے کا) اچھا ہے۔

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی نہ سہی   امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی
خار خارِ الم حسرتِ دیدار تو ہے   شوق گلچینِ گلستانِ تسلّی نہ سہی
مے پرستاں! خُمِ مے مُنھ سے لگائے ہی بنے   ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی
نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا   گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلی، نہ سہی
ایک ہنگامے پہ موقوف ہے، گھر کی رونق   نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی
نہ ستایش کی تمنا، نہ صلے کی پروا   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی
عِشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی، غالبؔ! اگر عُمرِ طبیعی، نہ سہی

شعر۔۱ یعنی اگر تجھ کو میرے مر جانے سے بھی تسلی نہیں ہوئی، اور کوئی اور امتحان لینا منظور ہے تو وہ بھی لے لے۔ امتحان کی خاطر نہیں مروں گا۔

شعر۔۲ یعنی شوق اگر گلستان تسلی میں گلچیں نہیں ہے (یعنی اگر اس کو تسلی نہیں ہے) تو نہ ہو، اس کے لیے حسرت دیدار کا رنج کافی ہے۔

شعر۔۳ خم: مٹکا۔ مے پرست: شراب خوار۔ مطلب یہ ہے کہ اے مے پرستو، اگر ایک روز ساقی نہیں ہے تو نہ سہی۔ اگر اور روز تکلف سے پیا کرتے تھے تو آج خم مے سے ہی منہ لگا کر پی لو۔ ایک روز کی بات ہی کیا ہے؟

شعر۔۴ اگر نفسِ قیس، جو کہ چشم و چراغ صحرا ہے، شمع سیہ خانہ لیلیٰ نہیں ہے تو نہ سہی، اس کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ صحرا کا چشم و چراغ ہے۔

شعر۔۵ یعنی گھر (دل) کی رونق ایک ہنگامہ پر منحصر ہے۔ بس اگر نغمہ شادی نہیں ہے تو نہ سہی۔ نوحہ غم میں سہی۔ اپنی کثرت محرومی کا اظہار کیا ہے۔ بھلا ایسے شخص کی جو نوحۂ غم و نغمہ و شادی میں تمیز نہیں کرتا۔ دنیا کے عیش و راحت سے محرومی کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟ مرزا کا اسی قسم کا ایک دوسرا

شعر بھی ہے؟

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے   بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

شعر۔۶ شروع شروع میں مرزا صاحب کے کلام پر سخت نکتہ چینیاں ہوا کرتی تھیں۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ ان کا کلام بالکل مہمل ہوتا ہے۔ اس پر ناراض ہو کر یہ شعر کہا ہے۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔۷ معشوق کی صحبت اگرچہ دل کش ہے لیکن انسان کی صحت اور اس کی زندگی پر بُرا اثر ڈالتی ہے۔ اور اس قسم کے لوگ عمرِ طبیعی تک پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں لیکن غالب کے نزدیک عمرِ طبیعی کی اتنی زیادہ قدر نہیں ہے کہ اس کے خیال میں حسینوں کی صحبت سے آدمی باز رہے۔

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم، آگے   کہ اپنے سایے سے سَر، پاؤں سے ہے دو قدم آگے
قضا نے تھا مُجھے چاہا، خرابِ بادۂ اُلفت   فقط "خراب" لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی   وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذتِ الم آگے
خدا کے واسطے، داد اِس جُنونِ شوق کی دینا   کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے
یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے   تمھارے آئیو، اے طُرّہ ہائے خم بہ خم! آگے
دل و جگر میں پُر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے   ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے
قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں، غالب!
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم، آگے

شعر۔۱ جبکہ آفتاب آدمی کی پُشت کی طرف ہوتا ہے تو اس کا سایہ سامنے پڑتا ہے۔ پس مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ ہم مقتل کو جلاد کے ساتھ اس شوق و خوشی کے ساتھ جاتے ہیں کہ ہمارا سر (شوق شہادت میں) پاؤں سے بھی دو قدم آگے رہتا ہے۔

شعر۔۲ یعنی قضا و قدر نے چاہا تھا کہ خراب بادۂ الفت رہوں لیکن میرا نصیب لکھے جاتے وقت قلم صرف لفظ خراب (یعنی تباہ و برباد) لکھ کر رہ گیا، اور آگے نہ چل سکا۔ یعنی خراب تو لکھ دیا اور اس کے آگے بادۂ الفت نہ لکھ سکا۔

شعر۔۳ جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی: یعنی عشق کا سارا نشہ اُتار دیا۔ مطلب یہ ہے کہ جب سے کہ غم دنیا ہمارے پیچھے پڑا ہے۔ ہم غم عشق کا مزا بالکل بھول گئے۔

شعر۔۴ صاف ہے۔

شعر۔۵ بددعا میں کس خوبی کے ساتھ دعا کا پہلو نکالا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے جو ساری عمر پریشانیاں اٹھائیں تو اے طرہ (زلف) خدا کرے، وہ ساری کی ساری تیرے سامنے آویں یعنی تجھ کو نصیب ہوں۔ زلف کو پریشانی کی بددعا ہے لیکن اصل میں زلف کی پریشانی اس کی صفت ہے۔

شعر۔۶ زعم: گمان۔ جگر سے یہاں مراد پھیپھڑا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کو ہم اپنا سانس سمجھتے تھے یہ دراصل موج خون کی پُر افشانی ہے۔

شعر۔۷ آگے، یعنی پہلے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے تو ان کو مجھ سے اتنی محبت اور میری اتنی عزت تھی کہ وہ میری جان کی قسم کھایا کرتے تھے لیکن انقلاب زمانہ دیکھیے کہ اب ایسی نفرت ہے کہ میرے جنازے پر بھی آنے سے انکار کرتے ہیں۔

شِکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے   یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے، تو گِلا ہوتا ہے
پُر ہوں میں شِکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا   اِک زرا چھیڑیے، پھر دیکھیے، کیا ہوتا ہے
گو سمجھتا نہیں، پر حُسنِ تلافی دیکھو   شِکوۂ جور سے، سر گرمِ جفا ہوتا ہے
عِشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال   سُست رَو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم   آپ اُٹھا لاتے ہیں، گر تیر خطا ہوتا ہے
خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ   کہ بھلا چاہتے ہیں، اور بُرا ہوتا ہے
نالہ جاتا تھا، پَرے عرش سے میرا، اور اب   لب تک آتا ہے، جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

قطعہ

خامہ میرا، کہ وہ ہے باربُدِ بزمِ سخن   شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے!
اے شہنشاہِ کواکب سپہ مہر عَلَم!   تیرے اِکرام کا حق کِس سے ادا ہوتا ہے
سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے   تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال　　　آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے
میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں　　　یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے
رکھیو، غالبؔ! مجھے اِس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سِوا ہوتا ہے

شعر۔۱ یعنی تو یہ بھی نہ کہہ کہ شکوہ کے نام سے وہ بے مہر خفا ہوتا ہے، کیونکہ تیرا یہ کہنا بھی تو شکوہ میں داخل ہے۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ''جو کہیے تو گلہ ہوتا ہے'' اتنا جملہ بھی زبان سے نہ نکال کیونکہ وہ بے مہر تو شکوہ کا نام لینے سے بھی ناراض ہو جاتا ہے۔

شعر۔۲ تھوڑی تبدیلی سے مرزا اسی خیال کو پہلے بھی باندھ چکے ہیں۔

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ　　　ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

ایک دوسرا شعر بھی ہے:

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو　　　حذر کرو میرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

شعر۔۳ یعنی جب معشوق سے میں ظلم کا شکوہ کرتا ہوں تو وہ دراصل میری بات تو سمجھتا نہیں۔ یہی سمجھ کر کہ میں اس کے ظلم سے نالاں ہوں، وہ (جیسا کہ معشوقوں کا انداز ہوتا ہے) اور ظلم کرتا ہے۔ حسن تلافی تو دیکھو کہ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ میں ظلم ہی کا خواہاں ہوں۔ مرزا صاحب ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں　　　ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

شعر۔۴ چرخ کوکب: ستارے دار آسمان۔ آسمان کو آبلہ پا اور ستاروں کو آبلوں سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔۵ ہدف: نشانہ۔ ناوک: تیر۔ یعنی جبکہ ہم کو اپنے محبوب کے ہدف تیر ناز بننے کا اس قدر شوق ہے کہ اگر اس کا تیر خطا بھی ہو جاتا ہے اور ہمارے نہیں لگتا، تو ہم خود اس کو (بغرض تجدید) اٹھا کر دے دیتے ہیں، تو پھر ہماری، اس کا نشانہ تیر ناز بننے کی آرزو پوری کیوں نہ ہوگی؟

شعر۔۶ یعنی ہم جو چاہتے ہیں۔ ہمیشہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اپنا بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے کیا اچھا ہوتا کہ ہم پہلے سے اپنا بُرا چاہتے تا کہ اس کے برعکس بھلا ہوتا۔

شعر۔۷ یعنی پہلے تو میرے نالہ میں یہ زور تھا کہ وہ فلک تک پہنچتا تھا لیکن اب اتنی کمزوری غالب آگئی ہے کہ جو نالہ سب سے زیادہ رسا ہوتا ہے وہ لبوں تک پہنچ کر رہ جاتا ہے۔

قطعہ شعر ۸۔۱۲ باربد: ایک مشہور مطرب کا نام ہے۔ نعل بہا: جو راجہ یا بادشاہ اپنے ملکوں کی آمدنی دوسرے قوی بادشاہ کو دے۔ بدر: چودھویں رات کا چاند۔ ہلال: پہلی شب کا چاند۔ (مطلب) خامہ میرا الخ۔ میرا قلم جو بادشاہ محفل کا باربُد ہے، بادشاہ کی تعریف میں اس طرح نغمہ سرائی (غزل خوانی) کرتا ہے (اے شہنشاہ الخ) کہ اے شہنشاہ۔ جس کی کہ ستارے فوج ہیں اور سورج جھنڈا ہے، تیری بخششوں کا کسی سے بھی حق ادا نہیں ہو سکتا۔ (سات اقلیم الخ) اگر ہفت اقلیم کی بھی مال و دولت جمع کی جائے تو وہ تیرے لشکر کا صرف نعل بہا ہوتا ہے (ہر مہینہ الخ) ہر مہینہ جو یہ بدر گھٹ کر ہلال ہو جاتا ہے، تو یوں کہنا چاہیے کہ وہ تیرے آستانہ (رفیع) پر ناصیہ فرسائی کرتا ہے (ہلال اور پیشانی میں مشابہت ظاہر ہے)۔ (میں جو الخ) اور میں جو یہ غزلخوانی کے قواعد میں کبھی کبھی گستاخی کرتا ہوں، یہ سب تیرے ہی فیض و کرم کی وجہ سے ہے۔

شعر۔ ۱۳ یعنی اے غالب میری اس سخت گوئی کو معاف کرنا۔ آج میرے دل کو ذرا زیادہ لگی ہوئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے تم کو اس قدر سخت و سست کہا ہے۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ ''تُو کیا ہے''؟　　　تمھیں کہو کہ '' یہ اندازِ گفتگو کیا ہے''؟
نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا　　　کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تُند خُو کیا ہے
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے　　　وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے
چپک رہا ہے بدن پر لہُو سے پیراہن　　　ہمارے جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا　　　کُریدتے ہو جو اَب راکھ، جستجو کیا ہے؟
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے، ہم نہیں قائل　　　جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے
وہ چیز، جس کے لیے ہم کو ہو، بہشت عزیز　　　سوائے بادۂ گُلفامِ مشکبُو، کیا ہے!
پیوں شراب، اگر خُم بھی دیکھ لُوں دوچار　　　یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے!

رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی   تو کس امید پہ کہیے کہ، آرزو کیا ہے!

ہُوا ہے شہ کا مُصاحب، پھرے ہے اِتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

شعر۔۱ 'تو کیا ہے' یعنی تیری حقیقت کیا ہے۔

شعر۔۲ یعنی میرا معشوق شوخی وتند خوئی، کرشمہ وادا کے لحاظ سے بالکل بے مثال ہے۔

شعر۔۳ یعنی مجھ کو دشمن کی بدآموزی کا بالکل خوف نہیں، لیکن آخر وہ (دشمن) تم سے ہمکلام ہی کیوں ہوتا ہے۔ مجھ کو اسی بات کا رشک ہے۔

شعر۔۴ یعنی ہم، جیسی کچھ حالت میں بھی ہیں، اچھے ہیں۔ کسی کی امداد یا احسان کی ضرورت نہیں۔

شعر۔۵ یعنی دل تو بدن کے ساتھ ہی جل گیا ہوگا۔ پھر راکھ کرید کر کیا تلاش کرتے ہو؟

شعر۔۶ یعنی وہ لہو ہی نہیں جو آنکھ سے آنسو بن کر نہ ٹپکے۔

مولانا شبلی کا بھی ایک شعر ہے:

شوریدۂ آں بادۂ تندیم کہ از جوش
از شیشہ بروں جست و از مینا بدر اُفتاد

شعر۔۷ یعنی شراب تمام نعمتوں سے اعلیٰ ہے۔ چنانچہ بہشت کی آرزو بھی صرف اسی وجہ سے ہے کہ وہاں خوب اچھی اچھی شراب پینے میں آوے گی۔

شعر۔۸ یعنی یہ شیشہ وقدح وکوزہ وسبو (ٹھلیا) کیا چیز ہیں؟ میں تو شراب کے خُم کے خُم اڑا جاؤں۔

شعر۔۹ یعنی اول تو طاقت گویائی ہی جاتی رہی۔ لیکن اگر بالفرض ہے بھی تو کوئی توقع نہیں کہ ہماری آرزو پوری ہوگی۔ اگر اظہار مدعا کیا تو یقیناً جواب نفی میں ملے گا۔

شعر۔۱۰ لفظ غالب میں ایہام تناسب ہے۔ اصل میں اپنے پردہ میں ذوق پر حملہ کیا ہے۔

میں اُنھیں چھیڑوں، اور کچھ نہ کہیں   چل نکلتے، جو مے پیے ہوتے
قہر ہو، یا بلا ہو، جو کچھ ہو   کاشکے، تم مرے لیے ہوتے!

میری قسمت میں غم گر اِتنا تھا   دِل بھی یارب! کئی دیے ہوتے

آہی جاتا وہ راہ پر، غالب!
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

شعر۔۱ صاف ہے۔

شعر۔۲ یعنی تم قہر ہو، یا بلا ہو خواہ کچھ ہی ہو۔ لیکن کاش تم میرے نصیب میں ہوتے۔

شعر۔۳ یعنی یاالٰہی اگر میری قسمت میں اس قدر غم اٹھانا لکھا تھا تو اس کو برداشت کرنے کی بھی طاقت دی ہوتی۔

شعر۔۴ راہ پر آجانا: یعنی راہ راست پر آجانا، ضد ومخالفت سے باز آجانا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم کچھ روز اور زندہ رہتے اور اس سے التجا کرتے رہتے تو وہ ضرور ہمارا کہنا مان لیتا۔

غیر لیں محفل میں، بوسے جام کے   ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تُم سے کیا شکوہ، کہ یہ   ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
خط لکھیں گے، گرچہ مطلب کچھ نہ ہو   ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے
رات پی زمزم پہ مَے، اور صبح دم   دھوئے دھبّے جامۂ اِحرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا، کیا مگر   یہ بھی حلقے ہیں تمھارے دام کے؟
شاہ کے ہے غُسلِ صحّت کی خبر   دیکھیے، کب دن پھریں حمّام کے!

عشق نے غالب! نِکمّا کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

شعر۔۱ محفل: مراد محفل معشوق۔ پیغام: یعنی پیغام طلب۔ جام اور تشنہ لب میں رعایت لفظی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قسمت کی خوبی تو دیکھیے کہ اغیار تو محفل معشوق میں شراب نوشی کے مزے اڑاویں اور ہم ترستے رہیں اور اسی جستجو میں رہیں کہ وہ (معشوق) اب بلاوے اور اب بلاوے۔

شعر۔۲ یعنی تم سے اپنی جستجو کا کیا گلہ کروں۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے، سب آسمان کا ستم ہے۔

شعر۔۳ یعنی ہم تمھارے نام کے عاشق ہیں اس لیے ہم تمھارے نام برابر خط لکھتے ہیں کہ اس

میں بار بار تمھارا نام لکھنے کا موقع ملتا ہے، لہٰذا خط لکھ لینا خواہ کوئی غرض ہو یا نہ ہو:

خوش دلم زیں کہ بادنامہ نویسم شب و روز   مقصدم نیست کہ مکتوب رسد یا نہ رسد

شعر۔۴ زمزم: کعبہ کے پاس ایک کنواں ہے جو کہ مسلمانوں میں نہایت متبرک سمجھا جاتا ہے۔ زاہدانہ مضمون ہے۔

شعر۔۵ مگر: شاید۔ مطلب یہ ہے کہ میری آنکھوں نے میرے دل کو تیرے جال میں پھنسا دیا ہے (کیونکہ تجھ کو دیکھنا تھا کہ دل جاتا رہا) اس لیے شاید یہ میری آنکھیں بھی تیرے ہی جال کے حلقے ہیں۔ چشم خانہ اور حلقہائے دام میں مشابہت ظاہر ہے۔

شعر۔۶ اس لیے کہ بادشاہ کا اس میں غسل کرنا، اس کی عزت ہے۔

شعر۔۷ صاف ہے۔

پھر اس انداز سے بہار آئی   کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو، اے ساکنانِ خطۂ خاک!   اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہوگئی ہے سر تا سر   رُو کشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی   بن گیا رُوئے آب پر کائی
سبزہ و گُل کے دیکھنے کے لیے   چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر   بادہ نوشی، ہے باد پیمائی
کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی، غالبؔ!
شاہ، دیندار نے شفا پائی

شعر۔۱ یعنی اس زور سے بہار آئی ہے کہ چاند سورج تک اس کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔

قطعہ۔شعر۔۲۔۶ روکش: مقابل (مطلب) دیکھو اے الخ۔ اے دنیا کے رہنے والو دیکھو اس کو عالم آرائی کہتے ہیں (کہ زمیں الخ) کہ زمیں (سبزۂ بہار کی وجہ سے) ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک چرخ نیلگوں کا مقابل بن گئی ہے۔ (سبزہ کو الخ) سبزہ اس کثرت سے اُگا ہے کہ ذرا سی جگہ بھی اس سے خالی نہیں۔ یہاں تک کہ صفحہ آب پر بھی کائی کی شکل میں موجود ہے۔ (سبزہ گُل الخ) ان تمام سبزۂ گل کے دیکھنے کے لیے چشم نرگس کو بینائی عطا ہوئی ہے۔ (ہے ہوائے الخ) ہوا میں فیضِ بہار سے شراب کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے اور ہوا خواری میں بھی بادہ خواری کی کیفیت حاصل ہے۔

مولانا حالیؔ اس آخری شعر کا مطلب بیان کرتے ہوئے یادگار غالب میں لکھتے ہیں: ''اس شعر میں بادہ پیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیے ہیں۔ باد پیمائی عبث وفضول کام کرنے کو کہتے ہیں۔ پس اس کے ایک معنی تو یہ ہوئے کہ فصلِ بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے اور جب کہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض باد پیمائی ہے، یعنی فضول کام ہے۔ اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہوگا۔ اور باد پیمائی خبر۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ باد پیمائی کو مبتدا اور بادہ کو خبر قرار دیا جاوے اور جس طرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں، اسی طرح باد پیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لیے جائیں۔ اس صورت میں یہ مطلب نکلے گا کہ آج کل ہوا کھانا بھی شراب پینا ہے۔''

شعر۔۷ صاف ہے۔

تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجز عالی ہے   اگر پہلو تہی کیجے، تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالَم، اہلِ ہمّت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبُو، میخانہ خالی ہے

شعر۔۱ پہلو تہی کیجیے: یعنی بے التفاتی برتیے۔ جا میری بھی خالی ہے: یعنی (میں سمجھوں گا کہ) میری عزت کی۔ قاعدہ ہے کہ جب کوئی بزرگ آتا ہے تو از راہ احترام اس کے واسطے جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میری طبیعت میں عجز وانکساری اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ میں تغافل ہی کو پسند کرتا ہوں۔ پس ایسی صورت میں اگر تم میرے ساتھ تغافل برتو گے تو میں یہ سمجھوں گا کہ میرا احترام کیا۔

شعر۔۲ ''کہتے ہیں دنیا اس وجہ سے آباد ہے کہ یہاں اہل ہمت مفقود ہیں۔ اگر اہل ہمت ہوتے تو وہ سب کچھ لٹا کر برابر کر دیتے اور دنیا ویران ہو جاتی۔ دوسرا مصرعہ مثالی ہے کہ جام سبو کا بھرا ہونا، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پینے والے نہیں ہیں ورنہ تمام جام وسبو خالی پڑے ہوتے۔'' (مہدی)

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری　　اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلِشِ غمزۂ خوں ریز نہ پُوچھ!　　دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کرکے مرا، روئیں گے یار　　مگر آشفتہ بیانی میری
ہوں زخود رفتۂ بیداے خیال　　بھول جانا ہے، نشانی میری
متقابل ہے، مقابل میرا　　رُک گیا، دیکھ روانی میری
قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں　　سخت ارزاں، ہے گرانی میری
گرد بادِ رہ، بیتابی ہوں　　صرصرِ شوق ہے بانی مری
دہَن اُس کا، جو نہ معلوم ہوا　　کھُل گئی ہیچ مدانی میری

کردیا ضُعف نے عاجز ، غالب!
ننگِ پیری ہے جوانی میری

شعر۔۱ صاف ہے۔

شعر۔۲ خوں ناب: صاف خون۔ یعنی اس کے غمزۂ خونریزی کی خلش کا اندازہ میری خون نابہ فشانی (یعنی میرے خون کے آنسوؤں) سے ہوسکتا ہے، پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

شعر۔۳ ’کیا بیاں کرکے؟ یہ ایک امر رسمی ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے احباب اس کی خوبیاں بیان کرکر کے رویا کرتے ہیں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ مجھ میں تو کوئی خوبی نہیں جس کو بیان کر کے میرے احباب مجھ کو روئیں گے، ہاں البتہ مجھ میں آشفتہ بیانی (شاعری) کی ضرور ایک صفت ہے۔ شاید وہ اسی کو بیان کرکے روئیں۔

شعر۔۴ بیدا: میدان۔ مطلب یہ ہے کہ میں ایسا ازخود رفتہ اور خیالات میں ایسا مستغرق رہتا ہوں کہ دنیا و مافیہا کو بالکل بھولا ہوا ہوں۔ اور یہ میرا بھولا رہنا ہی میری نشانی ہے۔ اگر مزید تجسس سے کام لیا جاوے تو جیسا کہ دیگر شارحین کی رائے ہے، ایک دوسرے معنی بھی پیدا ہوسکتے ہیں۔ خیال سے خیال احباب مراد لیا جاسکتا ہے۔ یعنی میں صحرائے خیال احباب کا ازخود رفتہ ہوں۔ دوستوں کے خیال سے ہمیشہ اُترا رہتا ہوں اور میرے احباب کا یہ میرا بھول جانا ہی میری پہچان ہے۔

شعر۔۵ مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہوئے مرزا صاحب نے خود اس شعر کے معنی بیان فرمائے ہیں۔ لکھتے ہیں ”تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا۔ نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و رنج وجود و عدم لفظ مقابل اس مصرعہ میں بمعنی مرجع ہے، جیسے کہ حریف، کہ بمعنی دوست کے بھی مستعمل ہے مفہوم شعر یہ ہے کہ ہم اور دوست از روئے خوئے و عادات ضد ہمدیگر ہیں۔ وہ میری طبع کی روانی دیکھ کر رک گیا۔“ (عودِ ہندی)

شعر۔۶ ”گرانی کے معنی بھاری پن کے ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی۔ کہتا ہے کہ میری قدر اس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہو اور ہر شخص آتے جاتے اس پر پانو رکھ کر گزرے یعنی ہوں تو گراں قدر، مگر اس پتھر کی طرح بے قدر ہوں۔ پس میری گرانی کس قدر ارزانی ہے۔“ (یادگارِ غالب)

شعر۔۷ گردباد: بگولہ جو کہ تیز ہوا سے پیدا ہوتا ہے۔ صرصر: تیز ہوا، آندھی۔ مطلب یہ ہے کہ میں رہ گزار بے تابی کا گرد باد ہوں (یعنی بگولہ کی طرح بے قرار رہتا ہوں) اور میری بانی (میری بے قراری کا باعث) صرصرِ شوق ہے۔

شعر۔۸ یعنی جب مجھ کو اس کا دہن نہیں ملا تو میری ہیچمدانی ظاہر ہوگئی۔ اس لحاظ سے کہ معشوق کا دہن ہیچ ہوتا ہے۔ پس اس کا نہ جاننے والا اپنے آپ ہیچمدان ہوگا۔ ہیچمدانی کا استعمال نہایت ہی پُرلطف ہے۔

شعر۔۹ ننگ: شرم: مطلب یہ ہے کہ غالب ضعف نے مجھ کو بالکل عاجز کردیا ہے۔ مجھ کو جوانی ہی میں اتنا ضعف ہے کہ اگر وہ ضعف کسی کو پیری میں بھی ہوتا تو ننگ پیری ہوتا۔

نقشِ نازِ بُتِ طنّاز، بہ آغوشِ رقیب　　پاے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
تو وہ بدخو کہ، تحیّر کو تماشا جانے　　غم وہ افسانہ کہ، آشفتہ بیانی مانگے

وہ تبِ عشق تمنا ہے کہ، پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

شعر۔۱ مور کا تمام بدن بہت خوبصورت ہوتا ہے، لیکن صرف اِس کے پیر بدصورت ہوتے ہیں۔ اسی لحاظ سے معشوق تو خوبصورت ہے اور رقیب بدصورت بس شاعر کہتا ہے کہ رقیب ایسا بدصورت ہے کہ اگر اس بُت طناز کے ناز کرنے کی تصویر رقیب سے ہم آغوشی کی حالت میں کھینچی

جاوے تو مصوّر کو خامۂ مانی کی جگہ پائے طاؤس کے قلم کی ضرورت محسوس ہو۔ یعنی رقیب کی وجہ سے تصویر کا حُسن بالکل جاتا رہے اور اتنی بدشکل ہو جاوے کہ بدشکلی کی موزونیت سے اِس کے کھینچنے کا قلم بھی پائے طاؤس کا ہو۔

شعر۔۲ یعنی تیری بدمزاجی کا تو یہ عالم ہے کہ تو تحیّر کو ایک تماشا اور سامان تفریح سمجھتا ہے اور اسی تماشہ کی خاطر تو یہ چاہتا ہے کہ میں تحیّر میں رہوں۔ لیکن میرا غم (وہ افسانہ پُرسوز ہے کہ) تحیر کا مانع ہے اور آشفتہ بیانی کا مقتضی ہے۔ بس میں اسی کشمکش میں مبتلا ہوں۔

شعر۔۳ یعنی میں ایسے تپ عشق کی تمنا رکھتا ہوں کہ جس کا شعلہ شمع (لو) کی طرح جگر کی نبض تک ریشہ دوانی کرے۔ (یعنی دوڑے) جگر سے اندرونِ سینہ مراد ہے۔

گلشن کو تری صحبت از بس کہ خوش آئی ہے   ہر غنچے کا گُل ہونا، آغوش کُشائی ہے
واں کُنگرِ استغنا، ہردم ہے بلندی پر   یاں نالے کو اور اُلٹا، دعوائے رسائی ہے
ازبسکہ سِکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا، اک چشم نُمائی ہے

شعر۔۱ یعنی باغ کو تیری صحبت بہت ہی مرغوب ہے۔ اس لیے اس میں جو غنچے کھلتے ہیں وہ دراصل تجھ سے بغل گیر ہونے کے لیے اپنا آغوش کھولتے ہیں۔

شعر۔۲ کنگرہ: جو کہ عمارت کے اوپر چاروں طرف بناتے ہیں۔ استغناء: لاپروائی۔ مطلب یہ ہے کہ واں ان کی لاپروائی و بے رخی تو برابر دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہے لیکن یاں میرے نالہ کو الٹا اپنی رسائی اور کامیابی کا دعویٰ ہے۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟

شعر۔۳ داغ، صورت میں آنکھ سے مشابہ ہوتا ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ غم مجھ کو ضبط کی تعلیم دے رہا ہے۔ چنانچہ (غم کی وجہ سے) جو نیا داغ پیدا ہوتا ہے وہ گویا اُستاد کی طرح نالہ و فریاد پر چشم نمائی کرتا ہے (یعنی ضبط کی تاکید کرتا ہے)۔

جس زخم کی ہوسکتی ہو تدبیر رفو کی   لِکھ دیجیو یارب! اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سرانگشتِ حِنائی کا تصور   دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عُشاق کی بے حوصلگی سے؟   یاں تو کوئی سُنتا نہیں فریاد کِسُو کی
دشنے نے کبھی مُنھ نہ لگایا ہو جگر کو   خنجر نے کبھی بات نہ پُوچھی ہو گلو کی
صد حیف وہ ناکام، کہ اِک عُمر سے، غالبؔ!
حسرت میں رہے ایک بُتِ عَربَدہ جُو کی

شعر۔۱ یعنی مجھ کو تو وہ زخم درکار ہے جس میں کہ ٹانکے نہ لگ سکیں۔ اپنی ایذا دوستی کا اظہار کیا ہے۔

شعر۔۲ ''لفظ 'تو' نے جو دوسرے مصرعہ میں ہے، یہ معنی پیدا کر دیے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے دل میں خون کا قطرہ بھی باقی نہیں رہا۔ اس لیے دوست کے سرانگشتِ حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے۔'' (یادگار غالب)

شعر۔۳ ''بے حوصلگی یعنی کم ظرفی۔ یہاں سے مراد دنیا ہے۔ معشوق سے کہتا ہے کہ تو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے جور و ظلم سے تنگ آ کر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کریں گے، کیونکہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو کوئی کسی کی فریاد نہیں سنتا۔'' (یادگار غالب)

شعر۔۴ گلو یعنی گلا۔ دشنہ و خنجر سے مراد معشوق کے ناز و انداز ہیں۔

شعر۔۵ ناکام: نامراد۔ عربدہ جو: جنگ جو، لڑاکا۔ عربدہ جوئی: اور شر پسندی صفت معشوقیت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ افسوس ہماری ساری عمر ایک معشوق عربدہ کی حسرت میں گزر گئی لیکن ہماری آرزو پوری نہ ہوئی۔

سیماب، پُشت گرمیِ آئینہ دے ہے، ہم   حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے
آغوشِ گُل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے

شعر۔۱ پشت گرمی: پشت بانی، اعانت۔ دل بے قرار کو سیماب (پارہ) سے اور اپنے آپ کو بہ رعایت حیرانی کے آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے پارہ کی مدد سے شیشہ آئینہ بن جاتا ہے اسی طرح سے میرے دل کی بے قراری (بے سیماب) نے مجھ کو آئینہ حیرت

1-D

بنادیا ہے۔

شعر۔۲ یعنی رخصت ہونے کے لیے پھول آغوش کھولے ہوئے ہیں، اس لیے اے عندلیب بس اب چلنا چاہیے کہ بہار ختم ہونے کو ہے۔

ہے وصل، ہجر، عالم تمکین و ضبط میں　　معشوقِ شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے
اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو، ہاں
شوقِ فضول و جرأت رندانہ چاہیے

شعر۔۱ یعنی وصل کی رات معشوق کو شوخ اور عاشق کو دیوانہ ہونا چاہیے (کیونکہ اسی میں لطف ہے) ورنہ اگر اس رات کو بھی معشوق نے تمکنت اور عاشق نے ضبط سے کام لیا، تو ایسا وصل بھی گویا ہجر ہی رہے گا۔

شعر۔۲ صاف ہے۔

چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے　　یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے
صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر　　جائے مَے، اپنے کو کھینچا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل!　　بارے، اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
چاک مت کر، جیب، بے ایامِ گُل　　کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے
دوستی کا پردہ، ہے بیگانگی　　مُنھ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو　　کِس قدر دُشمن ہے، دیکھا چاہیے
اپنی رُسوائی میں کیا چلتی ہے سعی　　یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
مُنحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید　　نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے
غافل! اِن مہ طلعتوں کے واسطے　　چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

شعر۔۱ یعنی جتنی محبت کرو اتنی اچھوں کے ساتھ کرو اور اگر حسن اتفاق سے وہ خود ہی محبت کرنے لگیں تو بس پھر دنیا میں کسی اور نعمت کی ضرورت نہیں۔

شعر۔۲ لفظ کھینچنا میں ایہام ہے۔ ایک معنی شراب کھینچنے (پینے) اور دوسرے معنی احتراز کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ رندوں کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہیے اور شراب کھینچنے (پینے) کی بجائے خود اپنے آپ کو کھینچنا چاہیے۔

شعر۔۳ ذرا اس سے پوچھنا چاہیے کہ تو نے کیا سمجھ کر عشق کیا تھا؟ (عشق کرنا ہمہ شما کا کام نہیں۔ یہ بڑے دل گردے کا کام ہے)

شعر۔۴ "پھول کھلنے کو چاک گریبان سے عموماً تشبیہ دی جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہر ایک کام نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہیے۔ پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے، تو بھی گریبان چاک مت کر۔ اس میں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں جوش جنوں زیادہ ہوتا ہے۔"
(یادگارِ غالب)

شعر۔۵ یعنی جیسا کہ تمھارا عام لوگوں کے ساتھ طرز عمل ہے، اسی طرح میرے ساتھ بھی بیگانہ وار رہو۔ ایسا کرنے سے ہماری دوستی کا حال چھپا رہے گا۔ یہ جو خصوصیت کے ساتھ تم نے مجھ سے پردہ شروع کیا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ کیونکہ تمھاری اس روش خاص سے خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول ہوگی اور اس طرح ہم بدنام ہو جائیں گے۔ کس خوبی کے ساتھ اپنے مطلب کا اظہار کیا ہے؟ مرزا آگے چل کر بھی لکھتے ہیں:

در پردہ انھیں غیر سے ہے ربط نہانی　　ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

شعر۔۶ مرزا پہلے لکھ چکے ہیں:

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں　　غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

بس مطلب یہ ہوا کہ رقیب میرا کس قدر دشمن ہے کہ اس نے میری دشمنی کی خاطر خود اپنے آپ کو بھی برباد کرلیا (کیونکہ نہ وہ شکایتاً میرا نام معشوق کے سامنے لیتا نہ وہ اس پر ناراض ہوتا)۔

شعر۔۷ یعنی اگر یار ہی ہنگامہ آرا ہو تو رسوائی ہو سکتی ہے، ورنہ خود عاشق کی کوشش سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

شعر۔۸ یعنی ہماری ساری امیدوں کا دارومدار اس بات پر ہے کہ صرف مرکر ہی ان تکالیف سے رہائی مل سکتی ہے۔ ناامیدی کی حالت اس سے بڑھ کر اور اس سے زیادہ خوبی کے ساتھ بیان نہیں ہوسکتی۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے   مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

شعر۔۹ یعنی اس بات کی ضرورت ہے کہ ان حسین معشوقوں کے لیے عاشق بھی خود حسین ہونا چاہیے۔

شعر۔۱۰ آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے، یعنی یہ منہ اور مسور کی دال۔ کسی شاعر کا شعر ہے:

تمنا حور کی کرتے ہیں حضرت   کوئی صورت تو دیکھے شیخ جی کی

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے   میری رفتار سے بھاگے ہے، بیاباں مجھ سے
درسِ عنوانِ تماشا، بہ تغافل خوشتر   ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے
وحشتِ آتشِ دل سے، شبِ تنہائی میں   صورتِ دُود، رہا سایہ گُریزاں مجھ سے
غمِ عشاق نہ ہو، سادگی آموزِ بُتاں   کِس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مُجھ سے
اثرِ آبلہ سے، جادۂ صحرائے جنوں   صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مُجھ سے
بیخودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو!   پُر ہے سایے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے
شوقِ دیدار میں، گر تو مجھے گردن مارے   ہو نگہ، مثلِ گُلِ شمع، پریشاں مُجھ سے
بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت، ہے، ہے!   سایہ خُرشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مُجھ سے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں، تجھ سے   آینہ داریِ یک دیدۂ حیراں، مُجھ سے

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے، اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

شعر۔۱ اپنی ناکامی ومحرومی کا اظہار کیا ہے کہ میں جتنا چلتا ہوں، اتنی ہی منزل مقصود مجھ سے دور ہوتی جاتی ہے۔ گویا بیابان میری رفتارِ مجنونانہ سے ڈر کر مجھ سے بھاگتا ہے۔

شعر۔۲ ”ظاہر ہے کہ ”رشتہ شیرازۂ مژگاں“ غیر محسوس ہوتا ہے۔ پس مطلب یہ ٹھہرا کہ کتاب یار کی دیدار کا درس یا (بحذف استعارات) محبوب کے دیدار کا لطف اسی حالت میں ہے کہ ہم اسے

دیکھیں، اور اسے ہمارے اس دیکھنے کا علم نہ ہو۔“ (حسرت)

شعر۔۳ یعنی شب تنہائی میں میری آتش دل کی وحشت سے (یعنی ڈر کر) مجھ سے سایہ دھوئیں کی طرح بھاگتا ہے۔

شعر۔۴ یعنی میرے مرجانے کی وجہ سے آئینہ کس قدر ویران معلوم ہوتا ہے اور اس میں کیسی بے رونقی پیدا ہوگئی ہے! خدا نہ کرے کہ معشوق غمِ عشاق میں اس طرح سادگی اختیار کرلیں اور اپنی زیب وزینت کو چھوڑ بیٹھیں۔

شعر۔۶ یعنی میں اپنی بیخودی کے باعث اپنے شبستان میں آرام سے پڑا ہوا ہوں۔ خدا کرے اس کو بھی فراغت نصیب ہو۔

شعر۔۷ یعنی جس طریقہ سے شمع گل کترنے (یعنی اس کی گردن مارنے) سے اور زیادہ روشن ہوجاتی ہے اور اس کی روشنی پھیل جاتی ہے، اسی طریقہ سے اگر تو میری گردن بھی ماردے (یعنی میرا سرقلم کردے) تو اس کے بعد بھی تیرے شوق دید میں میری نگاہ بے نور نہ ہوگی، بلکہ اور زیادہ روشن اور پریشان ہوجائے گی۔

شعر۔۸ یعنی شبہائے ہجر کی وحشت وخوفنا کی بتلاتے ہوئے میرا دل لرزتا ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ اس کی وحشت سے میرا سایہ تک بھی خلاف فطرت، سایہ خورشید قیامت میں جا چھپا ہے۔ دھوپ سے سایہ کے غائب ہوجانے کو اس کے اس میں چھپ جانے سے تعبیر کیا ہے۔

شعر۔۹ مطلب یہ ہے کہ ساغر صد جلوۂ رنگین (یعنی جلوۂ حسن) کی گردش تو تیرے سبب سے ہے اور دیدۂ حیراں (یعنی حیرتِ عشق) کی آئینہ داری میرے سبب سے ہے۔

طباطبائی صاحب اس کے معنی اس طرح بیان فرماتے ہیں ”تیرا جلوۂ رنگین اس کی محفل میں گردشِ ساغر کا کام کررہا ہے، اور میرا دیدۂ حیراں آئینہ کا۔ جلوہ کو ساغر اس لیے کہا کہ وہ بھی مثلِ ساغر، ہوش رُبا ہے۔

شعر۔۱۰ یعنی میرے نگہ گرم کی حدت سے باغ کے خس وخاشاک میں آگ لگ جاتی ہے۔

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے   کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بُلاتا تو ہوں اُس کو، مگر اے جذبۂ دل!   اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بِن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے   کاش! یوں بھی ہو کہ بِن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ، اگر   کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے
اِس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں، تو کیا   ہاتھ آئیں، تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کِس کی ہے   پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے
موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بِن آئے نہ رہے   تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ، تو بُلائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گِرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے   کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عِشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش، غالب!
کہ لگائے نہ لگے، اور بُجھائے نہ بنے

شعر۔۱ یعنی چونکہ اس میں نکتہ چینی کی عادت ہے، اس لیے ہم اپنا غم دل بھی اس کو نہیں سنا سکتے۔ اس مایوسی کے بعد شاعر کہتا ہے کہ جہاں کوئی تدبیر کارگر نہ ہو، وہاں کامیابی و مقصد براری کی کیا امید ہو سکتی ہے۔

شعر۔۲ یعنی میں اسے بلانے کو تو تیار ہوں، مگر اے جذبۂ دل اس پر کچھ ایسی کشش طاری ہو جائے کہ بس اس کو آنا ہی پڑے۔

شعر۔۷ یعنی میرے ستانے کو وہ صرف ایک کھیل سمجھتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں مجھ کو چھوڑ دے یا بھول جائے۔ کاش اس کو میرے ستائے بغیر چین ہی نہ پڑے۔

شعر۔۴ یعنی رقیب کو تیری رسوائی کا مطلق خیال نہیں۔ کیونکہ وہ تیرے خط کو کھلم کھلا لیے پھرتا ہے اس لیے ممکن ہے کہ اس خط کو دیکھ کر کوئی اس سے پوچھ بیٹھے کہ یہ کیا ہے اور اس کو بتانا پڑے کہ یہ تیرا خط ہے اور تو رسوا ہو جائے۔ اس طرح شاعر نے غیر کی حماقت اور معشوق کے خط کی واقفیت کا اظہار کر دیا ہے۔

شعر۔۵ ہاتھ آویں: یعنی مل جاویں۔ ہاتھ لگائے نہ بنے: یعنی نزاکت کی وجہ سے ان کو ہاتھ نہ لگا سکیں۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔۶ یہ باغ و بہار، آفتاب و مہتاب، آسمان و زمین جس کی جلوہ گری ہے، اسے کوئی نہیں بتا سکتا۔ اس نے اس رنگارنگی اور کثرت کا ایسا پردہ چھوڑا ہے کہ وہ کسی کے اٹھائے نہیں اٹھ سکتا۔" (مہدی)

شعر۔۷ یعنی میرے او پر شب انتظار میں جو کلفت ہے، وہ صرف دو صورت سے رفع ہو سکتی ہے۔ یا تو تم آؤ یا موت۔ لیکن تمھاری کیفیت یہ ہے کہ اگر نہ آؤ تو میں بلا بھی نہیں سکتا۔ اس لیے تمھاری آمد کو کیوں چاہوں۔ اور موت کا ہی راستہ کیوں نہ دیکھوں کہ وہ اس تکلیف میں یقیناً آ کر رہے گی۔

حسرت صاحب لکھتے ہیں "موت کی راہ دیکھنے سے کیا فائدہ۔ وہ تو خواہ مخواہ آئے گی ہی، تمھاری خواہش کرنا چاہیے کہ اگر تم نہ آؤ تو بلائے بھی نہ بن پڑے۔"

نظامی صاحب لکھتے ہیں "شاعر کہتا ہے کہ موت کی راہ کیوں نہ دیکھوں، کیونکہ اس کا آنا لازمی ہے۔ تم کو کیوں چاہوں کہ اگر نہ آؤ تو میں بلانے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا۔ مصنف نے اس شعر میں عشق و معشوق پر موت کو ترجیح دی ہے۔"

طباطبائی صاحب لکھتے ہیں "کہتے ہیں کہ موت کی راہ کیوں نہ دیکھوں کہ وہ بغیر آئے نہ رہے گی۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا کہ تم سے کہوں کہ تم نہ آؤ کہ پھر مجھے بلاتے بھی نہ بن پڑے۔ یعنی اب میں آنے کو منع کروں تو پھر کس منہ سے بلاؤں۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تمھارے نہ آنے سے موت کا آنا بہتر ہے۔"

شعر۔۸ صاف ہے۔

شعر۔۹ یعنی عشق پر ہمارا قابو نہیں ہے۔ نہ تو عشق کرنا اپنی خواہش اور طبیعت پر منحصر ہے، اور نہ اس کا ترک کرنا۔ یہ تو خداداد ہے۔ خدا کے لگائے ہی یہ آگ لگتی ہے اور اسی کے بجھائے بجھتی ہے۔

چاک کی خواہش، اگر وحشت بہ عُریانی کرے   صبح کے مانند، زخمِ دل گریبانی کرے
جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ، گر کیجے خیال   دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے
ہے شکستن سے بھی دل نومید، یارب! کب تلک   آبگینہ کوہ پر عرضِ گرانجانی کرے
میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست   مُوے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِّ عارض سے، لِکھا ہے زُلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے

شعر۔۱ یعنی اگر عریانی کی حالت میں وحشت (گریبان) چاک کرنے کی خواہش کرے، تو

میرا زخم دل گریبان بن کر صبح کی مانند چاک ہو جاوے۔

شعر۔۲ یعنی تیرے جلوے کا خیال کرنے سے میرے دل کو سخت حیرانی ہوتی ہے۔

شعر۔۳ آبگینہ: مراد آئینۂ دل۔ کوہ: مراد سنگدل معشوق۔ مطلب یہ ہے کہ اے خدا ہم کب تلک معشوق سنگ دل سے اپنی گراں جانی کا اظہار اور دل شکنی کی خواہش کرتے رہیں۔ ہم کو تو اب اس بات سے بھی ناامیدی ہو گئی ہے کہ وہ ہماری دل شکنی کرے گا۔

شعر۔۴ موئے شیشہ: شیشہ میں (چٹخنے سے) جو بال پڑ جاتے ہیں۔ مژگانی کرے: پلکیں بن جاوے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میکدہ چشم مست ناز معشوق کے اثر سے ٹوٹ جائے تو شیشہ میں جو بال پڑیں وہ باظہار حیرت، دیدۂ ساغر کی پلکیں بن جائیں۔

شعر۔۵ یک قلم منظور ہے: یعنی سب منظور ہے۔ لفظ قلم کے استعمال میں یہ رعایت بھی مقصود ہے کہ رخساروں پر بھی دونوں طرف قلمیں ہوتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کے رخساروں پر جو خط نکل آیا ہے، وہ دراصل ایک عہدنامہ ہے جو کہ میری الفت نے اس کی زلف کو لکھا ہے کہ جو کچھ (میرے حق میں) پریشانی کرے، مجھ کو سب منظور ہے۔

وہ آ کے، خواب میں، تسکینِ اضطراب تو دے   ولے مجھے تپشِ دل، مجالِ خواب تو دے
کرے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا   تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
دِکھا کے جنبشِ لب ہی، تمام کر ہم کو   نہ دے جو بوسہ، تو مُنھ سے کہیں جواب تو دے
پلا دے اُوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے   پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے شراب تو دے
اسدؔ! خوشی سے مرے ہاتھ پانْو پھول گئے
کہا جو اُس نے، "ذرا میرے پانْو داب تو دے"

شعر۔۱ یعنی وہ خواب میں آ کر مجھ کو اضطراب سے تسکین دیوے تو سہی، لیکن مشکل تو یہ ہے کہ تپش دل کی وجہ سے مجھ میں خواب کی طاقت ہی نہیں۔

شعر۔۲ تیری طرح کوئی تیغِ نگاہ کو آب تو دے: استفہام انکاری ہے۔ یعنی تیری طرح کوئی تیغ نگاہ کو آب (صیقل) نہیں دے سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ چشمہائے اشک کی وجہ سے تیری تیغ نگاہ میں

وہ آب پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کبھی خطا نہیں کرتی۔ یعنی بالفاظ دیگر کسی کی محبت میں تیرا رو دینا عشاق کے لیے قاتل ہے۔ قریب قریب اسی مضمون کا شعر پہلے بھی گزر چکا ہے۔

قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا   نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا

شعر۔۳ یعنی اگر تجھ کو بوسہ دینے میں عار ہے تو انکار ہی کر دے، تاکہ ہم مر ہی جائیں، جس کے لیے ایک جنبش لب کا صدمہ کافی ہے بمصداق:

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب   ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

شعر۔۴ یعنی اگر ساقی ہم کو اس قدر قابل تنفر سمجھتا ہے کہ ہم کو اپنے پیالے میں شراب دینا پسند نہیں کرتا، تو نہ دے۔ ہم اوک سے ہی پی لیں گے لیکن وہ شراب تو دے۔

شعر۔۵ صاف ہے۔

تپش سے میری، وقفِ کش مکش، ہر تارِ بستر ہے   مِرا سر رنجِ بالیں ہے، مِرا تن بارِ بستر ہے
سرشکِ سر بہ صحرا دادہ، نور العینِ دامن ہے   دلِ بے دست و پا اُفتادہ برخوردارِ بستر ہے
خوشا اقبالِ رنجوری! عیادت کو تم آئے ہو   فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے
بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی   شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے
ابھی آتی ہے بُو، بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی   ہماری دید کو، خوابِ زلیخا، عارِ بستر ہے
کہوں کیا، دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں، غالب!
کہ بے تابی سے ہر یک تارِ بستر، خارِ بستر ہے

شعر۔۱ یعنی میری تپش سے بستر کا ایک ایک تار ایذا میں ہے۔ میرے سر سے تکیہ کو تکلیف ہے۔ اور میرا بدن بستر کے واسطے وبالِ جان ہے۔

شعر۔۲ نور العین: آنکھ کا نور، مجازاً فرزند۔ سر بہ صحرا دادہ: آوارہ بے دست و پا۔ افتادہ: بغیر ہاتھ پانْو کے پڑا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ رفتۂ صحرانوردی کا آنسو دامن کا نور العین ہے اور مجھ عاجز کا دل بستر کا برخوردار ہے، یعنی یہ آرزوئے صحرانوردی میرے ہمیشہ روتے رہنے سے دامن کو آنسوؤں سے، اور میری بیچارگی اور عاجزی کی وجہ سے ہمیشہ پڑے رہنے سے، بستر کو دل سے

غایت انسیت ہوگئی ہے۔ اپنی کثرت یاس ومحرومی کا اظہار کیا ہے۔

شعر۔۳ یعنی میری بیماری کا اچھا نصیب ہے کہ تم میرے دیکھنے کو آئے ہو، تمھارے آنے کی وجہ سے طالع بیدار بسترِ (زدہ) فروغ شمع بالیں ہے۔ یعنی مجھ بیمار کا نصیب سرہانے رکھی ہوئی شمع کی طرح روشن ہوگیا ہے۔

شعر۔۴ یعنی میری شام تنہائی میں ایسا اضطراب اور ایسی گرمی ہے کہ بستر کا ہر اک تار بہ لحاظ حرارت واضطراب، روزِ محشر کے آفتاب کی کرن بن گیا ہے۔

شعر۔۵ بالش: تکیہ۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ شب وصال گزرے ہوئے اتنا تھوڑا زمانہ ہوا ہو کہ تکیہ سے سے اس کی زلف مشکیں کی بو تک نہیں گئی ہے، ہم کو زلیخا کی طرح صرف خواب میں یار کا دیدار نصیب ہونا، ہمارے بستر کے لیے ننگ وعار ہے۔

شعر۔۶ صاف ہے۔

خطر ہے، رشتۂ اُلفت رگِ گردن نہ ہوجائے
غرورِ دوستی آفت ہے، تُو دُشمن نہ ہوجائے

سمجھ اِس فصل میں کوتاہیِ نشوو نُما، غالبؔ!
اگر گُل سَرو کے قامت پہ، پیراہن نہ ہوجائے

شعر۔۱ رگ گردن: غرور، سرکشی۔ رگ اور رشتہ میں مشابہت ظاہر ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے اور تیرے درمیان جو اس درجہ غایت محبت اور انس پیدا ہوگیا ہے تو مجھ کو یہ خطرہ ہے کہ کہیں یہ رشتۂ الفت تیرا رگ گردن نہ ہوجائے، یعنی تجھ کو اس پر غرور نہ ہوجائے، کیونکہ اگر ایسا ہوگیا تو بس آفت ہی آجائے گی اور یہ تیری ساری دوستی مبدل بہ دشمنی ہوجائے گی۔ یا یہ کہ یہ ڈر ہے کہ رشتہ الفت، رگِ گردن کی طرح کٹ نہ جائے کیونکہ دوستی کا گھمنڈ بہت بڑا فتنہ ہے، جس سے اندیشہ ہے کہ تو دشمن ہوجائے گا اور اس کے باعث رشتۂ الفت منقطع ہوجائے گا۔

شعر۔۲ اگر گل سرو کے قامت پر پیراہن نہ ہوجائے: یعنی اگر شاخہائے گل کو اس قدر نمو نہ ہو کہ وہ سرو کے گرد لپٹ کر اس کو پھولوں کی قبا پہنا سکیں۔

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

کیوں بوتے ہیں باغباں تونبے؟
گر باغ گدائے مَے نہیں ہے

ہر چند ہر ایک شے میں تُو ہے
پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی!
ہر چند کہیں کہ، ہے نہیں ہے

شادی سے گُزر کہ، غم نہ ہووے
اُردی جو نہ ہو، تو دَے نہیں ہے

کیوں ردّ، قدح کرے ہے، زاہد!
مَے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے، نہ کچھ عدم، ہے غالبؔ!
آخر تو کیا ہے، ”اَے نہیں ہے؟“

شعر۔۱ ”یہ شعر سہل ممتنع ہے۔ ہر شخص کو یہ بات معلوم ہے کہ نالہ، نے (بانسری) کا پابند نہیں ہوتا اور فریاد کی کوئی لے نہیں ہوتی۔ اس لیے اس کا کوئی بھی ذکر نہیں کرتا، لیکن شاعر نے اسے دل نشین الفاظ میں ادا کر کے بھولی ہوئی بات یاد دلادی۔ ان واقعات سے مرزا کا دیوان بھرا پڑا ہے۔“ (مہدی)

شعر۔۲ تونبوں میں شراب رکھی جاتی ہے پس شاعر کہتا ہے کہ اگر باغ، شراب کا بھکاری نہیں ہے، تو پھر اس میں تونبے کیوں بوئے جاتے ہیں؟

شعر۔۳ ”ذات واجب الوجود اور کائنات علاحدہ مستقل ہستیاں ہیں، اگرچہ ان میں ایک خالق اور دوسری مخلوق ہے اور پہلی دوسری میں ساری ہے۔ اس شعر سے یہی خیال ظاہر ہوتا ہے۔ مرزا صاحب یہ نہیں کہتے کہ ہر شے میں تو ہی ہے، نہ یہ کہتے ہیں کہ ہر شے تیرا عکس یا پرتو ہے بلکہ وہ علاحدہ ہستیاں جان کر یہ شبہ یا حسرت ظاہر کرتے ہیں کہ ہر چند تو ہر چیز میں ہے لیکن جیسا کہ خود تو نے ارشاد فرمایا ہے کہ لیس کمثله شئی اس لیے ہر چیز میں ہونے سے تو ویسا ہی ہوجاتا ہے جیسی وہ چیز ہوتی ہے کہ جس طرح پانی کہ جس ظرف میں ہوتا ہے وہی شکل اس کی ہوتی ہے جو ظرف کی ہے۔“ (مہدی)

شعر۔۴ یعنی کوئی کتنا ہی ہستی یعنی موجودات کے حقیقی وجود پر اصرار کرے لیکن تم اس کو ہرگز نہ ماننا اور ہستی کا فریب نہ کھانا، یعنی اس کے وجود کو حقیقی سمجھ کر اس کے پھندے میں نہ پھنس جانا:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ　　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

شعر۔۵ رنج انسان کو اسی لیے ہوتا ہے کہ وہ خوشی و مسرت سے مقابلہ کرتا ہے مثلاً ہم کو خزاں کا اسی لیے غم ہوتا ہے کہ ہم بہار سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں کہ تم شادی سے قطع نظر کر لو تو پھر غم نہیں ہوسکتا۔ اروی (بہار کا مہینہ) نہ ہوگا تو دے (خزاں کا مہینہ) نہیں ہوسکتا۔" (مہدی)

شعر۔۶ مگس کی قے: شہد۔ "زاہد جو شہد کے پینے کو موجب ثواب سمجھتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے اس کو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کے قے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔" (یادگار غالب)

شعر۔۷ چونکہ اس غزل کی ردیف 'نہیں ہے' بار بار ہر شعر میں آتی ہے تو مخاطب اُکتا کر اپنے قائل سے کہتا ہے کہ اے جناب نہیں ہے، جبکہ نہ ہستی ہے اور نہ عدم ہے تو پھر یہ بتلایئے کہ آخر تو کیا ہے؟

نہ پُوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا　　　کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اِک نگہ کہ، بظاہر نگاہ سے کم ہے

شعر۔۱ ہیرا کاٹ کرتا ہے اور زخم کو کشادہ کرتا ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ میرے زخم دل کے مرہم کا نسخہ آپ کیا پوچھتے ہیں؟ اس میں سب سے بڑا حصہ الماس کا ہے، یعنی اس میں تمام وہ چیزیں ہیں کہ جن سے عموماً زخم بڑھ جاتا ہے۔ فیضی لکھتے ہیں:

نوش داروئے محبت را مپرس اجزا کہ چیست　　　سودۂ الماس در زہر ہلاہل می کنند

شعر۔۲ معشوق کی کثرت تغافل کا اظہار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک عرصۂ دراز کے بعد تو تیرے تغافل نے یہ اجازت دی کہ تو ایک نظر میری طرف دیکھے لیکن وہ بھی نگاہ بھر کر نہیں۔ لطف یہ ہے کہ بظاہر لفظاً بھی "نگہ" نگاہ' سے بقدر الف کم ہے۔

ہم رشک کو اپنے بھی، گوارا نہیں کرتے　　　مرتے ہیں، ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے

در پردہ اُنھیں غیر سے، ہے ربطِ نہانی　　　ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے
غالبؔ کو بُرا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

شعر۔۱ پہلے بھی لکھ چکے ہیں:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے　　　میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

شعر۔۲ ربطِ نہانی: پوشیدہ تعلق۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو در پردہ رقیب سے پوشیدہ تعلق ہے اور ان کا پردہ نہ کرنا، اس دوستی کی ظاہراً پردہ پوشی کے لیے ہے۔ بمصداق:

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی　　　منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

شعر۔۳ اربابِ ہوس: عشاق کاذب۔ مطلب یہ ہے کہ غالب کو جو تم بُرا کہتے ہو تو اچھا نہیں کرتے۔ کیونکہ تمھارے اس کو بُرا کہنے سے ارباب ہوس کو ناامیدی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے کہ جب تم نے غالبؔ جیسے عاشق صادق کو بُرا کہنے سے نہ چھوڑا، تو پھر بوالہوس کہاں بچ سکتا ہے۔

کرے ہے بادہ، ترے لب سے، کسبِ رنگِ فروغ　　　خطِ پیالہ، سراسر نگاہِ گلچیں ہے
کبھی تو اِس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے!　　　کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے
بجا ہے، گر نہ سُنے، نالہ ہائے بلبلِ زار　　　کہ گوشِ گُل، نمِ شبنم سے پُنبہ آگیں ہے

اسدؔ ہے نزع میں، چل بیوفا! برائے خُدا!
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

شعر۔۱ کسب: حاصل کرنا۔ بادہ کو گلچیں خط پیالہ کو نگاہ گلچیں اور معشوق کو گل سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شراب اپنا رنگ سرخ تیرے ہونٹوں کی سرخی سے حاصل کرتی ہے، اس لیے خطِ ساغر کو گلچین بادہ کی نگاہ کہنا چاہیے۔

شعر۔۲ ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے: یعنی ایک عرصہ سے تکیہ پر سر رکھنے کی حسرت رکھتا ہے۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔۳ نم شبنم کو باعتبار سفیدی، روئی سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی چونکہ پھولوں کے کان پر شبنم کی

روئی بھری ہوئی ہے۔ اس لیے اگر وہ نالہائے بلبل زار کو نہ سنیں تو بجا ہے کہ ان کو کان بند ہونے کی وجہ سے آواز نہیں پہنچتی، بحذف استعارات۔ مطلب یہ ہے کہ اگر محبوب اپنے عاشق کے حال زار کی طرف متوجہ نہ ہوں تو بیجا نہیں کیونکہ وہ نشۂ حسن وطرب میں اس قدر مخمور ہوتے ہیں کہ ان کو اس حال کی خبر نہیں ہوتی۔

شعر۔۴ یعنی غالبؔ جانکنی کی حالت میں ہے اور مرا ہی چاہتا ہے۔ اے بیوفا! خدا کے واسطے اس وقت تو اس کو دیکھ آ۔ ایسے وقت تجھ کو شرم وتمکنت نہیں کرنی چاہیے۔

کیوں نہ ہو چشمِ بُتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو؟ یعنی اِس بیمار کو نظّارے سے پرہیز ہے
مرتے مرتے، دیکھنے کی آرزو رہ جائیگی واے ناکامی! کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے
عارضِ گُل دیکھ، رُوے یار یاد آیا، اسدؔ!
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

شعر۔۱ تغافلِ معشوق کی کیا خوب توجیہ کی ہے۔ شعرا کی اصطلاح میں چشم معشوق کو 'بیمار' کہتے ہیں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ اس بیمار (چشم محبوب) کو نظارہ سے پرہیز ہے، اس لیے اس کا تغافل برتنا لازمی ہے۔ محض لفظی رعایت ہے۔

شعر۔۲ یعنی چونکہ اس کا خنجر (ناز) بہت تیز ہے، اس لیے میں ایک لمحہ میں قتل ہو جاؤں گا اور اس کو نہ دیکھ سکوں گا۔ کاش کہ میرے ذبح کے لیے اس کے پاس کوئی کند چھری ہوتی تا کہ گلا کٹتے کٹتے ہی میں اس کو دیکھ لیتا۔

شعر۳ مطلب یہ ہے کہ چونکہ عارض گل اور روے یار میں ایک قسم کی مشابہت ہے اس لیے عارض گل کو دیکھ کر مجھ کو روے یار یاد آ گیا۔ گویا جوششِ فصل بہاری (پھولوں کا کھلنا) اشتیاق (معشوق) پیدا کرنے والی ہے۔

دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے، کیا کہیے ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے
یہ ضد کہ آج نہ آوے، اور آئے بِن نہ رہے قضا سے شکوہ ہمیں کِس قدر ہے، کیا کہیے

رہے ہے یوں گہ وبے گہ، کہ کُوئے دوست کو اب اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کہیے؟
زہے کرشمہ! کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب کہ بِن کہے ہی اُنھیں سب خبر ہے، یا کہیے!
سمجھ کے کرتے ہیں، بازار میں، وہ پرسشِ حال کہ یہ کہے کہ، سرِ رہگزر ہے، کیا کہیے؟
تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے، کیا، کہیے!
اُنھیں سوال پہ زَعمِ جُنوں ہے، کیوں لڑیے ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے؟
حَسد، سزاے کمالِ سخن ہے، کیا کیجے سِتم، بہاے متاعِ ہُنر ہے، کیا کہیے!
کہا ہے کِس نے کہ، غالبؔ بُرا نہیں، لیکن
سواے اِس کے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہیے

شعر۔۱ دیا ہے دل: یعنی نامہ بر نے۔ اس کو: یعنی معشوق کو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر نامہ بر معشوق کو دل دے کر میرا رقیب بن بھی گیا تو اس سے کیا کہیں؟ آخر وہ بھی تو (ہماری طرح) انسان ہے۔

شعر۔۲ یعنی یہ امر مسلمہ ہے کہ موت آئے گی تو ضرور۔ لیکن (ہمارے کہنے سے) آج نہیں آتی۔ گویا اس کو ہم سے ضد ٹھہری۔ پھر ہم کو اس سے جتنی شکایت ہو، بجا ہے۔

شعر۔۳ گہ وبے گہ: وقت بے وقت۔ مطلب یہ ہے کہ رقیب وقت وناوقت ہمیشہ معشوق کے یہاں رہنے لگا ہے۔ ایسی صورت میں اگر ہم معشوق کے گھر کو دشمن کا گھر نہ کہیں تو پھر کیا کہیں؟

شعر۔۴ کرشمہ: ناز، ادا۔ غمزہ: آنکھ کا اشارہ۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے کرشمہ واشارہ نے مجھ کو خود دھوکا دیا ہے (اور دھوکا یہ ہے) کہ میرے دل میں یہ بات پیدا ہو گئی ہے کہ اس کو بغیر کہے ہی میرے حال کی سب خبر ہے۔ اور اس خیال سے میں اس سے اپنا حال بیان نہیں کرتا۔

شعر۔۵ یعنی معشوق اتنا شوخ ہے کہ وہ عمداً میرا حال بازار میں ہی پوچھتا ہے تا کہ بازار کی وجہ سے میں اس کو اپنا حال نہ بتلا سکوں۔ اور یہ کہہ دوں کہ 'سرِ رہ گزر ہے۔ راستہ چل رہا ہے۔ یہاں کیا بیان کروں۔"

شعر۶ یعنی ہمارے ہاتھ میں کوئی چیز ہے بتلائیے؟ لطف یہ ہے کہ خود ہی پہلے مصرعہ میں بتلا بھی چکے ہیں کہ 'سرِ رشتہ وفا' ہے۔

شعر۔۷ زعم: گمان۔ مطلب یہ ہے کہ وہ میرے سوال کرنے کو جنوں بتلاتے ہیں۔ میں ان کی

اس بات کا کیا جواب دوں۔ فضول لڑنے سے خاموش رہنا بہتر ہے۔

شعر۔۸ کیا کیجے، اور کیا کہیے، یہ دونوں جملے اظہار قناعت و بلاغت ولاچاری کی وجہ سے بولے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل زمانہ کی کچھ ایسی ناگفتہ بہ حالت ہے کہ اگر کسی کو شاعری و سخنوری میں عبور ہے، تو لوگ بجائے حوصلہ افزائی کے اس پر حسد کرنے لگتے ہین اور اگر کوئی ہنرمند ہوتا ہے تو اس کو اس ہنر کا صلہ یہ ملتا ہے کہ وہ طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتا ہے۔ اپنی ناقدر دانی کا اظہار کیا ہے۔

شعر۔۹ یعنی غالب بُرا ضرور ہے لیکن صرف اتنا ہی کہ آشفتہ سر ہے۔

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کرگئی وابستۂ تن میری عریانی، مجھے
بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مرحبا میں! کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے
کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے
بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا، کاشکے!
اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بُستانی مجھے
وائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے
وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے؟
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ! واہ!
پھر ہُوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے
دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے، غالبؔ! یوسفِ ثانی مجھے

شعر۔۱ دامن افشانی: مراد دنیا سے ترکِ تعلق کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا سے آزادگی کی ہماری در پردہ کوشش بالکل عبث ہے، کیونکہ عریاں ہونے (ترک علایقِ دنیا کرنے) پر بھی جسم کی پابندی باقی رہتی ہے۔

شعر۔۲ فساں: دھار رکھنے والا، سان۔ اپنے آپ کو بہ رعایت گرانجانی سنگ فساں سے تشبیہ دی ہے اور چونکہ اس گرانجانی کی بدولت معشوق سے ایک قسم کا تعلق ہوگیا ہے، اس لیے مصرعۂ ثانی

میں اس پر اظہار خوشی کیا ہے۔

شعر۔۳ پرسشہائے پنہانی: یعنی وہ پرسش جو بالمواجہ و کھلم کُھلّا نہ ہو بلکہ در پردہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ معشوق جانتا ہے اور اس کو اطمینان ہے کہ میں اس کی پرسشہائے پنہانی میں ہی محو ہوں اور اس کی بے التفاتی سے ہرگز ناخوش نہیں ہوں گا، اسی لیے وہ بے التفاتی میں اس قدر بے باک ہے۔

طباطبائی صاحب اس کے معنی اس طرح بیان فرماتے ہیں: "پرسشہائے پنہانی سے مطلب شاعر کا یہ ہے کہ کبھی تصور میں آکر اور کبھی خواب میں آکر جو وہ صورت دکھا جاتا ہے یا اس کی بے التفاتی سے جو حالت میری ہو رہی ہے، میں اسی میں محو ہوں۔ اور اسی سے اس کی خاطر جمع ہے، جو التفات نہیں کرتا۔"

شعر۔۴ گھر کی تباہی میں مرزا صاحب کا بھی ہاتھ تھا، اسی پر یہ شعر لکھا ہے۔

شعر۔۵ مرغِ بستاں: باغ کا پرند، مجازاً بلبل۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ کو بلبل کے ساتھ جو اتنا شوق ہے تو معشوق اس سے بدگمان ہوتا ہے۔ کاش ایسا ہوتا کہ مجھ کو بلبل سے اس قدر شوق نہ ہوتا کہ اس کو یہ بدگمانی نہ ہوتی۔ مرزا پہلے بھی لکھ چکے ہیں:

کیا بدگمان ہے مجھ سے کہ آئینہ میں میرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

شعر۔۶ یعنی میں تو اسی وجہ سے مرا تھا کہ قبر میں مجھ کو آرام ملے گا لیکن افسوس کہ وہاں بھی شورِ محشر نے چین نہ لینے دیا۔

شعر۔۷ ایک بالکل نئے پیرایہ میں معشوق سے ایفائے وعدہ کا تقاضا کیا ہے۔ معشوق کے حسب وعدہ گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح شکایتاً بیان کرنا کہ تم نے گھر کی دربانی مجھ کو سونپ دی ہے، بالکل نرالی بندش ہے۔ مرزا کا اک دوسرا شعر ہے:

بچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

شعر۔۸ یعنی موسم بہار کے آنے کی خوشی میں میرا سودائے غزلخوانی پھر تازہ ہوگیا ہے۔

شعر۔۹ مرزا غالبؔ کے بھائی مرزا یوسف تیس برس تک دیوانے رہے اور زمانہ غدر میں نہایت بے کسی کے عالم میں انتقال کیا۔ گویا بقول غالبؔ ان کو از سرِ نو زندگی حاصل ہوگئی۔ مرزا صاحب نے آگے چل کر بھی ایک شعر میں اس خیال کا اعادہ کیا ہے:

بیضہ آسا تنگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس   از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائے ہے

یاد ہے شادی میں بھی، ہنگامۂ یارب، مُجھے   سُبحۂ زاہد ہوا ہے، خندہ زیرِ لب مُجھے
ہے کُشادِ خاطرِ وابستہ دَر، رہنِ سخن   تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانۂ مکتب مُجھے
یارب! اِس آشفتگی کی داد کِس سے چاہیے   رشک، آسایش پہ ہے زندانیوں کی اب مُجھے
طبع ہے مشتاقِ لذّت ہائے حسرت کیا کروں!   آرزو سے، ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے
دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہوگئے
عِشق سے آتے تھے مانع، میرزا صاحب مجھے

شعر۔۱ ''یارب کے معنی فارسی محاورہ میں دہائی دینے کے ہیں، اور سُبحہ زاہد سے وہ ذکرِ خفی مراد ہے جو چپکے چپکے ہونٹوں پر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں شادی میں بھی مجھ سے شور، یارب نہیں بھولا ہے۔ میرا خندۂ زیرِ لب گویا زاہد کا ذکرِ خفی ہے''۔ (طباطبائی)

حسرت صاحب اس کے معنی یوں بیان فرماتے ہیں۔ ''جسطرح دانہائے تسبیح سے صورت خندہ نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن ان پر 'ذکر یارب' ہوتا ہے۔ اس طرح مجھے شغل شادی میں بھی ہنگامہ فریاد رہتا ہے، یارب کے لفظ میں ابہام ہے۔''

شعر۔۲ یعنی میں نے طلسمِ قفل ابجد سے ایک سبق پڑھا ہے اور وہ یہ ہے کہ جس طریقہ سے کہ اس کا کھلنا لفظ مقررہ کے بننے پر موقوف ہو، یا بالفاظ دیگر جس طرح سے کہ اس کا وا ہونا، در رہن سخن ہے، اسی طریقہ سے میری خاطر وابستہ کا کھُلنا در رہن سخن ہے۔ یعنی حاصل یہ کہ صرف شعر گوئی سے ہی میری طبیعت کو شگفتگی حاصل ہوتی ہے۔

شعر۔۳ لفظ 'اب' سے یہ معنی ترشح ہوتے ہیں کہ جبکہ میں زنداں میں تھا تو صحرا نوردی کی آرزو تھی۔ اور جبکہ میں صحرا میں ہوں تو زنداں کی خواہش ہے اور اس زنداں کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ اے خدا میرے اس جنوں کا بھی کچھ علاج ہے؟

شعر۔۴ یعنی میری طبیعت حسرت کی لذّتوں کی مشتاق ہے۔ اس کو حسرت ہی میں مزہ آتا ہے، اس لیے آرزو سے میری غرض یہی ہوتی ہے کہ میری آرزو پوری نہ ہو۔ کیوں کہ آرزو پوری نہ ہونے (یعنی شکست آرزو) میں مجھ کو حسرت کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

ہوں میں تماشائیِ نیرنگِ تمنا   مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی برآوے

شعر۔۵ مرزا صاحب یعنی مرزا غالب۔ مطلب یہ ہے کہ مرزا صاحب مجھ کو تو عشق کرنے سے منع کرتے تھے لیکن خود اپنے آپ کسی کو دل دے بیٹھے اور اُلٹے مجھ جیسے (یعنی عاشق) ہوگئے۔

حضورِ شاہ میں، اہلِ سُخن کی آزمایش ہے   چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمایش ہے
قد و گیسو میں، قیس و کوہکن کی آزمایش ہے   جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمایش ہے
کرینگے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر   ہنوز اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمایش ہے
نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہَوا خواہی!   اُسے یوسف کی بُوے پیرہن کی آزمایش ہے
وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ ''غافل تھے''   شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمایش ہے
رہے دل ہی میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو بہتر   غرض شِستِ بُتِ ناوک فگن کی آزمایش ہے
نہیں کچھ سُبحۂ و زُنّار کے پھندے میں گیرائی   وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمایش ہے
پڑا رہ، اے دلِ وابستہ! بیتابی سے کیا حاصِل؟   مگر پھر تابِ زُلفِ پُرشکن کی آزمایش ہے
رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو   ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمایش ہے
وہ آوینگے مِرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا، غالبؔ
نئے فِتنوں میں اب چرخِ کُہن کی آزمایش ہے

شعر۔۱ صاف ہے۔

شعر۔۲ قیس: مجنوں، عاشقِ لیلیٰ۔ کوہکن: لقب فرہاد، عاشق شیریں۔ دار: سُولی۔ رسن: رسّی، مجازاً پھانسی۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا امتحان قیس و کوہ کن کے امتحان سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اس کا تو صرف قد و گیسوئے یار سے ہی مقابلہ تھا لیکن جہاں (یا جس محفل میں) ہم ہیں، وہاں دار و رسن سے سابقہ ہے۔ چونکہ بادشاہِ وقت بہادر شاہ ظفرؔ خود مشاعرہ میں موجود تھے اور ان کی برگشتہ خاطری گویا پیغام اجل تھی، اِس لیے اپنی آزمایش کو زندگی و موت کا سوال بنایا ہے۔ دار و رسن کا استعمال بہ مناسبت قد و گیسو دلچسپی سے خالی نہیں۔

شعر۔۳ شیریں وفرہاد کے مشہور قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی تو فرہاد کا صرف جسمانی طاقت کا ہی امتحان ہے کہ اِس سے پہاڑ سے جوئے شیر کاٹ کر لانے کو کہا ہے۔ وہ وقت تو ابھی آنیوالا ہے جب کہ ہم اس کے حوصلہ کا بھی امتحان لیں گے۔ یعنی جب کہ ایک بُڑھیا اس کو شیریں کے مرنے کی خبر سُنائے گی اور وہ اتنا کم حوصلہ نکلے گا کہ اس خبر کو سنتے ہی تیشہ مار کر مرجائے گا۔

شعر۔۴ پیر کنعان: یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام۔ اس قصہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کے پیرہن کو ان کے بھائی وطن لے گئے تھے تو حضرت یعقوبؑ کو کوسوں سے پیرہن کی خوشبو پہنچ گئی تھی۔ مطلب یہ ہے۔ کہ نسیم مصر جو بوئے پیرہنِ یوسفؑ اپنے ہمراہ لائی، وہ اس وجہ سے نہیں کہ کچھ حضرت یعقوبؑ کی خاطر منظور تھی، بلکہ اس وجہ سے کہ اس کو یہ امتحان لینا منظور تھا کہ دیکھیں اس بُو کا حضرت یعقوب پر کیا اثر ہوتا ہے۔

شعر۔۵ یعنی آج اہل مجلس کے شکیب وصبر کا امتحان ہے۔ معشوق (ممتحن) بزم میں بس آیا ہی چاہتا ہے۔ خبردار ہو جاؤ۔ بعد کو پھر یہ نہ کہنا کہ ہم کو خبر نہ ہوئی۔

شعر۔۶ یعنی آج معشوقِ تیرانداز کے نشانہ کا امتحان ہے۔ اگر اس کا تیر دل ہی میں گیا تو نشانہ اچھا ہے اور اگر وہ جگر کے بھی پار نکل گیا تو اور بھی اچھا ہے۔ غرض اِن دونوں حالتوں میں سے ایک نہ ایک ضرور ہونی چاہیے۔ اُسی وقت اس کے نشانہ کو کامیاب کہہ سکتے ہیں۔

شعر۔۷ گیرائی: گرفت۔ مطلب یہ ہے کہ شیخ تسبیح اور برہمن زنار کے پھندے میں جو پھنسے ہوئے ہیں، تو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ تسبیح وزنار ان کو پکڑے ہوئے ہیں اور وہ اُن سے نکل نہیں سکتے۔ بلکہ اصل مقصد اُن کا یہ امتحان ہے کہ دیکھیں کون کب تک اپنی وضع کو نبھاتا اور وفادار (اگر شیخ ہو تو تسبیح سے اور برہمن ہو تو زنار سے) رہتا ہے۔

مولانا شبلی کا بھی ایک شعر ہے

دو دل بودن دریں رہ سخت ترعیبے ست سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

شعر۔۸ لفظ 'پھر' سے یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ عاشق کا دل پہلے بھی کئی مرتبہ معشوق کے زُلفِ پُرشکن کا امتحان کر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے دل وابستہ، تو جو اس قدر بیتاب ہو تو شاید پھر

معشوق کی زُلف پرشکن کو آزمانا چاہتا ہے۔ لیکن اِس سے کچھ فائدہ نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ چپکا پڑا رہ۔ کیوں کہ اس کی زُلف کے پیچ وخم ایسے نہیں کہ تو ان سے رہا ہو سکے۔ مرزا پہلے لکھ چکے ہیں:

تھا گریزانِ مژہ یار سے دل تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اسقدر آساں سمجھا

شعر۔۹ غم عشق کا زہر سے مقابلہ کیا ہے۔ یعنی ابتدا میں تلخ معلوم ہوتا ہے اور انجام کار رفتہ رفتہ گھلا کر مار ڈالتا ہے۔

شعر۔۱۰ وہ آویں گے میرے گھر؟ استفہام انکاری ہے۔ یعنی نہیں آئیں گے۔ نیا فتنہ: یعنی ان کے نہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو ان کو وعدہ کی پروا ہے اور نہ وہ میرے گھر آئیں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آسمان ان کے نہ آنے سے ہم کو کس کس مُصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے، مُجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے، مُجھ سے

خدایا! جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے!
کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کھنچتا جائے ہے، مُجھ سے

وہ بد خُو، اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے، مُجھ سے

اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پُوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے، مُجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے نااُمیدی! کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار، چھوٹا جائے ہے، مُجھ سے

تکلّف برطرف، نظّارگی میں بھی سہی، لیکن
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے، مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے، نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مُجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے، مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدّعی کا ہمسفر غالبؔ!
وہ کافر، جو خُدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے!

شعر۔۱ یعنی اگر اس کا مجھ پر نیکی کرنے کو جی بھی چاہتا ہے تو اس شرم کی وجہ سے کہ اس نے ساری عمر تو ظلم کیے ہیں، اب اس تھوڑی سی نیکی سے میری کیا تلافی ہو سکتی ہے، وہ مجھ پر نیکی نہیں کر سکتا۔

شعر۔۲ شاید میرے جذبۂ دل کی اُلٹی تاثیر ہے کہ میں اس کو جتنا اپنی طرف کھینچتا ہوں وہ اُلٹا اس طرف کھنچتا (یعنی کشیدہ خاطر ہوتا) ہے۔

شعر۔۳ عبارت مختصر: یعنی قصہ مختصر یہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری داستان عشق اتنی طول طویل

ہے کہ قاصد تک اس کو سُنتے سُنتے گھبرا جاتا ہے۔ پھر معشوق کا کیا کہنا۔ وہ بدخو کا ہے کو سُنے گا۔

شعر۔۴ صنعتِ لف ونشر مرتب ہے۔ یعنی اس کو تو اسقدر بدگمانی ہے کہ وہ میرے دعوئے محبت کو سراسر باطل سمجھتا ہے اور پوچھتا تک نہیں۔ اور مجھ کو (بیماری عشق کی وجہ سے) اتنی کمزوری ہے کہ میں بول تک نہیں سکتا۔ پھر یہ غلط فہمی کس طرح رفع ہو۔

شعر۔۵ یعنی اے ناامیدی تیرے ظلم کی آخر کچھ انتہا بھی ہے۔ کچھ تو دلجمعی کی صورت پیدا کر۔ خیال یار کا صرف ایک دامن میرے ہاتھ میں رہ گیا ہے۔ تو اُس کے چھڑوانے کی بھی فکر میں ہے۔ معشوق کی طرف سے مایوسی وناامیدی کو بہ غلو بیان کیا ہے۔

شعر۔۶ یعنی اگر میں اس کے دیکھنے کے لیے شامل ہونے میں کچھ تکلف (پس وپیش) نہ کروں اور شامل بھی ہو جاؤں تو کس کام کا۔ کیوں کہ مجھ سے (مارے رشک کے) یہ کب دیکھا جا سکتا ہے کہ اغیار بھی اس کو دیکھیں۔

شعر۔۷ ”اس میں وجدانی کیفیت کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ قویٰ جن سے عشق کے ترک کرنے یا اس کے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی، ابتدائے عشق میں انھیں کوئی صدمہ پہنچا ہے۔ بس اب نہ عشق ترک ہو سکتا ہے اور نہ اس پر صبر وتحمل کیا جا سکتا ہے۔“ میدان عشق میں بے بس ہو جانے کی کیا مثال دی ہے۔ (یادگار غالب)

شعر۔۸ خدا کو نہ سونپا جائے ہے: بوجہ بدگمانی۔ مطلب یہ ہے کہ غالبؔ غضب ہو گیا کہ وہ کافر (یعنی معشوق) جس کو میں جدا ہوتے وقت خدا کو بھی نہیں سونپتا، رقیب کا ہم سفر ہے۔

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے   کشاد و بستِ مژہ، سیلیِ ندامت ہے
نہ جانوں، کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی   تجھے کہ آینہ بھی ورطۂ ملامت ہے
بہ پیچ وتابِ ہوس، سلکِ عافیت مت توڑ   نگاہِ عجز سر رشتۂ سلامت ہے
وفا مقابل و دعوائے عشق بے بُنیاد
جُنونِ ساختہ و فصلِ گُل، قیامت ہے!

شعر۔۱ سیلی: گھونسا، تھپڑ۔ مطلب یہ ہے کہ تماشائے حُسن کی مشق، جنون کی علامت ہے، اس لیے آنکھ کا تماشائے حُسن کے واسطے بار بار کھُلنا، گویا سیلی ندامت کا پڑنا ہے۔

شعر۔۲ جوہر آئینہ کو ورطۂ ملامت سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آئینہ تک بھی تیرے لیے ورطۂ ملامت بنا ہوا ہے۔ اور تیری بدعہدی پر طعنہ زن ہے، نہیں معلوم پھر تیرا یہ داغِ طعنِ بدعہدی کیوں کر مٹے گا۔ ایک طرح معشوق کو وفائے عہد کی طرف مائل کیا ہے۔

شعر۔۳ یعنی عافیت کی لڑی کو ہوس کے بل دیکر مت توڑ۔ اگر سلامتی منظور ہے تو عجز وقناعت سے رہ۔ نگاہ (تارِ نظر) اور رشتہ کی تشبیہ عام ہے۔

شعر۔۴ یعنی غضب ہے کہ معشوق تو وفا پر آمادہ ہے لیکن (رقیب کا) دعوئے عشق جھوٹا ہے۔ اس کی مثال تو ایسی ہی ہے جیسے کہ بہار تو واقعی آئی ہو لیکن جنوں بناوٹ کا ہو۔

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا، دے مُجھے   میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مُجھے
کیا تعجب ہے کہ اُس کو دیکھ کر آ جائے رحم   واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مُجھے
مُنھ نہ دِکھلاوے، نہ دِکھلا، پَر بہ اندازِ عتاب   کھول کر پردہ، زرا آنکھیں ہی دِکھلا دے مُجھے
یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ مَیں
زُلف گر بن جاؤں تو شانے میں اُلجھا دے مُجھے

شعر۔۱ یعنی میں اس قدر لاغر ہو گیا ہوں کہ کوئی مجھ کو دیکھ کر پہچان نہیں سکتا۔ پھر تجھ کو اپنی محفل میں جگہ دینے میں کیا تامل ہے؟

شعر۔۲ یعنی میرا حال اس قدر قابل رحم ہے کہ اگر اسے دیکھ کر اس کو مجھ پر ترس آ جائے تو کوئی تعجب نہیں۔ پس کوئی اتنا کرم کرے کہ کسی حیلہ سے مجھ کو وہاں پہنچا دے۔

شعر۔۳ یعنی اگر تجھ کو اپنی صورت دکھانے میں دریغ ہے تو کم از کم پردہ ہٹا کر اپنی خشم آلودہ آنکھیں ہی دکھا دے۔

شعر۔۴ شانہ: کنگھی۔ مطلب یہ ہے کہ میری گرفتاری اس کو ایسی مرغوب ہے کہ اگر میں کسی طرح اس کی زلف بن جاؤں تو بھی وہ مجھ کو کنگھی میں الجھا لے گا۔

بازیچۂ اطفال ہے، دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا، مرے آگے

اِک کھیل ہے، اورنگِ سلیماں، مرے نزدیک
اِک بات ہے، اعجازِ مسیحا، میرے آگے

جُز نام، نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جُز وہم نہیں، ہستیِ اشیا، مرے آگے

ہوتا ہے نہاں، گرد میں، صحرا، مرے ہوتے
گھِستا ہے جبیں خاک پہ، دریا مرے آگے

مت پُوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو، خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں؟
بیٹھا ہے بُتِ آینہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گُل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گُزرا
کیوں کر کہوں، "لو نام نہ اُن کا مرے آگے"

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا مرے آگے

خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یُوں مر نہیں جاتے!
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش! یہی ہو
آتا ہے ابھی، دیکھیے، کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دَم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالب کو بُرا کیوں کہو، اچھا مرے آگے؟

شعر۔۱ بازیچۂ اطفال: بچّوں کا کھیل۔ یعنی دنیا میرے سامنے بچّوں کا ایک کھیل ہے۔ اور شب و روز اس کو میں صرف ایک تماشا سمجھتا ہوں۔

شعر۔۲ اورنگ: تخت۔ یعنی میری نظر میں تختِ سلیمانی اور اعجازِ مسیحا کی کوئی حقیقت نہیں۔

شعر۔۳ جس طرح عُنقا کا نام ہی نام ہے۔ اُس کی کوئی ہستی نہیں۔ اسی طرح ہم کائنات کا بجز نام کے کوئی وجود تسلیم نہیں کرتے۔ موجودات کی ہستی ہمارے آگے سوائے وہم و خیال کے اور کچھ نہیں۔

شعر۔۴ یعنی میری صحرا نوردی کے مقابلہ میں صحرا اور اشک باری کے مقابلہ میں دریا ہیچ ہے۔

شعر۔۵ یعنی جس طرح تو میرے آگے (یعنی میری موجودگی میں) مارے حیا کے پریشان رہتا ہے، اسی طرح میں بھی تیرے پیچھے تنگدل اور پریشان رہتا ہوں

شعر۔۶ یعنی تو جو مجھ کو خود بیں اور خود آرا کہتا ہے تو بالکل ٹھیک ہے۔ کیوں کہ جب تجھ جیسا آئینہ سیما میرے سامنے بیٹھا ہو تو میں اپنے آپ خود میں ہونگا۔ آئینہ کی رعایت سے خود بینی کا استدلال نہایت ہی پُر لُطف ہے۔

شعر۔۷ یعنی مضمون سجھانے والی جو چیز ہے وہ پیمانہ و شراب ہے۔

شعر۔۸ یعنی کوئی غیر اس کا نام میرے سامنے لیتا ہے تو میں تو از راہ رشک اُس کا نام لینے کو منع کرتا ہوں۔ لیکن لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ مجھ کو اس کے نام سے نفرت ہے۔ ایسی صورت میں اس کا نام لینے سے کسی کو کیوں کر منع کروں۔ لہٰذا اس رشک کو چھوڑ دیتا ہوں۔

شعر۔۹ یعنی ادھر تو کعبہ (ایمان) میرے پیچھے پڑا ہے اور روک رہا ہے کہ اُدھر نہ جا، اور اُدھر سے میرے سامنے کلیسا (کفر) مجھ کو بُلا رہا ہے۔ عجب کشمکش میں ہوں۔

شعر۔۱۰ یعنی مجھ کو معشوق فریبی میں ایسا ملکہ ہے کہ لیلیٰ تک بھی میرے مقابلے میں مجنوں کو بُرا کہتی ہے۔

شعر۔۱۱ یعنی شبِ وصل سے خوشی تو ضرور ہوتی ہے لیکن شادی مرگ کبھی نہیں ہوتی۔ میرے مرجانے کا باعث ضرور میری وہی دعا ہے جو میں نے شب ہجر میں مانگی تھی۔ میری اس رات کی مرنے کی تمنا اس وقت جا کر پوری ہوئی ہے۔ اپنی بدبختی کا اظہار کیا ہے۔

شعر۔۱۲ یعنی میری آنکھوں سے جو دریائے اشک خون بہہ رہے ہیں، تو کاش میری بلاؤں کا اسی پر خاتمہ ہو جائے۔ لیکن ایسا کاہیکو ہوگا۔ ابھی دیکھیے میرے سامنے کیسی کیسی مصیبتیں اور کیسی کیسی بلائیں نازل ہوتی ہیں۔

شعر۔۱۳ شراب کی مذمت کی ہے۔ یعنی شراب ایسی بُری چیز ہے کہ اگر اسکی عادت پڑ جائے تو آخر وقت تک نہیں چھوٹ سکتی۔ یا یہ کہ اپنی کثرت شراب نوشی کا اظہار کیا ہے کہ جب تک ذرا بھی دم میں دم باقی ہے، شراب نہیں چھوٹ سکتی۔

شعر۔۱۴ مرزا کی ذوق سے ہمیشہ چشمک رہتی تھی۔ اکثر اشعار میں ان پر حملہ کیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس شعر میں بھی اپنے پردہ میں ان ہی پر طعن ہو۔ اسی قسم کا ایک شعر پہلے بھی گزر چکا ہے:

ہُوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا　　وگر نہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

کہوں جو حال، تو کہتے ہو،"مُدّعا کہیے"　　تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو، تو کیا کہیے
نہ کہیو طعن سے پھر تم، کہ"ہم ستمگر ہیں"　　مجھے تو خُو ہے، کہ جو کچھ کہو،"بجا کہیے"
وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اُتر جاوے　　نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے؟
نہیں ذریعۂ راحت، جراحتِ پیکاں　　وہ زخمِ تیغ ہے، جس کو کہ دلکشا کہیے
جو مُدّعی بنے، اس کے نہ مُدّعی بنیے　　جو ناسزا کہے، اُس کا نہ ناسزا کہیے
کہیں حقیقتِ جانکاہیِ مَرض لکھیے　　کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے　　کبھی حکایتِ صبرِ گُریز پا کہیے
رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجے　　کٹے زبان، تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہیں نگار کو اُلفت، نہ ہو، نگار تو ہے　　روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے　　طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ!
خُدا سے کیا ستم و جورِ ناخُدا کہیے!

شعر۔۱ یعنی جب کبھی میں تم سے اپنی خستہ حالی اور تمھاری محبت کا حال بیان کرتا ہوں تو تم ہمیشہ یہی کہہ دیتے ہو کہ آپ کا مطلب کیا ہے؟ بھلا تم ہی بتلاؤ کہ جب تم ہی، جس کو میرا تمام حال معلوم ہے اس طرح تجاہل (عارفانہ) سے سوال کرو، تو میں اس کا کیا جواب دوں؟۔

شعر۔۲ یعنی میں تو تمھارا شیدا و دلدادہ ہوں۔ ہر طرح تمھاری دلجوئی و خاطر منظور ہے۔ اختلاف کا یارا نہیں کہ ممکن ہے کہ خفا ہو جاؤ۔ اس لیے تم جو کچھ کہتے ہو، خواہ غلط ہو یا صحیح، میں 'بجا' ہے کہہ دیتا ہوں۔ اس وقت جو تم نے طعن سے پوچھا کہ"ہم ستمگر ہیں" تو وہی حسب عادت میری زبان سے 'بجا' ہے نکلے گا، اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ آئندہ اس کی احتیاط رکھنا پھر کوئی بات طعن سے نہ پوچھنا۔

شعر۔۳ یعنی میں نے مانا کہ نشتر کی طرح اس کی نگاہ ناز کسی کی آشنا نہیں ہو سکتی لیکن جب وہ

میرے دل میں ہی اُتر گئی، تو پھر ہم اس کو آشنا کیوں کر نہ کہیں؟

شعر۔۴ یعنی صرف جراحت پیکاں سے میری تسکین نہیں ہو سکتی۔ جو زخم کہ میری دل کشائی اور فرحت کا باعث ہو سکتا ہے، وہ زخم تلوار ہے۔ بقول غالبؔ زخم تیر گی تو ہیں۔ بسبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کی تحسین بسبب ایک طاق سا کھُل جانے کے کی ہے۔

شعر۔۵ یعنی اگر تیرے ساتھ کوئی بُرا سلوک کرے تو بھی اُلٹ کر اُس کے ساتھ بُرا سلوک نہ کر۔
آگے چل کر بھی کہتے ہیں:

نہ سُنو گر بُرا کہے کوئی　　نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

شعر۔۶۔۷ یعنی ہمارا تو یہی شغل رہتا ہے کہ کسی کو اپنی بیماری کا حال لکھ رہے ہیں۔ کہیں دوا کی ناموافقت کا رونا رو رہے ہیں۔ کبھی سختیِ ایّام کی شکایت کر رہے ہیں۔ اور کہیں ان مصائب سے تنگ آکر صبر کھو دینے کی حکایت بیان کر رہے ہیں۔

شعر۔۸ یعنی اگر جان جاتی رہے تو قاتل کو بخش دیجیے۔ اور اگر زبان کٹ جائے تو خنجر قاتل کی ستایش کیجیے۔

شعر۔۹ یعنی اگر معشوق کو محبت نہیں ہے نہ ہو لیکن آخر تمھارا معشوق تو ہے۔ پھر اس کی بدگوئی کیوں کرتے ہو؟ اگر کچھ کہنا ہی ہے تو اس کی روش، اس کی ادا اس کی خوبیاں کرو۔

شعر۔۱۰ فرصت:۔ قرار۔ استقلال وہی مطلب ہے جو شعر سابق میں بیان ہو چکا ہے۔

شعر۔۱۱ یعنی اگر کوئی اذیت پہنچانے کی کوشش کرے لیکن اِس میں کامیاب نہ ہوا اور وقت نکل جائے تو پھر اس کی اس عداوت کو بھُول جانا چاہیے، اور شکایت نہیں کرنا چاہیے، کہ جو ہُوا، سو ہُوا۔ خدا، ناخدا میں صنعت تقابل نہایت دل کش ہے۔

رونے سے، اور عشق میں بیباک ہو گئے　　دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے
صَرفِ بہائے مَے ہوئے، آلاتِ میکشی　　تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے
رُسوائے دہر گو ہوئے، آوارگی، سے تم　　بارے، طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبُل کو بے اثر؟　　پردے میں گُل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پُوچھے ہے کیا وجود وعدم اہلِ شوق کا!   آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گِلہ   کی ایک ہی نگاہ کہ، بس خاک ہو گئے
اِس رنگ سے اُٹھائی کل اُس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

شعر۔۱ دھویا جانا: بے شرم وبیباک ہونا، پاک وآزاد۔ شُہدا۔ ''مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھوں سے آنسو نہ نکلے تھے تو اس بات کا پاس اور لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ مگر جب رونا ضبط نہ ہوسکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے رازِ عشق کا خیال جاتا رہا۔ اور ایسے بے شرم و بے حجاب ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کُھل کھیلے۔ اس مطلب کو ان الفاظوں میں ادا کرنا کہ رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے۔ بلاغت اور حُسن بیان کی انتہا ہے۔'' (یادگار غالب)

شعر۔۲ دوحساب: یعنی ایک تو یہ کہ شراب کہاں سے پئیں اور دوسرے کہ آلات میکشی کہاں باندھے باندھے پھریں۔ پس مطلب یہ ہوا کہ شراب پینے کے آلات بیچ کر شراب پی لینے سے (مندرجہ بالا) دونوں فکر سے نجات مل گئی۔

شعر۔۳ یعنی اگرچہ اپنی آوارگی کی وجہ سے سارے زمانہ میں بدنام تو ہو گئے لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا ہے کہ (زمانہ دیکھ کر) طبیعت کے بڑے چالاک ہو گئے ہو۔ اب کسی کے دھوکے میں آنے والے نہیں۔

شعر۔۴ یعنی نالہ بُلبُل کو کون بے اثر کہتا ہے؟ کیوں کہ اس کے اثر سے پھُول کا جگر چاک ہو گیا ہے (اس کے کھلنے کی طرف اشارہ ہے)۔

شعر۔۵ خس وخاشاک: کوڑا کرکٹ۔ مطلب یہ ہے کہ اہل شوق یعنی پرستانِ شاہد ازلی کا وجود وعدم کیا پوچھتے ہو؟ وہ خود اپنی آتشِ عشق کے نذر ہو گئے۔ یعنی محبوبِ حقیقی کی محبت میں فنا ہو گئے۔

شعر۔۶ ''شاہد حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے، اس کو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملے کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا ہے، جیسا کہ سحابیؔ بھی کہتا ہے رباعی

اے زاہد و عاشق از تو در نالۂ و آہ   دور تو و نزدیک ترا حال تباہ

پس شاعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے تغافل سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اس کی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے۔ جب اس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہم کو فنا کر دیا''
(یادگار غالب)

شعر۔۷ اس رنگ سے:- یعنی ایسی ذلّت وتحقیر کے ساتھ۔ باقی مطلب صاف ہے۔

نشہ ہا شادابِ رنگ و سازہا مستِ طرب   شیشۂ مَے، سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے
ہمنشیں مت کہہ کہ ''برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست''   واں تو، میرے نالے کو بھی، اعتبارِ نغمہ ہے

شعر۔۱ مے کو باعتبار روانی کے جوئبار (نہر سے تشبیہ دی ہے۔ اور شیشۂ مے کو باعتبار سبزی، اس جوئبار نغمہ کا سرو ٹھہرایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محفل معشوق میں ایسا سرور ہے کہ خود نشے اِس کے رنگ سے شاداب ہیں، اور باجے جو بج رہے ہیں وہ بھی نشۂ طرب سے مست ہیں اور شیشۂ مے جوئبار نغمہ کا سرو بنا ہوا ہے۔

شعر۔۲ یعنی اے ہم نشین تجھ کو جو یہ گمان ہے کہ میں اپنے نالہ کی وجہ سے دوست کی محفل عیش برہم کر دوں گا، تو یہ سراسر غلط ہے۔ میری نالہ کشی موجب برہمی بزم عیش دوست نہیں ہوسکتی، کیوں کہ اس کی محفل میں تو عیش وطرب کا وہ رنگ طاری ہے، کہ وہاں جا کر میرا نالہ بھی نغمہ بن جاتا ہے۔ مرزا پہلے بھی لکھ چکے ہیں:

دور چشم بد، تری بزمِ طرب سے واہ وا   نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں، برائے خندہ ہے   دعویٰ جمعیّتِ احباب، جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ، محوِ عبرتِ انجامِ گُل   یک جہاں زانو تامّل در قفائے خندہ ہے
کُلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام   ورنہ دنداں در دل افشُردن، بنائے خندہ ہے
سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

شعر۔۱ یعنی جس طریقہ سے کہ دانتوں کی شوخیِ ناز کا اظہار صرف ہنسی کے موقع پر ہوتا ہے۔ اسی

طریقہ سے احباب کا دعویٰ جمعیت ہنسی کا مقام ہے۔ کیوں کہ یہ جمعیت محض چند روزہ ہے۔

شعر۔۲ یک جہاں زانو بمعنی کثرت غنچہ عدم میں اس لیے کہ کھلنے کے بعد غنچہ معدوم اور گُل پیدا ہوگیا۔ مطلب یہ ہے کہ کھلنے کے بعد غنچہ ایک بڑے سوچ وچار میں پڑا ہوا ہے کہ اس کا بھی وہی انجام ہونے والا ہے جو کہ اور پھولوں کا ہوا۔ گویا وہ (کھلنے کے بعد) محوِ عبرت ہے۔

شعر۔۳ دندان بدل افشردن: مصائب وتکالیف اُٹھانا۔ یعنی مشکل تو یہ ہے کہ کلفتِ افسردگی و مایوس الحالی کے ہوتے ہوئے عیش بیتابی حاصل نہیں ہوسکتا۔ ورنہ مصائب وتکالیف سے مضطرب رہنا بنائے خندہ، یعنی میرے عیش وراحت کا باعث ہے۔

شعر۔۴ یعنی احباب میری سوزش دروں سے بے خبر اور اس کے منکر ہیں۔ ورنہ حقیقتاً میری حالت یہ ہے کہ اگرچہ میرے لب آشنائے خندہ ہیں (یعنی میں بظاہر خوش ہوں) لیکن میرا دل محیطِ گریہ بنا ہوا ہے۔ 'محیط' اور 'آشنا' میں تناسب ہے۔ (آشنا تیراک کو بھی کہتے ہیں)۔

حُسن بے پروا، خریدارِ متاعِ جلوہ ہے   آینہ زانوے فکرِ اِختراعِ جلوہ ہے
تا کجا، اے آگہی! رنگِ تماشا باختن؟
چشمِ وا گردیدہ، آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

شعر۔۱ یعنی حُسن بے نیاز کو جلوہ گری کی خواہش پیدا ہوگئی۔ چنانچہ آئینہ اس خواہشِ جلوہ نمائی کا زانوئے فکر بنا ہوا ہے۔ آئینہ وزانو کی تشبیہ عام ہے۔

شعر۔۲ آگہی: خبرداری، ہوشیاری، تماشا: مرادتماشائے عالم۔ باختن: کھیلنا۔ مطلب یہ ہے کہ جلوۂ عالم بالکل بے ثبات ہے۔ اِس کا عرصۂ قیام یک چشمک سے زیادہ نہیں۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ (برائے مشاہدہ) آنکھ کا کھُلنا گویا اس کے رخصت کرنے کے لیے آغوش وداع کا کھُلنا ہے۔ اے آگہی پھر کب تک تو تماشائے عالم میں مُنہمک رہے گی؟

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی   مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
عالَم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر   کب تک خیالِ طرّۂ لیلا کرے کوئی

افسردگی نہیں طرب انشاے التفات   ہاں، درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
رونے سے اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے   آخر کبھی تو، عقدۂ دل وا کرے کوئی
چاکِ جگر سے، جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی   کیا فائدہ کہ جَیب کو رُسوا کرے کوئی
لختِ جگر سے، ہے رگِ ہر خار، شاخِ گُل   تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی
ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز   تو وہ نہیں کہ، تجھ کو تماشا کرے کوئی
ہر سنگ وخشت، ہے صدَفِ گوہرِ شکست   نقصاں نہیں، جنوں سے جو سودا کرے کوئی
سَر بَر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عُمر   فرصت کہاں کہ، تیری تمنّا کرے کوئی
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز   یہ درد وہ نہیں کہ، نہ پیدا کرے کوئی
بیکاریِ جنوں کو، ہے سر پیٹنے کا شغل   جب ہاتھ ٹوٹ جائیں، تو پھر کیا کرے کوئی
حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے، اسد!
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

شعر۔۱ ''صوفیہ کی اِصطلاح میں محادثت اور مسامرت (یعنی عبد اور معبود کے درمیان گفتگو ہونا) کے دو مرتبے ہیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ شاہد حقیقی کے ساتھ (اس معمولی لب ودہن سے بات چیت نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کے لیے دہانِ زخم پیدا کرنا چاہیے، یعنی جب تک دل تیغِ عشق سے مجروح نہ ہو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔'' (یادگارِ غالب)

شعر۔۲ ''یعنی تمام عالم مجنوں کا غبار ہے۔ اسے طُرّہ لیلیٰ کب تک خیال کرتے رہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات ایک دھوکا ہے۔ ہم کب تک معشوق حقیقی کی جلوہ گری سمجھتے رہیں'' (مہدی)

شعر۔۳ طرب انشا: خوشی پیدا کرنے والا۔ التفات مرادِ التفات معشوق۔ مطلب یہ ہے کہ محض افسردگی سے التفات معشوق کی خوشی میسر نہیں ہوسکتی۔ یعنی صرف دل کی افسردگی کے دکھانے سے معشوق کی توجہ ممکن نہیں۔ ہاں اگر کوئی سراپا درد بن کر معشوق کے دل میں اُتر جائے تو البتہ ممکن ہے۔

شعر۔۴ یعنی اے ہمنشیں! مجھے رونے پر ملامت نہ کر۔ اس لیے کہ کوئی کب تک مایوس رہے۔ آخر کبھی تو میرے دل کی آرزو پوری ہو، تاکہ تسکین کی صورت نکلے۔

شعر۔۵ یعنی جب جگر کے چاک کرنے سے بھی معشوق کے یہاں ہماری پرسش نہیں ہوئی تو پھر

فضول گریبان چاک کرکے اس (کی بے اثری) کو رسوا کرنے سے کیا فائدہ؟

شعر۔۶ یعنی چوں کہ جنگل میں ہر کانٹے میں میرے جگر کا ایک ٹکڑا چھدا پڑا ہے، اس لیے کانٹے میں گُل اور گُل میں گُلشن کی سی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسی صورت میں کوئی کب تک اس صحرا کی باغبانی کرتا رہے۔ یعنی اس میں لختِ جگر سے پھُول لگا تا رہے۔

شعر۔۷ یعنی تجھکو ہرگز کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ تیرے دیکھنے کے لیے ہماری ناقص نگاہیں اُلٹی برق نظارہ سوز کا کام کرتی ہیں۔ ایک جگہ اور لکھ چکے ہیں:

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حُسن کا   جوشِ بہار جلوہ کو جس کی نقاب ہے

ایک دوسرا شعر ہے:

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا   مستی سے ہر نگاہ تیرے رُخ پر بکھر گئی

شعر۔۸ خِشت: اینٹ۔ صدف: سیپی۔ گوہرِ شکست: مراد گوہرِ شکستِ سر۔ مطلب یہ ہے کہ جنوں سے سودا کرنے میں کچھ نقصان نہیں۔ کیوں کہ ہر سنگ و خشت (جو کہ لڑکے مجنوں پر مارتے ہیں) ایک صدف ہے کہ جس میں شکست سر کا ایک موتی نکلتا ہے۔

شعر۔۹ ''یعنی ساری عمر تو وعدۂ صبر آزما کے انتظار میں گزر گئی۔ پھر تیرے ملنے کی تمنا کِس وقت کی جاتی۔'' (یادگارِ غالب)

شعر۔۱۰ یاس خیز: مایوسی پیدا کرنے والا۔ یعنی دردِ عشق وہ درد نہیں کہ جس کو کوئی پیدا کر سکے۔ اِس میں کسی کوشش اور اختراع وایجاد کا نتیجہ ہمیشہ مایوس کن ہوتا ہے۔ مرزا پہلے بھی لکھ چکے ہیں:

عشق پر زور نہیں ہے، یہ وہ آتش غالبؔ   کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے[

''معنی آفرینی واخلاقی مضامین وایجاد واختراعِ لطایف ایسا وحشّی فن ہے جس سے یاس پیدا ہوتی ہے۔ پھر بھی اِس مرض میں مبتلا ہیں۔ ایجاد کے مناسبات سے (پیدا کرنا) اور درد کو پیدا کرنا جس کے لیے پیدائی نہیں، لطف سے خالی نہیں۔'' (طباطبائی)

حسرتؔ صاحب اس کے معنی یوں بیان فرماتے ہیں ''ایجاد کی طبیعت میں جو وحشت ہے وہ یاس خیز ہے، یعنی ہم وحشی طبع لوگ یاس کو ایجاد کیا کرتے ہیں اور اس طرح پر گویا مایوس ہونے پر مجبور ہیں۔''

شعر۔۱۱ مطلب یہ ہے کہ جنوں میں بیکار بیٹھے بیٹھے تو دل گھبراتا ہے مجبوری بیکاری سے اُکتا کر یہی

شغل کر لیتے ہیں۔ کہ بیٹھے ہوئے سر پیٹا کرتے ہیں لیکن جب ہاتھ بھی ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کریں۔

شعر۔۱۲ مطلب یہ ہے کہ پہلے شمع کی طرح دل گداختہ پیدا کرے پھر اس کے بعد فروغِ شعلۂ شمعِ سخن کی خواہش کر یعنی پہلے شعر کہنے کی صلاحیت پیدا کر اِس کے بعد شعر کہنے کا نام لے۔

ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی   میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی   ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی؟
چال، جیسے کڑی کمان کا تیر   دل میں ایسے کے جا کرے کوئی!
بات پر واں زبان کٹتی ہے   وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کُچھ!   کچھ نہ سمجھے، خُدا کرے کوئی
نہ سُنو، گر بُرا کہے کوئی   نہ کہو، گر بُرا کرے کوئی
روک لو، گر غلط چلے کوئی   بخش دو، گر خطا کرے کوئی
کون ہے، جو نہیں ہے حاجتمند؟   کِس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کِیا خِضر نے سکندر سے!   اب کِسے رہنما کرے کوئی؟
جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ!
کیوں کِسی کا گِلا کرے کوئی؟

شعر۔۱ یعنی اگر کوئی عیسیِ وقت ہے تو ہوا کرے، اگر وہ میری بیماری (عشق) کا علاج کرے تو میں جانوں۔

شعر۔۲ یعنی مانا کہ مجرم کو سزا دینے کے واسطے دینی و دُنیوی دونوں قانون موجود ہیں۔ لیکن کوئی ایسے قاتل کا کیا کر سکتا ہے کہ بے تلوار اور بلا کسی ہتھیار کے قتل کرے۔ وہاں تو یہ دونوں عاجز ہیں۔

شعر۔۳ کڑی: سخت، مصرعۂ ثانی میں استفہام انکاری ہے یعنی ایسے شخص کے دل میں کوئی بھی جگہ نہیں کر سکتا۔

شعر۔۴ یعنی وہ تو کہا کریں اور ہم چپکے سُنا کریں۔ ذرا بھی مُنہ سے بات نکالیے تو زبان کٹتی ہے۔ بھلا یہ ستم بھی کسی نے دیکھا ہے؟

شعر۔۵ یعنی وحشت کی حالت میں نہ معلوم میری زبان سے سُدھ اور بے سُدھ کیا کیا نکل رہا ہے۔ خدا کرے کوئی میری بات سمجھ نہ سکے۔

شعر۔۶ یعنی اگر کوئی تم کو بُرا کہے تو اس طرف توجہ مت کرو اگر کوئی تمھارے ساتھ بُرا سلوک کرے تو صبر کر کے چُپ ہو جاؤ:

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے   جو نا سزا کہے اُس کو نہ نا سزا کہیے

شعر۔۷ یعنی اگر کوئی غلط راستہ پر چلے تو اس کو بچالو اور اگر کسی سے کوئی قصور ہو جائے تو اس کو معاف کردو۔ قریب قریب گذشتہ شعر کے ہم معنی ہے۔

شعر۔۸ یعنی سب ہی حاجتمند ہیں کوئی کس کس کی حاجت کو پورا کرے؟

شعر۔۹ یعنی اب کسی کی بھی رہنمائی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس واسطے کہ خضر سے بڑا رہنما کون ہو سکتا ہے۔ جب اِسی نے سکندر کو گمراہ کر دیا، تو پھر اور کسی رہنمائی پر کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ سکندر کے چشمۂ حیات کی تلاش میں جانے خضر کو اس کی رہبری کرنے، لیکن پھر بھی سکندر کے ناکامیاب رہنے کی طرف تلمیح ہے۔

شعر۔۱۰ یعنی مطلب براری ہے جب بالکل مایوسی ہی ہو گئی تو پھر کیوں کسی کی شکایت کی جاوے، کیوں کہ شکایت سے کچھ فائدہ تو ہوگا نہیں اور اُلٹی مخاصمت بڑھے گی۔

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے!   غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے!
تمھاری طرز و روش، جانتے ہیں ہم، کیا ہے   رقیب پر ہے اگر لُطف، تو سِتم کیا ہے؟
کٹے، تو شب کہیں: کاٹے، تو سانپ کہلاوے   کوئی بتاؤ کہ، وہ زُلفِ خم بخم کیا ہے؟
لکھا کرے کوئی، احکامِ طالعِ مولود   کسے خبر ہے کہ، وہاں جنبشِ قلم کیا ہے!
نہ حشر و نشر کا قائل، نہ کیش و مِلّت کا   خدا کے واسطے، ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟
وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہے، ہمدم!   وگر نہ مہرِ سُلیمان و جام و جم کیا ہے!
سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اُس میں دم کیا ہے

شعر۔۱ ساقی کوثر: حضرت رسول مقبول صلعم۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم کو دنیا کے بہت سے غم لگے ہوئے ہیں، تو کوئی ڈر نہیں۔ ان کے غلط کرنے کے لیے شراب بہت کافی ہے۔ رہی اب اس شراب پینے کے گناہ کی سزا۔ سُو اس کی بھی ہم کو فکر نہیں، کیوں کہ میں ساقیِ کوثر کا غلام ہوں۔ وہ اپنے غلام کی شفاعت خود کریں گے۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

مے ہی پھر کیوں نہ پیے جاؤں   غم سے جب ہو گئی ہے زیست حرام

(یعنی حرام حرام دونوں برابر)

شعر۔۲ مطلب یہ ہے کہ تمھارا جو ہمارے ساتھ برتاؤ اور رویہ ہے، ہم اس کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں (یعنی بُرا ہے)۔ پس جب تم رقیب پر مہربانی کرتے ہو تو ہماری شکایت عبث ہے۔

شعر۔۳۔۶ یہ اشعار مُرانے دیوانوں میں نہیں پائے جاتے۔ اردوئے معلّٰے میں مرزا صاحب نے ایک خط میں مولانا علائی کو تاکید کی ہے کہ ان کو درج حاشیہ کر لیا جاوے۔ اس لیے ہم نے ان کا اضافہ کر دیا ہے۔

شعر۔۷ سخن میں: یعنی شاعری میں۔

باغ، پا کر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے   سایۂ شاخِ گُل، افعی نظر آتا ہے مجھے
جوہرِ تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم   ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے
مُدّعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے   آینہ خانہ میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے
نالہ، سرمایۂ یک عالم و عالم، کفِ خاک   آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے
زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
دیکھوں، اب مر گئے پر، کون اٹھاتا ہے مجھے

شعر۔۱ خفقانی: اپنی طرف اشارہ ہے۔ افعی: اژدہا، سانپ۔ ''مطلب یہ ہے کہ باغ میں شاخِ گُل کا پانی میں سایہ دیکھ کر مجھ مجنوں کو سانپ کا گمان ہوتا ہے اور ڈر معلوم ہوتا ہے۔

شعر۔۲ جس طرح تیغ کا جوہر صرف زہر آب میں بجھانے سے نمودار ہوتا ہے، اسی طرح میں وہ سبزہ ہوں جس کی نشو و نما صرف غم و غصّہ سے ہوتی ہے۔ یعنی میری سرشت میں غم و غصّہ ہے۔ زہر

آب سے مراد غم اور غصہ سے ہے۔" (نظامی)

شعر۔۳ مطلب یہ ہے کہ حصولِ مدعا سے نا امیدی و مایوسی کے سبب سے میرا دل ٹوٹ گیا ہے اور چوں کہ دل کو شیشہ سے تعبیر کیا کرتے ہیں، اِس لیے شکست دِل سے (بہت سے آئینے ہوجانے کی رعایت سے) آئینہ خانہ کی صورت پیدا ہوگئی ہے اور اب مدعا اس شکست دل کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہے۔

شعر۔۴ یعنی میری نظر میں آسمان کی حقیقت ایک بیضۂ قمری اور دنیا کا وجود ایک مٹھی خاک سے زیادہ نہیں۔ اور جو کچھ اس عالم کا سرمایہ ہے وہ نالہ ہے۔ یعنی اس کا حاصل صرف رنج وغم ہے۔ آسمان اور بیضۂ قمری میں بلحاظ رنگ وشکل مناسبت ظاہر ہے۔

شعر۔۵ "کون اٹھاتا ہے مجھے، اس کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اُٹھا دیتے تھے۔ اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں سے کون اُٹھاتا ہے؟ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل سے تو اٹھا دیتے تھے، دیکھوں اب میرا جنازہ کون اُٹھاتا ہے۔" (یادگارِ غالب)

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہر یار کی   اِترائے کیوں نہ خاک، سرِ رہگوار کی
جب اس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ   لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
بھُوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم، ولے
کیوں کر نہ کھایئے کہ ہَوا ہے بہار کی

شعر۔۱ کوکبہ: ستارہ، جماعت، انبوہ۔ کوکبۂ شہریار: چشم شاہی مطلب یہ ہے کہ راستہ کی خاک کیوں نہ اترائے اس لیے کہ اس پر چشم شاہی کا گزر ہوا ہے۔

شعر۔۲ نمود: شہرت۔ یعنی جب بادشاہ لالہ زار کو دیکھنے گئے ہیں تو اسکی اپنے آپ شہرت ہوگی۔

شعر۔۳ ہوا کھانا: سیر کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ ویسے تو ہم کو سیر گلستاں سے زیادہ اشتیاق نہیں، لیکن چوں کہ بہار کا موسم ہے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اس لیے طبیعت نہیں مانتی ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ، ہر خواہش پہ دم نکلے   بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل، کیا رہیگا اُس کی گردن پر   وہ خوں، جو چشمِ تر سے، عمر بھر یُوں دم بدم نکلے
نکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں، لیکن   بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے
بھرم کھُل جائے، ظالم! تیرے قامت کی درازی کا   اگر اُس طُرّۂ پُر پیچ وخَم کا پیچ وخم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط، تو ہم سے لکھوائے   ہوئی صبح، اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے
ہوئی اِس دَور میں منسوب مجھ سے، بادہ آشامی   پھر آیا وہ زمانہ، جو جہاں میں جامِ جم نکلے
ہوئی جن سے توقّع، خستگی کی داد پانے کی   وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ سِتم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق، جینے اور مرنے کا   اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دَم نکلے
کہاں میخانے کا دروازہ، غالب! اور کہاں واعظ!
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

شعر۔۱ "خواہش پہ دم نکلنا۔ اُس کے پورے ہونے کے لیے جلدی کرنا۔ چنانچہ کہتے ہیں کیوں دم نکلا جاتا ہے یا کیوں مرے جاتے ہو، یعنی جلدی کرتے ہو۔ پہلے مصرعہ میں بمقتضائے مقام یہ الفاظ (نہ دلِ میں باقی ہیں) مقدر ماننا چاہئیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔" (یادگارِ غالب)

شعر۔۲ مطلب یہ ہے کہ قاتل میرے خون کرنے سے کیوں ڈرتا ہے، اس لیے کہ جو خون کہ اپنے مقام طبعی میرے جسم کے اندر نہ ٹھہر سکا اور ہمیشہ آنکھوں کی راہ بہتا رہا، وہ اس کی گردن پر کیسے رہ سکتا ہے؟ محض لفظی رعایت ہے۔

شعر۔۳ یعنی جس بے عزتی کے ساتھ ہم تیرے کوچہ سے نکالے گئے، وہ آدم نے بھی نہ اُٹھائی تھی۔ عاقل خان رازی کا بھی ایک شعر ہے:

نہ مرا کرد رقیب از سر کوئے تو جدا   اوّل اوّل ایں حادثہ بہ آدم وحوا بگذشت

شعر۔۴ بھرم کھل جائیگا: حقیقت آشکارا ہو جائیگی۔ زلفہائے معشوق کی درازی اور ان کے پیچ وخم کی دلفریبی کا اظہار کیا ہے۔ یعنی وہ اس کے قد سے بھی زیادہ لمبی ہیں اور اس کے قد میں جو کچھ کشش ہے وہ انھیں کی وجہ سے ہے۔

شعر۔۵ گویا کہ معشوق کی اکثر لوگوں سے خط وکتابت ہے اور یہ اس بات کی تلاش اور فکر میں ہیں کہ دیکھیں وہ ان کو کیا کیا لکھواتے ہیں۔

شعر۔۶ یعنی کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے ضرب المثل ہو گیا ہوں۔

شعر۔۷ ستم: مراد ستم فلک۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں سے کہ ہم کو یہ امید تھی کہ وہ ہماری خستگی کی کوئی چارہ جوئی کریں گے، وہ خود فلک کے ستارے ہوئے، ہم سے بھی زیادہ خستہ حالت میں ہیں۔ پیر خود درماندہ شفاعت کرا کند۔

شعر۔۸ یعنی شراب ایک ایسی چیز ہے کہ اس کو واعظ تک بھی چھپ چھپ کر پیتے ہیں۔

شعر۔۹ یعنی چوں کہ ہم جس پر مرتے ہیں، اسی کے دیکھنے سے ہماری زندگی ہے، اس لیے عشق میں مرنا اور جینا ایک ہی ہوا۔

شعر۔۱۰۔11 صاف ہے۔

کوہ کے ہوں بارِ خاطر، گر صدا ہو جایئے   بے تکلف، اے شرارِ جستہ! کیا ہو جایئے
بیضہ آسا تنگ بال و پَر ہے ہے کنجِ قفس
از سَرِ نو زندگی ہو، گر رِہا ہو جایئے

شعر۔۱ کیا ہو جایئے: یعنی شرار بن کر ایک دم میں فنا ہو جایئے۔ ''کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہو جایئے۔'' اِس لحاظ سے کہ آواز پہاڑ سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہے۔ (گویا اِس کے بارِ خاطر ہی ہوئی، جو واپس ہو گئی)

شعر۔۲ کنج قفس: یعنی دنیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے کہ پرندے کی اصل زندگی انڈے سے رہا ہونے کے بعد شروع ہوتی ہے، اسی طرح ہم اس بیضۂ فلک سے اسقدر تنگ آ گئے ہیں کہ اگر ہم اس سے رہا ہو گئے (یعنی مر گئے) تو ہم سمجھیں گے کہ ہم کو از سرِ نو زندگی عطا ہوئی۔

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے   موجِ شراب، یک مژۂ خواب ناک ہے
جُز زخمِ تیغِ ناز، نہیں دل میں آرزو   جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
جوشِ جُنوں سے کچھ نظر آتا نہیں، اسدؔ!
صحرا ہماری آنکھ میں اِک مشتِ خاک ہے

شعر۔۱ یعنی ساقی کی ادائے تغافل نے مستی کو بھی ہلاک کر رکھا ہے، چنانچہ شراب اس (کی غفلت شعاری) کے ذوق وشوق میں ایسی بے خود اور سرشار ہو رہی ہے کہ موج شراب چشم ساغر کی مژہ خواب ناک بنی ہوئی ہے۔

شعر۔۲ جیبِ خیال بھی تیرے ہاتھوں سے چاک ہے۔ یعنی خیال میں بھی کوئی بات تیرے تیغ ناز کا زخم لگنے کے سوا نہیں آتی۔ باقی مطلب صاف ہے۔

شعر۔۳ جنوں کی حالت میں صحرا نوردی لازم آتی ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ فرط جنوں کی وجہ سے اب مجھ کو نظر آنا بالکل بند ہو گیا ہے۔ گویا کہ صحرا نے ہماری آنکھ کے لیے یکمشت خاک کا کام کیا، یا یہ کہ جوشِ جنوں سے ہماری نظر میں کسی چیز کی بھی کوئی حقیقت نہیں رہی، حتیٰ کہ صحرا تک بھی یکمشت خاک سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا۔

لبِ عیسیٰ کی جُنبش، کرتی ہے گہوارہ جُنبانی
قیامت، کُشتۂ لعلِ بُتاں کا خوابِ سنگیں ہے

شعر۔۱ یعنی ہمیشہ دیکھا تو یہ گیا ہے کہ جنبشِ لبِ عیسیٰ سے مُردے خوابِ مرگ سے بیدار ہو جاتے ہیں۔ لیکن کشتگانِ لب معشوق کی نیند اس قدر گہری ہے کہ جنبشِ لبِ عیسیٰ، بجائے بیدار کرنے کے اور گہوارہ جنبانی کرتی، یعنی لوریاں دیتی ہے۔ حضرت عیسیٰ کے اِس معجزے کی طرف تلمیح ہے کہ آپ قُم بِاِذْنِ اللہ کہہ کر مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ قیامت کلمۂ تعجب ہے۔

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے   نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے اُنگلی جادہ سے
بزمِ مَے، وحشت کدہ ہے، کس کی چشمِ مست کا
شیشہ میں نبضِ پری پنہاں ہے، موجِ بادہ سے

شعر۔۱ نقشِ پا، صورت میں کان سے اور جادہ بسبب درازی، اُنگلی سے مشابہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ طوفان صدائے آب کو سُن کر نقشِ پا نے جادہ کی اُنگلی کان میں دے لی ہے، کیوں کہ سیلاب سے نشانِ پا مِٹ جاتا ہے۔

شعر۔۲ موج بادہ کو بلحاظ وحشت، نبضِ پری سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بزم شراب کسی چشم مست کے اثر سے وحشت کدہ بنی ہوئی ہے کہ بوتل میں شراب تک بھی اس سے متاثر ہو کر از وحشت اس طرح اچھل رہی ہے کہ گویا اس میں نبضِ پری پوشیدہ ہے۔

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا

مطلب نہیں کچھ اِس سے کہ مطلب ہی بر آوے

شعر۔۱ مطلب یہ ہے کہ میرا تمنا کرنے سے یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ پوری ہی ہو جائے، بلکہ میں تمنا صرف اِس لیے کرتا ہوں کہ میں بھی دیکھوں کہ اس میں کیا کیفیت (لذّت) ہے۔ مرزا پہلے بھی لکھ چکے ہیں:

طبع ہے مشتاق لذّت ہائے حسرت کیا کروں   آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر

مِری قسمت میں یُوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

شعر۔۱ فنِ تحریر ایجاد ہونے سے قبل اکثر ممالک مصر وغیرہ میں یہ دستور تھا کہ لوگ اپنے نفس مطلب کو بذریعہ تصاویر ادا کیا کرتے تھے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ لوحِ تقدیر پر جو میری شبِ ہجر کی تصویر ہے، وہ ایسی ہے جیسے کہ لکھتے وقت کاغذ پر سیاہی ٹپکنے سے سیاہ نشان پیدا ہو جاتا ہے۔

ہجومِ نالہ، حیرتِ عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بنداں ہے

تکلّف برطرف، ہے جاں ستاں تر، لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجابِ ناز، تیغِ تیزِ عُریاں ہے

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف، کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید، مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اِس بازار میں ساغر، متاعِ دست گرداں ہے

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے، عاشق کو
چراغِ روشن اپنا، قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

شعر۔۱ "میدان جنگ میں گروہ مغلوب ہو جاتا ہے تو اپنا اظہار عجز کرنے کے لیے گھاس پھوس وغیرہ مُنہ میں دبا کر دکھاتے ہیں کہ لڑائی موقوف کرو۔ یہاں ہجوم نالہ نے لشکر کشی کی ہے اور حیرت ایک نالہ کرنے میں بھی عاجز ہے۔ اور اسی عجز کا اظہار کرنے کے لیے خموشی الخ۔ لیکن خس بدنداں ہونے کے لیے ریشہ نیستاں کی کیا تخصیص ہے، یہ کہ وہ نالہ وفریاد کی جڑ ہے کہ ریشہ سے نے پیدا ہوتی ہے اور نے سے نالہ اور حالت ضبط میں نالہ چھپے ہوئے ہیں، جیسے ریشۂ نیستاں میں نالہ پنہاں ہو رہے ہیں، حرف ندا محذوف ہے یعنی اے ہجوم نالہ مراد ہے۔ فقط ہجوم نالہ کو مخاطب کر کے مصور نے ریشۂ صد نیستاں کہنے کا باعث بنا دیا۔" (طباطبائی)

نظامی صاحب یوں لکھتے ہیں: "حیرت عاجز: عاجز حیرت۔ مطلب یہ ہے کہ ہجوم نالہ اس بات سے عاجز ہے کہ حیرت کی وجہ سے آہ وفغاں ناممکن ہے۔ چنانچہ خموشی جو لازم حیرت ہے اِس عجز کا اظہار کر رہی ہے۔ خس بدنداں ہونے سے اظہار عجز مراد ہے اور ریشہ نیستاں اس لحاظ سے آیا ہے کہ نیستاں کی بھی بعینہ یہی حالت ہوتی ہے، باوجود یہ کہ اس سے ہزاروں بانسریاں بن سکتی ہیں اور اِس لیے اِس کو ہزار نالہائے کشیدہ کا مجمع کہہ سکتے ہیں۔ لیکن بہ صورت ظاہر ریشہ نیستاں مشابہ خس سے ہوتے ہیں، اور خموشی نیستان خس بدنداں نظر آتی ہے۔"

شعر۔۲ نگاہِ معشوق کو تیغ تیز سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ اور جب نگاہ تیغ ٹھہری تو اس کا بے حجاب کرنا گویا تیغ تیز کا عریاں (ننگا) کرنا ہوا۔ پس معشوق کا از لُطف بے حجابانہ نگاہ کرنا اور بھی زیادہ جاں ستاں اور قاتل ہوا۔

شعر۔۳ یعنی ہجوم غم سے میری خوشی اس قدر تلف ہو گئی ہے کہ چاکِ سپیدۂ صبحِ عید میرے لیے چاک گریباں سے بھی بدتر ہے۔

شعر۔۴ متاع دست گرداں: وہ مال جو ہاتھوں ہاتھ پھرے۔ مرادِ جنس نقد۔ ساغر کو متاعِ دستِ گرداں کہنا انتہائے بلاغت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بازارِ مے فروشی میں نسیہ واُدھار سے کام نہیں چل سکتا۔ اگر تجھ کو جام مے درکار ہے تو پہلے اسکی قیمت دل و دیں پیش کر۔ یعنی اپنے دین وملّت کو خیر باد کہہ۔ ماسواء سے دل ہٹا، پھر اِس کی خواہش کر۔

شعر۔۵ مرجان: مونگا۔ اور چوں کہ یہ رنگ میں سُرخ ہوتا ہے اِس لیے اس کو چراغ روشن سے

تشبیہ دی ہے۔ صرصر: ہوئے تند۔ مطلب یہ ہے کہ غم عاشق کو آغوش (گود) بلا میں پالتا ہے، یعنی اِس کی ساری زندگی غمِ عشق کی وجہ سے قدم قدم پر مصائب و بلیا سے پُر ہوتی ہے۔ اس لیے بمصداق:

مُشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

اس کو ان مصائب سے کوئی نِقصان یا صدمہ نہیں پہنچتا۔ پس اس کا چراغ روشن (یعنی عاشق بذاتِ خود) ہوائے تند آفات سے بُجھنے نہیں پاتا۔ بلکہ مرجان کی طرح اس قلزمِ صرصر میں حیات رہتا اور نمو پاتا ہے۔

خموشیوں میں ، تماشا ادا نکلتی ہے   نگاہ، دِل سے ترے، سُرمہ سا نِکلتی ہے
فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم   صبا جو غنچے کے پردے میں جا نِکلتی ہے
نہ پُوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نِکلتی ہے

شعر۔۱ تماشا ادا: نگاہ کی صفت ہے۔ بمعنیٰ ناز و انداز دکھانے والی۔ سُرمہ کھانے سے انسان کی آواز بیٹھ جاتی ہے۔ اِس لیے سُرمہ کو خاموشی سے ایک قسم کا تعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیری نگاہ تیری خاموشی کی وجہ سے تیرے دل سے ہی سُرمہ آلود ہو کر نکلتی ہے، یعنی اس میں اشارہ کنایہ تک بھی بالکل نہیں ہوتا۔ لیکن عاشق کو یہ ادا بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس شعر کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہماری جو خاموشیاں ہیں، ان میں بھی جو ادا نکلتی ہے وہ قابلِ تماشا ہے کیوں کہ یار کی نگاہ ہمارے دل میں سُرمہ سائی کرتی ہوئی گزر گئی اور ہماری خاموشی اسی کا اثر ہے۔

شعر۔۲ یعنی جب کبھی صبا غنچہ کے پردے میں، جو کہ تنگ ہوتا ہے، جا نکلتی ہے تو اس تنگیٔ خلوت کے فشار سے، جو غنچہ کو پسند آتا ہے، وہی شبنم ہے (فشار = بھینچنا)

نظامی صاحب اس کی شرح یوں لکھتے ہیں۔ ''غنچہ جو کہ تنگ اور خلوت پسند ہے، اِس لیے وہ بادِ صبا کو کوچہ تنگ میں پا کر ایسا بھینچتا ہے کہ وہ شرم سے پسینہ پسینہ ہو جاتی ہے۔

شعر۔۳ یعنی معشوق کی تیغ نگاہ میں اس قدر آب اور برش ہے کہ اس سے دروازہ تک میں روزن

ہو جاتا ہے، تو پھر اس کے سامنے سینۂ عاشق کی کیا حقیقت ہے؟ روزنِ در کو جس میں سے معشوق جھانکتا ہے، زخم تیغ نگاہ معشوق سے تعبیر کیا ہے اور چوں کہ روزن آر پار ہوتا ہے اور اس میں سے ہوا آتی جاتی ہے، اِس لیے روزن کو اِس گہرے زخم سے تشبیہ دی ہے جس میں سے ہوا نکلتی ہے اور جو ہمیشہ مہلک ہوتا ہے۔

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے   نافہ، دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے
کِس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو؟ اے خُدا!   آینہ فرشِ شش جہت ِ انتظار ہے
ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جا سے غُبارِ شوق   گردام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے
دل مُدّعی و دیدہ بنا مدّعا علیہ   نظّارے کا مقدّمہ پھر روبکار ہے
چھِڑ کے ہے شبنم آینۂ برگِ گُل پر آب   اے عندلیب؛ وقتِ وداعِ بہار ہے
پَچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے   وہ آئے یا نہ آئے، پہ یاں انتظار ہے
بے پردہ سُوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر   ہر ذرّہ کے نقاب میں دل بیقرار ہے
اے عندلیب! یک کفِ خس بہرِ آشیاں   طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی   اے بے دماغ! آینہ تمثال دار ہے
غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے

شعر۔۱ گیسوئے یار کی خوشبو کو بہ غلو بیان کیا ہے۔ یعنی جہاں معشوق ہے، وہاں ہوا میں اس کی زُلف کے ساتھ موصلت سے ایسی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے کہ وہاں کے ہرنوں کا دماغ بھی نافہ تتاری بن جاتا ہے۔ مصرعہ ثانی میں تعقیدِ لفظی ہے، اس کی نثر اس طرح کرنی چاہیے کہ ''دماغِ آہو نافہ دشتِ تتار ہے۔''

شعر۔۲ یعنی اے خدا حیرت کو کس کے جلوہ کی تلاش ہے کہ اس کے انتظار میں فرشِ شش جہت آئینہ بنا ہوا ہے (تا کہ جہاں کہیں ہو نظر آجائے)۔

شعر۔۳ یعنی غبار شوق دل میں تنگی جا کی وجہ سے پس کر اور بھی ذرّہ ذرّہ ہوگیا ہے۔ اگر ان

ذرّوں کو پھیلا کر دام بنایا جاوے تو تمام صحرا شکار ہو جائے گا۔ یعنی وہ دام تمام صحرا پر چھا جاوے گا۔ قاعدہ ہے کہ جتنی چیز باریک اور چھوٹی ہوتی ہے، اُتنا ہی اس کا پھیلاؤ زیادہ ہوتا ہے۔

شعر۔۴ دیدہ: آنکھ۔ روبکار ہے: روبرو حاکم کے پیش ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل نے آنکھ پر نالش کی ہے کہ اس کی وجہ سے اس کا خون ہو گیا ہے۔ کیوں کہ نہ وہ معشوق کو دیکھتی اور نہ اس کا خون ہوتا اور آج اس مقدمہ کی پھر پیشی ہے:

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا　　آج پھر اوسکی روبکاری ہے

شعر۔۵ کسی کے رخصت ہوتے وقت اس کے احباب مختلف طریقوں اور رسموں سے اس کی خیریت راہ کے لیے اپنی دعا کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ ایران میں رسم ہے کہ وقتِ وداع آئینہ پر پانی چھڑکتے ہیں۔ علاوہ ازیں جغرافیہ طبعی کا یہ اصول ہے کہ اوس ہمیشہ اُس روز پڑتی ہے کہ جس روز ابر نہ ہو اور مطلع صاف ہو۔ اس لیے اوس کا پڑنا یعنی مطلع کا صاف رہنا رخصت برسات (موسم بہار) کی علامت ہوئی۔ پس ہر دو مقدمات سے شعر کا مطلب یہ ہوا کہ اوس پڑنے لگی ہے، اس لیے اے بلبل اب چلنا چاہیے کہ بہار کے رخصت ہونے کا وقت آ پہنچا ہے ایک دوسرے شعر میں رخصت بہار کی اس طرح توجیہ کی ہے:

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے　　اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

شعر۔۶ پچ آپڑنے سے مراد کسی بات کا نباہنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا محبوب مجھ سے آنے کا وعدہ کر گیا ہے، اِس لیے مجھ کو اس کا انتظار ضروری ہے۔ وہ آئے یا نہ آئے، یہ اس کا فعل ہے۔ کم از کم یہ بات ثابت ہو جائیگی کہ اس کا وعدہ جھوٹا تھا۔ قریب قریب اسی مضمون کا ایک شعر پہلے بھی گزر چکا ہے:

وعدہ آنے کا وفا کیجیے یہ کیا انداز ہے　　تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

شعر۔۷ ذرّہ کے جگمگانے کو دل کی بے قرار سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وادیِ مجنوں کا ذرّہ ذرّہ مجنوں کے اضطراب قلب کا گویا ہے جس کا مشاہدہ عافیت سوز اور ہیجان انگیز ہے، اس لیے اس سرزمین کی طرف بغیر کسی نقاب کے ہرگز نہ جائیو۔

شعر۔۸ یعنی اے بلبل اپنی ضرورت کے موافق تو اپنے گھونسلے کے لیے تھوڑے سے تنکے لیکر جمع

کر لے، ورنہ بہار کی آمد آمد کا شور برپا ہے۔ تجھ کو ان کے فراہم کرنے میں دقت ہوگی، کیوں کہ جوشِ بہار سے خس و خاشاک بھی سرسبز ہو جاویں گے۔

شعر۔۹ یعنی اے مجنوں تو اپنے آئینہ دل کو تلف نہ کر کیوں کہ اس میں معشوق کی تصویر موجود ہے۔ اگر اس کو کوئی تسکین دہ خبر نہیں پہنچتی، نہ پہنچے۔ کم از کم اس کی وجہ سے سیر (تصویر معشوق) ہی ہو جاتی ہے ایک دوسرا شعر ہے:

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہر آرزو　　توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

شعر۔۱۰ کفیل: ضامن، ذمہ دار۔ یعنی اے موت تیرا معمول یہ ہے کہ جو لوگ موت سے غافل ہیں اور عیش و عشرت میں انجام کو بالکل بھولے ہوئے ہوتے ہیں، تو ان کو اچانک آ جاتی ہے اور اسد ہمیشہ غافل اور نشۂ نشاط میں مخمور ہے، تو پھر اے مرگِ ناگہانی، تجھ کو آنے میں کیا دیر ہے اور انتظار کیا ہے؟

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے　　ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
حسرت نے لا رکھا، تری بزمِ خیال میں　　گلدستۂ نگاہ، سُویدا کہیں جسے
پھونکا ہے، کس نے گوشِ محبت میں، اے خُدا　　افسونِ انتظار، تمنّا کہیں جسے
سر پر، ہجومِ دردِ غریبی سے، ڈالیے　　وہ ایک مُشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے
ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں　　شوقِ عناں گسیختہ، دریا کہیں جسے
درکار ہے، شگفتنِ گُلہاے عیش کو　　صبحِ بہار، پُنبۂ مینا کہیں جسے

غالبؔ! بُرا نہ مان، جو واعِظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ، سب اچھا کہیں جسے؟

شعر۔۱ مطلب یہ ہے کہ تجھ جیسا حسین کہاں سے لاؤں؟ آئینہ پیش کیے دیتا ہوں (کہ تجھ جیسا حسین صرف اسی میں ہے) تا کہ تو اس میں اپنا ہمسر دیکھ کر حیران ہو، اور لوگوں کے واسطے باعث تماشا ہو۔

شعر۔۲ بزمِ خیال: مرادِ دلِ عاشق۔ گلدستۂ نگاہ اشارہ ہے آنکھ کے تل کی طرف اور آنکھ کے تل

اور سویدا میں مشابہت ظاہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دل میں جو سیاہ داغ ہے، اس کو سویدا نہیں کہنا چاہیے، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک گلدستۂ نگاہ ہے جو تیری حسرت دیدار سے میرے دل میں پیدا ہو گیا ہے۔

شعر۔۳ تمنائے معشوق کو افسونِ انتظار سے تعبیر کیا ہے۔ باقی مطلب صاف ہے۔

شعر۔۴ یعنی کثرتِ دردِ غریبی سے تنگ آ کر بس اب صحرا نوردی اختیار کیجیے۔ ’غریبی‘ میں ابہام ہے۔

شعر۔۵ شوقِ عناں گسیختہ۔ اشتیاق معشوق، جس کی عنانِ صبر ٹوٹ گئی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حسرتِ دیدار معشوق میں فرطِ شوق سے میری چشم تر سے آنسوؤں کے دریا کے دریا جاری ہیں۔

شعر۔۶ پنبہ: روئی۔ پنبہ (سپیدہ) مینا کو سپیدۂ صبح بہار سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گلہائے عیش کے کھلنے کے واسطے پنبۂ مینا سپیدۂ صبح کا کام دیتی ہے کیونکہ پنبہ مینا کے نکالنے سے بادہ خواروں کے دل شگفتہ ہو جاتے ہیں۔

شعر۔۷ یعنی صرف ایک واعظ کے بُرا کہنے سے کیا ہوتا ہے اور (رند) تو مجھ کو اچھا کہتے ہیں۔

شبنم بہ گُلِ لالہ، نہ خالی زادا ہے
داغِ دلِ بیدرد، نظر گاہِ حیا ہے
دل خوں شُدۂ کش مکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بُتِ بد مستِ حنا ہے
شعلہ سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے؟
تمثال میں تیری ہے، وہ شوخی کہ، بصد ذوق
آئینہ، بہ اندازِ گُل، آغوش کُشا ہے
قُمری کفِ خاکستر و بُلبل قفسِ رنگ
اے نالہ، نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟
خُو نے تری افسردہ کیا، وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی، طُرفہ بلا ہے
مجبوری و دعوائے گرفتاریِ اُلفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ، پیمانِ وفا ہے
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گذشتہ
تیغِ ستم، آئینہ تصویر نُما ہے
اے پرتوِ خُرشیدِ جہانتاب! اِدھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر اِن کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو، غالبؔ!
کوئی نہیں تیرا، تو مری جان! خدا ہے

شعر۔۱ یعنی گُلِ لالہ پر شبنم کا ہونا مطلب سے خالی نہیں۔ وہ بتا رہی ہے کہ داغِ دل کا بیدرد ہونا باعثِ شرم ہے، اور یہ اوس کے قطرات دراصل اسی کا عرق انفعال ہیں کہ داغِ دلِ لالہ میں درد نہیں۔

شعر۔۲ یعنی ہمارا دل کشمکش حسرت دیدار سے خون ہو کر اس بُتِ بدمستِ حنا کے ہاتھ میں آئینہ بن گیا ہے۔ دل اور آئینہ کی تشبیہ عام ہے۔ حنا اور خون میں مناسبت ظاہر ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معشوق کے ہاتھ میں آئینہ حنا بنا ہوا ہے کہ کسی وقت چھوٹتا ہی نہیں اور ادھر حسرت دیدار کی کشمکش سے ہمارا دل خون ہو رہا ہے، اس لیے اس کے چہرے کو دیکھیں تو کس طرح دیکھیں، آئینہ بیچ میں حائل ہے۔

شعر۔۳ شعلہ سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی: یعنی جو بات کہ ہم کو ہوسِ شعلہ سے حاصل ہو گئی ہے، وہ ہم کو شعلہ سے بھی حاصل نہ ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ افسردگی دل پر (ہوسِ شعلہ میں) اس قدر جی جلا ہے کہ سوزشِ دل سے بھی اتنا نہیں جل سکتا تھا۔ بس شعلہ سے الخ

شعر۔۴ تمثال: تصویر، عکس۔ مطلب یہ ہے کہ تیری تصویر میں بھی ایسی شوخی ہے کہ آئینہ نہایت ذوق شوق کے ساتھ پھول کی طرح (تیرا عکس لینے کے واسطے) آغوش پھیلائے ہوئے ہے۔

شعر۔۵ اکثر شارحین نے اس شعر کے معنی کے متعلق رائے زنی کی ہے لیکن کسی نے بھی اِس کے معنی ٹھیک طور سے بیان نہیں کیے۔

مولانا حالیؔ نے جو یادگارِ غالب میں اِس کے معنی لکھے ہیں، وہ درست اور محقق ہیں۔ لکھتے ہیں ”میں نے خود اِس کے معنی مرزا صاحب سے پوچھے تھے۔ فرمایا کہ ’اے‘ کی جگہ ’جز‘ پڑھو۔ معنی خود سمجھ میں آ جائیں گے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری، جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ اور بلبل، جو ایک قفسِ عنصری سے زیادہ نہیں ہے، ان کے جگر سوختہ، یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف اِن کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے ’اے‘ کا استعمال کیا ہے، ظاہرا یہ انھیں کا اختراع ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سُن کر کہا کہ اگر وہ ’اے‘ کی جگہ ’جز‘ کا لفظ رکھ دیتے یا دوسرا

مصرعہ اِس طرح کہتے:

اے نالہ، نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے

تو مطلب صاف ہو جاتا۔ اس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔ مگر مرزا چوں کہ معمولی اسلوبوں سے تا بمقدور بچتے تھے اور شارعِ عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے وہ بہ نسبت اِس کے کہ شعر عام فہم ہو جائے، اِس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرزِ خیال اور طرزِ بیان میں جدّت اور نرالا پن پایا جائے۔'' اِس شعر میں رنگ کے معنی روح اور عنصر کے ہیں۔ اس لفظ کے ۳۳ معنی ہیں۔ اس میں سے ایک یہ بھی ہے۔

شعر۔۶ خو: عادت، بدمزاجی۔ وحشت دل: مراد شوق دل۔ مطلب یہ ہے کہ اے محبوب تیری بدمزاجی اور بے حوصلگی نے میرے شوقِ دل کو افسردہ کر دیا ہے۔ معشوق ہو کر ایسی بے حوصلگی برتنا، ایک عجیب اور نہایت نازیبا بات ہے۔

شعر۔۷ مطلب یہ ہے کہ پتھر کے نیچے ہاتھ دب گیا ہے۔ نکال تو سکتے نہیں، مجبوراً محبت کو نباہ رہے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ پیمانِ وفا باندھتے وقت ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں اور یہاں ہاتھ پر پتھر ہے۔

شعر۔۸ مطلب یہ ہے کہ تیغِ ستم معشوق ایک آئینۂ تصویر نما ہے کہ اس کے دیکھنے سے فوراً یہ تصویر سامنے آ جاتی ہے کہ جو ظلم وہ آجکل برپا کر رہی ہے، وہی ظلم شہیدان سابق کو جھیلنے پڑے ہوں گے۔

شعر۔۹ یہ ''خطاب ہے آفتاب حقیقت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جیسا سایہ متّہم بوجود ہے اور فی الواقع اس کی کچھ ہستی نہیں ہے، اسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں۔ اگر آفتابِ حقیقت کی کوئی تجلّی ہم پر لمعہ فگن ہو جائے تو یہ دھوکا جاتا رہے اور ہم فنافی الشمس ہو جاویں۔ کیوں کہ جہاں آفتاب چمکا، اور سایہ کافور ہوا۔'' (یادگار غالب)

شعر۔۱۰ ''یعنی جو گناہ ہم نے کیے ہیں، اگر ان کی سزا ملنی ضرور ہے، تو جو گناہ بسبب عدم درت کے ہم نہیں کر سکے اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی، ان کی داد بھی ملنی چاہیے۔''

(یادگار غالب)

مرزا پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد   مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

شعر۔۱۱ یعنی جس کا کوئی نہیں ہوتا، اُس کا خدا ہوتا ہے۔

منظور تھی یہ شکل، تجلّی کو نور کی   قِسمت کھُلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی
اِک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں   پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حُور کی
واعظ! نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو   کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی!
لڑتا ہے مُجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اُٹھا   گویا ابھی سُنی نہیں آواز صُور کی
آمد بہار کی ہے، جو بُلبل ہے نغمہ سنج   اُڑتی سی اِک خبر ہے زبانی طیور کی
گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں   کعبہ سے ان بُتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
کیا فرض ہے کہ، سب کو مِلے ایک سا جواب!   آؤ نہ، ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اِس قدر   کی جس سے بات، اُس نے شکایت ضرور کی

غالبؔ! گر اِس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

شعر۔۱ تجلّی: جلوہ۔ نور: نورِ خداوندی۔ مطلب یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کو اپنے نور کا جلوہ دکھانے کے واسطے تیری جیسی شکل کا انتظار تھا کہ کہیں یہ قد و رُخ ملے تو ظہور کروں۔ اِس شعر کو حقیقت کی طرف منسوب کرنا چاہیے۔

شعر۔۲ یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔۳ طہور: پاک۔

شعر۔۴ معشوق کی کثرتِ تغافل کا اظہار کیا ہے کہ وہ ایسا غافل اور بے خبر ہے کہ اس کو قیامت کے دن صُور تک کی آواز سُنائی نہیں دی اور میں جو صُور کی آواز سُن کر قبر سے اُٹھا تو اُلٹا مجھ سے لڑتا ہے کہ تم کیوں اُٹھے؟

شعر۔۵ طیور: جمع ہے طائر کی بمعنی پرند۔ طیور کی زبانی 'اُڑتی ہوئی خبر سُننا' نہایت ہی پُرلطف

ہے۔

شعر۔۶ واں: یعنی کعبہ۔

شعر۔۷ یعنی کیا ضرور ہے کہ ہم کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح صاف جواب مل جاوے۔

مرزا صاحب پہلے بھی لکھ چکے ہیں:

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر   دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

شعر۔۸ یعنی کلام میں اتنی گرمی (تیزی) نہیں ہونی چاہیے کہ ہر کوئی اس کی شکایت کرے۔

شعر۔۹ ''اس شعر سے مرزا کی کمال شوخی طبع ظاہر ہوتی ہے۔ یہ غزل اس زمانہ میں لکھی تھی جب کہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ مرزا اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے لیے منت مانتے ہیں کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کروں گا۔ ادھر سفر حج کا وہ اشتیاق اور اُدھر حج کے ثواب کی یہ بے قدری۔'' (یادگارِ غالب)

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے   یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ   ہے یوں کہ، مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے، نہ صیّاد کمیں میں   گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
کیا زُہد کو مانوں کہ، نہ ہو گرچہ ریائی   پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے
ہیں اہلِ خرد، کس روشِ خاص پہ نازاں؟   پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے   آلودہ بہ مَے جامۂ احرام بہت ہے
ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات، کہ اُن کو   اِنکار نہیں، اور مجھے ابرام بہت ہے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں، اے مرگ   رہنے دے مجھے یاں کہ، ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعرِ تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

شعر۔۱ صاف ہے۔

شعر۔۲ مطلب یہ ہے کہ ویسے تو شراب کے پیالے کی تلچھٹ میرے لیے بہت ہے لیکن مجھ کو ساقی سے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ دیکھو کیسا ذلیل ہے، بچن کچن پر قانع ہے۔

شعر۔۳ یعنی عزلت نشینی میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

مولانا حالی لکھتے ہیں'' جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے، اس کا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہے۔ ساری خرابیاں شہرت اور اقتدار اور نام ونمود کے ساتھ وابستہ ہیں۔''

شعر۔۴ ''کہتے ہیں میرے دل میں زہد و پارسائی کی، اگرچہ اس میں ریاکاری نہ ہو، کوئی وقعت نہیں ہوسکتی کیوں کہ جزا کی طمع کیا کم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نیکی و پارسائی بلا خیال جزا ہونی چاہیے'' (مہدی) مرزا صاحب پہلے بھی لکھ چکے ہیں:

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ   دوزخ میں ڈالدو کوئی لے کر بہشت کو

شعر۔۵ یعنی اہل خرد عامیانہ رسموں میں تو گرفتار ہیں، پھر کس روشِ خاص پر نازاں ہیں۔

شعر۔۶ مطلب یہ ہے کہ میرے حج کے کپڑے سارے شراب سے آلودہ ہیں، اس لیے مجھ کو طواف کعبہ سے کیا کام۔ مجھ کو چاہ زمزم پر ہی چھوڑ دیجیے تاکہ پہلے ان کو پاک کرلوں۔

شعر۔۷ ابرام: ضد کرنا۔ یعنی مجھ کو تو اسقدر اصرار ہے اور ان کو کوئی انکار نہیں۔ اگر اب بھی کام نہیں بنا تو غضب ہے۔

شعر۔۸ ابھی کام بہت ہے: یعنی ابھی بہت سی مصیبتیں برداشت کرنے کے لیے باقی ہیں، اور ان میں ایک خوں فشانی کی ہے۔

شعر۔۹ صاف ہے۔

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے   جوشِ قدح سے بزم، چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر، جگرِ لخت لخت کو   عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم   برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہُوئے
پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفَس   مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے
پھر پُرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق   سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل   سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے
دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے
پھر چاہتا ہوں، نامۂ دلدار کھولنا
جاں، نذرِ دل فریبیِ عنواں کیے ہُوئے
مانگے ہے پھر، کسی کو لبِ بام پر ہوس
زُلفِ سیاہ، رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر، کسی کو مقابل میں، آرزو
سُرمہ سے تیز دشنۂ مژگان کیے ہوئے
اِک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مَے سے گلستاں کیے ہوئے
پھر، جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے
جی، ڈھونڈھتا ہے پھر، وہی فرصت کہ، رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالب! ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

شعر۔۱ صاف ہے۔

شعر۔۲ یعنی دعوتِ مژگانِ معشوق کیے ہوئے بہت دن گزر گئے ہیں، اس لیے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو یک جا کر رہا ہوں تا کہ وہ (جگر) پھر مژگانِ معشوق کا شکار ہو کر پارہ پارہ ہو سکے۔

شعر۔۳ وضعِ احتیاط بمعنی گریبان پھاڑنے میں احتیاط کرنا۔

شعر۔۴ صاف ہے۔

شعر۔۵ یعنی عشق بڑے زور شور کے ساتھ پھر زخموں پر نمک چھڑکنے چلا ہے۔

شعر۔۶ یعنی دامن پر گلکاری بنانے کے لیے قلمِ مژگاں پھر (روشنائی) خونِ دل میں ڈوبا ہوا ہے۔

شعر۔۷ یعنی دل کو پھر خیالِ معشوق اور آنکھ کو اس کے نظارہ کا حوصلہ ہوا ہے اور اس وجہ سے ان میں رقابت کا سلسلہ پھر چھڑ گیا ہے۔

شعر۔۸ طواف: خانہ کعبہ کے گرداگرد پھرنا، گردش کرنا۔ کدہ: بت خانہ۔ مطلب یہ ہے کہ پندار وخودداری اس بات کی مانع تھی کہ میں تیرے کوچۂ ملامت میں جاؤں لیکن دل نہیں مانتا۔ اور وہ اس کے بُت خانہ کو ویران کر کے یعنی خیال (پندار) خودداری پر خاک ڈال کر پھر تیرے کوئے ملامت کے طواف کو چلا ہے۔

شعر۔۹ یعنی شوق (عشق) پھر اس بات کا خواہاں ہے کہ اگر کوئی معشوق خرید کرے تو عقل و دل و جان اس کو بیچ ڈالے۔

شعر۔۱۰ گل ولالہ: مراد معشوق۔ صد گلستان نگاہ کیے ہوئے: یعنی نہایت ذوق وشوق کے ساتھ نگاہ کیے ہوئے۔

شعر۔۱۱ عنوان: سُرخی۔

شعر۔۱۲ زُلف سیاہ رُخ پہ پریشان کیے ہوئے یعنی سیاہ زلفیں اپنے چہرے پر بکھیرے ہوئے۔

شعر۔۱۳ دشنہ: خنجر۔ گذشتہ شعر اور یہ دونوں، قریب قریب مرادف ہیں۔ یعنی معشوق مختلف ہتھیاروں سے شکارِ عاشق کے لیے آمادہ ہے۔

شعر۔۱۴ صاف ہے۔

شعر۔۱۵ صاف ہے۔

شعر۔۱۶ صاف ہے۔

شعر۔۱۷ تہیۂ طوفان کیے ہوئے: یعنی طوفان (اشک) برپا کرنے کا ارادہ کیے ہوئے۔

نویدِ امن ہے، بیدادِ دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے
بلا سے، گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے
وہ زندہ ہم ہیں کہ، ہیں رُوشناسِ خلق، اے خضر!
نہ تم کہ، چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
رہا بلا میں بھی مَیں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اِک جہاں کے لیے
فلک! نہ دور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مُرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے
گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا، مری جو شامت آئے
اُٹھا، اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت، مرے بیاں کے لیے
دیا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش، تجمل حسین خاں کے لیے
زباں پہ بارِ خُدایا! یہ کِس کا نام آیا؟
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
نصیرِ دولت و دیں اور مُعینِ مِلّت و مُلک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے
زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرایش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے
وَرَق تمام ہُوا، اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اِس بحرِ بیکراں کے لیے
ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!

شعر۔۱ یعنی دوست نے جو ہم پر طرح طرح کے مظالم کیے ہیں، وہ دراصل میری جان کے لیے امن کی خوشخبری ہیں۔ اس لیے کہ اس نے مجھ پر کوئی ظلم اٹھا نہیں رکھا اور اس بنا پر مجھ کو آسمان سے کوئی ڈر نہیں رہا، کیوں کہ اس کے کرنے کے واسطے کوئی نیا ظلم باقی نہیں رہا۔

شعر۔۲ یعنی اگر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے تو میری بلا سے۔ میری مژگاں کو بھی تو خوں فشانی میں مزا آتا ہے۔ اس لیے مجھ کو چاہیے کہ کچھ خون اس کے واسطے رکھوں۔

شعر۔۳ یعنی اے خضر تمھاری ایسی عمر جاودانی کس کام کی کہ تم چور بنے چھپے پھرتے ہو۔ ہم کو دیکھو کہ ہم دنیا کو جانتے ہیں اور دنیا ہم کو جانتی ہے۔ ایک طریقہ سے اپنی شہرت کا اظہار کیا ہے۔

شعر۔۴ یعنی اگرچہ صعوبت معشوق میں گرفتار ہوں لیکن پھر بھی رشک نہیں چھوڑتا اور مجھ کو یہ خیال ہمیشہ پریشان کرتا رہتا ہے کہ تیری ادا سارے جہان کے لیے بلائے جان ہے۔ مری تمنا تو یہ ہے کہ اگر وہ بلا تھی تو صرف میرے ہی واسطے ہوتی۔ ایک دوسرا شعر ہے:

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے تم مرے لیے ہوتے

شعر۔۵ صاف ہے۔

شعر۔۶ یعنی میری کوشش ایسی فضول اور عبث ہوتی ہے جیسی کہ اس مرغ کی جو کہ قفس میں گھونسلا بنانے کے واسطے گھاس جمع کرنے کے لیے کرتا ہے۔

شعر۔۷ ”غالب نے اتنے بڑے مضمون کو کہ میں جو معشوق کے مکان پر پہنچا تو اوّل خاموش کھڑا

رہا، پاسبان نے سائل سمجھ کر کچھ نہ کہا۔ جب معشوق کے دیکھنے کا حد سے زیادہ شوق ہوا اور صبر کی طاقت نہ رہی، تو پاسبان کے قدموں پر گر پڑا۔ اب اس نے جانا کہ اس کا مطلب کچھ اور ہے۔ اس لیے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے، اس شعر میں ادا کیا ہے“ (مقدمہ شعر و شاعری)

شعر۔۸ مطلب یہ ہے کہ غزل سے پوری طرح میرے شوق کے مطابق میرے خیالات کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے غزل سرائی چھوڑ کر قصیدہ گوئی (جس میں کہ وسعت بیان ہے) شروع کرتا ہوں۔

شعر۔۹ یعنی اصل میں تو عیش صرف تجمل حسین خان کے لیے بنا ہے۔ لیکن دوسرے لوگوں کو بھی کچھ تھوڑا دیدیا ہے تاکہ لوگوں کی نظر نہ لگ جائے۔

شعر۔۱۰ صاف ہے۔

شعر۔۱۱ نصیرا: مددگار۔

شعر۔۱۲ ”مرزا نے اپنے ممدوح کو ایک ایسے کمال کے ساتھ موصوف کیا ہے جو تمام کمالات کی جڑ ہے۔ یعنی وہ ہر چیز کو کامل تر اور افضل تر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے، اِس لیے ہر شے اپنے تئیں کامل تر حالت میں اس کو دکھانا چاہتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر یہی حال ہے تو شاید آسمان کی زیب و زینت کے لیے اور ستارے پیدا کیے جائیں۔ اس پر سوائے اس کے کہ کوئی منطقی اعتراض کیا جاوے اور کسی طرح کی گرفت نہیں ہو سکتی۔“ (مقدمہ شعر و شاعری)

شعر۔۱۳ یعنی اتنی تھوڑی جگہ میں ممدوح کی پوری پوری تعریف نہیں لکھی جا سکتی۔

شعر۔۱۴ یعنی جتنے نکتہ سنج لوگ ہیں، وہ سب یہ آواز لگاتے ہیں کہ غالب کا طرز بیان بالکل خاص اور نرالا ہے۔ سب کو اسی روش کو اختیار کرنا چاہیے۔

قصائد

قصیدہ اول

درمنقبت[1]

سازِ یک ذرّہ، نہیں فیضِ چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بیداغ، سُویدائے بہار
مستیِ بادِ صبا سے، ہے بہ عرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مَے، جوہرِ تیغِ کُہسار
سبز ہے، جامِ زمرّد کی طرح، داغِ پلنگ
تازہ ہے، ریشۂ نارنج صفت، رُوئے شرار
مستیِ ابر سے، گلچینِ طرب ہے، حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
کوہ و صحرا ہمہ معمورِیِ شوقِ بلبُل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گُل سے بیدار
سونپے ہے فیضِ ہَوا، صورتِ مژگانِ یتیم
سرنوشتِ دو جہاں ابر، بیک سطرِ غُبار
کاٹ کر پھینکیے ناخن، تو بہ اندازِ ہلال
قوّتِ نامیہ اُس کو بھی نہ چھوڑے بیکار
کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ، قُمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ، طاؤس شکار
میکدے میں ہو، اگر آرزوئے گُل چینی
بھُول جا، یک قدح بادہ بہ طاقِ گُلزار
موجِ گُل ڈھونڈھ بخلوتکدۂ غنچۂ باغ
گُم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار
کھینچے گر مانیِ اندیشہ، چمن کی تصویر
سبز مثلِ خطِ نوخیز، ہو خطِ پَرکار
لعل سی، کی ہے، پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا مِنقار

---

[1] تعریف وثنا اہل بیت نبی صلعم اور اصحاب کبار کی

وہ شہنشاہ کہ، جس کی پئے تعمیرِ سَرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار
فلکُ العرش، ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل، سازِ طنابِ معمار
سبزۂ نُہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمّتِ صد عارف و یک اوجِ حصار
واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پَرِ کاہ
وہ رہے مِروحۂ بالِ پری سے بیزار
خاکِ صحرائے نجف، جوہرِ سیرِ عُرفاء
چشمِ نقشِ قدم، آئینۂ بختِ بیدار
ذرّہ اُس گرد کا، خُرشید کو آئینۂ ناز
گرد اُس دشت کی، اُمّید کو، اِحرامِ بہار
آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیِ ناز
عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے، ہر موجِ غبار

مَطلعِ ثانی

فیض سے تیرے ہے، اے شمعِ شبستانِ بہار!
دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار
شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوے کے تیرے بہوائے دیدار
تیری اولاد کے غم سے ہے بہ رُوئے گردوں
سلکِ اختر میں مہِ نو، مِژۂ گوہر بار
ہم عبادت کو، ترا نقشِ قدم، مُہرِ نماز
ہم ریاضت کو، ترے حوصلے سے استظہار
مدح میں تیری نہاں، زمزمۂ نعتِ نبی
جام سے تیرے عیاں، بادۂ جوشِ اسرار
جوہرِ دستِ دعا آئینہ، یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مژگان و دگر سُو غمِ خار
مَردُمک سے ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ
خاکِ در کی ترے، جو چشم نہ ہو آئینہ دار
دشمنِ آلِ نبی کو، بہ طرب خانۂ دہر
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو، طاقِ دیوار
دیدہ تا دل اسدؔ، آئینہ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے، خطِ ساغرِ راقم سرشار

شعر۔۱ فیض چمن: مراد فیض بہار لالہ ہے۔ بے داغ: جوشش بہار کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے زور سے لالہ میں داغ نہیں رہا اور اس کی سیاہی سبزہ میں بدل گئی ہے۔ سویدا: دل کا سیاہ داغ۔ مطلب یہ ہے کہ بہار کا وہ جوش ہے کہ اس کے فیض (اثر) سے باغ کا ایک ذرّہ بھی بیکار نہیں ہے۔ حتیٰ کہ لالۂ بے داغ کا سایہ بھی دلِ بہار کے سویدا کا کام دے رہا ہے۔

شعر۔۲ عرض: ظاہر کرنا، اظہار۔ تیغ کوہسار: پہاڑ کی چوٹی۔ اصل لفظ تیغ کوہ ہے۔ جوہر تیغ کہسار: مراد سبزۂ کوہ۔ کیوں کہ سبزہ بھی پہاڑ کے لیے ویسا ہی خوبصورتی و زینت کا باعث ہے جیسا کہ جوہر، تیغ کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ بادِ صبا کی ہستی سے سبزۂ کوہ سبزی میں ریزۂ مینائے سے بنا ہوا ہے۔ یعنی اس میں ایسی ہی سبزی اور آب و تاب ہے جیسی کہ سبز شیشہ کے چھوٹے چھوٹے ذروں میں ہوتی ہے۔ عرض و جوہر اور جوہر و تیغ رعایت لفظی ہیں۔

شعر۔۳ پلنگ: چیتا، تیندوا۔ ریشہ نارنج صفت: یعنی ریشہ نارنج کے مانند۔ شرر کو بہ رعایت سُرخی ریشۂ نارنج (نارنگی) سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ باد بہاری کی تاثیر سے پلنگ کا سیہ داغ، جام زمرّد کی طرح سبز ہو گیا ہے اور شرار نارنج کی مانند تر و تازہ ہو گیا ہے۔

شعر۔۴ فشار: نچوڑنا، بھینچنا۔ دونوں عالم کا فشار: غمہائے دین و دنیا کا نچڑ جانا، زور طرب سے دب کر ان کا خیال سے نکال جانا۔ فشار بہ رعایت آغوش لایا گیا ہے۔ آغوش: گود۔ گلچینِ طرب: باغ نشاط سے پھول توڑنے والا، راحت اٹھانے والا۔ مطلب یہ ہے کہ مستی ابر سے حیرت تک بھی طرب اندوز ہو رہی ہے۔ کیوں ایسی حالت میں جب کہ ابر بہاری دو عالم کو اپنی آغوش میں لیے ہو اور ان کا احاطہ کیے ہوئے ہو (یعنی ابر چھایا ہوا ہو) غمہائے دین و دنیوی کا فراموش ہو جانا بہت ممکن ہے۔

شعر۔۵ معمور: آباد، بھرا ہوا۔ راہ خوابیدہ: سُنسان راستہ جہاں کوئی نہیں آتا جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ آمد بہار سے کوہ و صحرا ترانہ ہائے بلبل سے آباد، اور ویران و سنسان راستے پھولوں کے کھلنے سے بیدار و پُر رونق معلوم ہوتے ہیں۔

شعر۔۶ سرنوشت: تقدیر، قسمت کا لکھا۔ دو جہان ابر: یعنی ابر کثیر۔ دو جہان کثرت کے واسطے لایا گیا ہے۔ جیسے دو عالم وشت یک بیابان ماندگی۔ یک سطر غبار: ذرا سی خاک۔ یک سطر بہ رعایت سرنوشت استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک یتیم کی مژگان خاک آلود سے مدتوں آنسوؤں کی جھڑی لگی رہتی ہے، اسی طرح فیض ہوا کے اثر سے ذرا سے غبار میں بھی ابر کثیر کی قوت حاصل ہو گئی ہے۔

شعر۔۷ قوت نامیہ: ایک قوت ہے جسم حیوانی میں جو جسم کو طول و عرض و عمق میں بڑھاتی ہے، قوت بالیدگی۔ ترشے ہوئے ناخن کی شکل ہلال جیسی ہوتی ہے۔ پس مطلب یہ ہے کہ قوت نامیہ کا یہ زور ہے کہ اگر ایک ناخن تراش کو پھینک دیا جائے تو وہ اس کو بھی بیکار نہیں چھوڑتی، بلکہ اس کو نمو دیکر ہلال سے بدر بنا دیتی ہے۔

شعر۔۸ قمری کا رنگ خاکی ہوتا ہے اس لیے 'کفِ خاک پرند' کو قمری کے نام سے موسوم کیا ہے۔ کاغذ کے جل جانے کے بعد اس میں سلوٹوں کی وجہ سے جالی کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو دام سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہوا میں جان بخشی کی ایسی طاقت ہے کہ اس کی وجہ سے ایک مُشت خاک جو اُڑ کر آسمان پر جاتی ہے، قمری پرّاں بن جاتی ہے۔ اور اس کے اثر سے کاغذ آتش زدہ کی جالیاں حقیقت میں دام بن کر طاؤس کا شکار کرتی ہیں۔ طاؤس سے مراد عام پرند ہیں۔ فقط طاؤس اختصاص کے ساتھ اس لیے لایا گیا ہے کہ بہار کی جہاں آرائی و خوبصورتی کا ذکر ہو رہا ہے۔

شعر۔۹ یعنی اگر تجھ کو میکدہ میں گلچینی کی آرزو ہے تو ایک قدح مے طاق گلزار میں رکھکر بھول جا۔ کچھ دنوں میں بہار کے نشو و نما سے اس ایک قدح گلزار میں پورا میکدہ بن جائے گا۔ اور اس میکدہ میں تیری گلچینی کی آرزو پوری ہو جائے گی۔

شعر۔۱۰ یعنی اگر تیری پگڑی گوشۂ میخانہ میں گم ہو جائے اور تو اس کو ڈھونڈھنا چاہے تو خلوتخانہ غنچۂ باغ میں جا کر موج گل کو ڈھونڈھ کیوں کہ اس عرصہ میں فیض ہوا، میخانہ کو غنچۂ گل اور دستار کو موج گل بنا دیگی۔ گوشہ اور خلوتخانہ میں رعایت لفظی ہے۔ جب میکدہ غنچۂ گل ہوا تو گوشۂ میکدہ خلوتخانہ غنچۂ گل ہوا۔

شعر۔۱۱ مانی: نام ہے روم کے ایک بڑے کامل نقاش کا۔ اس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا اور نقاشی کو اپنا معجزہ گردانا تھا۔ مطلب یہ ے کہ اگر مانی اندیشۂ چمن کی تصویر کھینچے تو تاثیر باد بہاری سے خط پرکار سبزہِ (نوخیز) کی طرح سبز ہو جائے۔

شعر۔۱۲ مِنقار: چونچ۔ سبزۂ کوہسار کو طوطی سے اور لعل کو منقار طوطی سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بادشاہ کی مدح سرائی کے لیے لعلِ کوہ، طوطیِ سبزہ کوہسار کی منقار بن گیا ہے۔ یہاں سے شاعر نے گریز کیا ہے۔

شعر۔۱۳ وہ شہنشاہ کہ جس کے قصر کی تعمیر کے واسطے اینٹیں چشم جبرائیل کے سانچہ میں بنی ہیں۔

شعر۔۱۴ خُم: مٹکا۔ ساز: سامان۔ طناب: وہ ڈوری کہ جس سے معمار دیوار کی کجی وراستی کو ناپتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس قصر شاہی کی تعمیر میں فلک العرش پانی بھر کر لانے کے لیے دوش مزدور کا محض ایک بڑا سا مٹکا ہے اور رشتۂ فیض ازل گویا معمار کی ڈوری ہے۔

شعر۔۱۵ یعنی قصر ممدوح پشت لب بام کا ایک خط، سبزی میں سبزۂ صد چمن کے برابر ہے اور اس کا قلعہ بلندی میں سو عارفوں کی ہمّت کے برابر ہے۔ واؤ دونوں مصرعوں میں مساوات کے لیے ہے۔

شعر۔۱۶ مروحہ: پنکھا۔ کاہ: سوکھی ہوئی گھاس۔ مطلب یہ ہے کہ جس کسی کو وہاں کے خس و خاشاک سے ایک پر مل جائے، اس کو پھر بازوئے پری کے پنکھوں سے نفرت ہو جائیگی۔

شعر۔۱۷ عرفا: جمع ہے عارف کی۔ جوہرا: جو بذات خود قایم ہو۔ اور جس کے سبب سے دوسری چیز (عرض) قایم ہو۔ سیر عرفا کو عرض جو ہر خاک صحرائے نجف قرار دیا ہے۔ یعنی عارفوں کی سیر کا باعث صرف خاک صحرائے نجف ہے۔ اور اس خاک پر جو ان کے نقش قدم پڑتے ہیں، وہ گویا آئینہ ہیں جس میں بختِ بیدار کی تصویر نظر آتی ہے۔

شعر۔۱۸ یعنی گرد نجف کا ہر ذرّہ خورشید کے لیے آئینۂ ناز ہے۔ اور دشت نجف کی گرد، امید کے لیے فصل بہار کا جامۂ احرام ہے۔

شعر۔۱۹ ''ایجاد کو اس خاک پاک کی آفرینش پر ناز ہے۔ پس نجف کی ہر موج غبار، گویا آفرینش و ایجاد کی انگڑائی ہے جس کے ذریعہ وہ بہ زبان حال یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم کو اس شراب فخر و ناز (یعنی ناز ایجاد نجف) کی پھر خواہش ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس سرزمین کو پیدا کر کے آفرینش کو بار بار ناز ہوتا ہے (حسرتؔ)

مطلع ثانی

شعر۔۲ یعنی آئینہ خانہ تیرے جلوے کے شوق اور تیرے دیدار کی تمنا میں مثل طاؤس پرواز کرتا ہے۔

شعر۔۳ سلکِ اختر کو سلک اشک سے، اور مہ نو کو مژہ سے تشبیہ دی ہے۔ اشک و گوہر میں تشبیہ ظاہر ہے۔ علاوہ وجہ شبہ کے اشک بار کی بجائے گوہر بار اس لیے کہا ہے کہ شاعر کو یہ دکھلانا مقصود ہے کہ حسین علیہم السلام کے غم میں جو آنسو آنکھوں سے نکلتے ہیں، وہ موتی کا رتبہ رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے خطۂ پاک نجف، تیری اولاد کے سوگ میں مژۂ گردوں تک اشک بار ہے۔

شعر۔۴ مہر نماز: سجدہ گاہ۔ استظہار: مددگار ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ عبادت کے لیے تیرا نقش قدم سجدہ گاہ ہے، اور ریاضت کو تیرے حوصلہ سے تقویت ہوتی ہے۔

شعر۔۵ یعنی تیری مدح سرائی عین رسول مقبولؐ کی مدح سرائی ہے۔ اور تیرا جام محبت پینا گویا بادۂ جوش اسرار کا پینا ہے۔

شعر۔۶ دست دعا آئینہ: اضافت مقلوبی ہے۔ دست دعا کو آئینہ اور تاثیر کو اس آئینہ کا جوہر کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے ممدوح کی دعا کی تاثیر (بہ سبب مقبولیت) ایک طرف تو مژگان اشک آلود کے لیے مایۂ ناز اور دوسری طرف تشویشہائے دل کے لیے (بوجہ ان کے مٹ جانے کے) باعث غم ہے۔ مژگان اور خار میں مناسبت ظاہر ہے۔

شعر۔۷ مردمک: آنکھ کی پتلی: اس کو باعتبار سیاہی عزا خانہ سے تشبیہ دی ہے۔ اقبال نگاہ: بخت مندی و کامرانی نگاہ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آنکھ تیرے خار در کی آئینہ دار نہ ہو تو آنکھ کی پتلی نگاہ بخت مندی کا ماتم خانہ بن جائے، یعنی چشم کو کبھی کامگاری نصیب نہ ہو۔

شعر۔۸ طاقِ دیوار کو بہ سبب خمیدگی خمیازہ سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے خدا، اعدائے آل نبی کے حق میں عشرت خانۂ دہر کا ہر طاقِ دیوار خمیازۂ سیلاب (بلا) ہو جائے، یعنی ان کو کبھی خوشی نصیب نہ ہو۔

شعر۔۹ یعنی آنکھ سے دل تک اسدؔ ایک پرتوِ شوق کا آئینہ ہے۔ یعنی ہمہ تن شوق بنا ہوا ہے اور فیضِ معنی سے اس کا خطِ ساغر (اس کی تحریر) سرشار ہے۔

قصیدہ دوئم

در منقبت

دہر، جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے، اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں
بیدلی ہائے تماشا! کہ نہ عبرت ہے، نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنّا! کہ نہ دُنیا ہے، نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے آئینہ فرقِ جنون و تمکیں
نقشِ معنی ہمہ، خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ، پیمانۂ ذوقِ تحسیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم!
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں
مثلِ مضمونِ وفا، باد بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم، خاک بہ فرقِ تمکیں
عشق، بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل، زنگارِ رخِ آئینۂ حُسنِ یقیں
کوہکن، گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئینہ خوابِ گرانِ شیریں
کِس نے دیکھا، نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟
کِس نے پایا، اثرِ نالۂ دلہائے حزیں؟
سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن
نہ سرو برگِ ستایش، نہ دماغِ نفریں
کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ، عیاذاً باللہ!
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں
نقشِ لاحول، لکھ، اے خامۂ ہذیاں تحریر!
"یا علیؑ" عرض کر، اے فطرتِ وسواس قریں!
مظہرِ فیضِ خُدا، جان و دلِ ختمِ رُسُل
قبلۂ آلِ نبی، کعبۂ ایجادِ یقیں
ہو، وہ سرمایۂ ایجاد، جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک، ہے واں، گردۂ تصویرِ زمیں
جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اُس کا، جس جا
وہ کفِ خاک، ہے ناموسِ دو عالم کی امیں
نسبتِ نام سے اُس کی ہے یہ رُتبہ کہ رہے
ابداً پُشتِ فلک، خم شدۂ نازِ زمیں
فیضِ خلق اُس کا ہی شامل ہے کہ، ہوتا ہے سدا
بوئے گُل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں
بُرِشِ تیغ کا اُس کی، ہے جہاں میں چرچا
قطع ہوجائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں
کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ، جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بُتخانۂ چیں
جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!
وصیِ ختمِ رسل تو ہے، بہ فتوائے یقیں

جسمِ اطہر کو ترے، دوشِ پیمبر، منبر
نامِ نامی کو ترے، ناصیۂ عرش، نگیں
کِس سے ممکن ہے تری مدح، بغیر از واجب؟
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں
تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں
تیری مدحت کے لیے ہیں، دل و جاں، کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں، لوح و قلم، دست و جبیں
کس سے ہو سکتی ہے مدّاحیِ ممدوحِ خُدا؟
کس سے ہو سکتی ہے آرایشِ فردوسِ بریں؟
جنسِ بازارِ معاصی، اسداللہ اسد
کہ سِوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخیِ عرضِ مطالب میں، ہے گُستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پر از بس کہ یقیں
دے دعا کو مری، وہ مرتبۂ حُسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار، "آمیں"
غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں، خونِ جگر سے، مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفتِ دُلدُل میں یہ سرگرمیِ شوق
کہ جہاں تک چلے، اس سے قدم اور مُجھ سے جبیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

صرفِ اعدا، اثرِ شعلۂ دُودِ دوزخ
وقفِ احباب، گُل و سنبلِ فردوس بریں

شعر۔۱ یعنی دنیا صرف اس ذاتِ واحد کی جلوہ گاہ ہے اور اس کے خلق کا باعث اسی معشوقِ حقیقی کی خود بینی ہے۔ اگر اس حسنِ ازلی کو اپنا جلوہ خود دیکھنا مقصود نہ ہوتا تو نہ ہم ہوتے اور نہ یہ دنیا ہوتی۔

شعر۔۲ یعنی دنیا کا تماشا نہایت بے دلی کے ساتھ کیا گیا کہ نہ کوئی عبرت ہی حاصل ہوئی اور نہ ذوق۔ افسوس ہماری تمنا بالکل بے کس ہے کہ نہ دنیا حاصل ہوتی ہے اور نہ دین۔

شعر۔۳ ہرزہ: بیہودگی۔ زیر معنی باریک آواز اور بم موٹی آواز ہستی کو زیر سے اور عدم کو بم سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نغمہائے ہستی و عدم بالکل لغو ہیں اور جنوں و تمکنت میں امتیاز کرنا سراسر بیہودگی ہے۔ یہ سب بیکار چیزیں ہیں۔ ان کا فی الحقیقت کوئی وجود نہیں۔ ان تمام فضولیات کو چھوڑ کر اسی ذاتِ واحد کی طرف لو لگانی چاہیے۔

شعر۔۴ مطلب یہ ہے کہ نقشِ معنی بالکل ایک خمیازہ ہے جس سے عرضِ صورت کی خواہش ظاہر

ہوتی ہے، اور سخن حق گویا ایک پیانہ ہے جس سے ذوقِ تحسین کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر جو لوگ پیوستہ معنی نظر آتے ہیں، وہ دراصل اظہار صورت کے خواہشمند ہیں اور اسی طرح جو لوگ سچی سچی باتیں کرتے ہیں، اُن کا ان سخنہائے حق سے صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ لوگ ان کی تعریف کریں۔ صورت و معنی میں تضاد ہے۔

شعر۔ ۵ دُرد: تلچھٹ۔ لاف: شیخی۔ یعنی امور دنیوی میں ادعائے دانشمندی، غلط ہے اور عبارت میں نفع کی امید رکھنا فضول ہے کیونکہ دنیا و دین دونوں فی الحقیقت ایک ساغر غفلت کی دُرد ہیں۔

شعر۔ ۶ بادبدست: لاحاصل۔ فرق: مانگ، سر۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں (دنیا میں) مثل وفا تسلیم سے کچھ حاصل نہیں۔ علیٰ ہذالقیاس، تمکین و خودداری بھی خاک بسر (خوار) ہے۔

شعر۔ ۷ مطلب یہ ہے کہ شیرازۂ حواس کے بکھر جانے (یعنی بے حواس و مجنوں ہوجانے) کا نام عشق ہے اور رُخ آئینۂ حُسنِ یقین کے زنگار کا نام وصل ہے۔ یعنی وصل کے متعلق یقین واثق ہو جانا ہی وصل کا ہو جانا ہے۔

شعر۔ ۸ یعنی فرہاد اپنے رقیب (خسرو) کے عشرت خانہ کا ایک گرسنہ مزدور تھا، اور کوہ بے ستون شیریں کے خواب گراں (کثرت تغافل) کا نمونہ:

عشق و مزدوری عشرت گہِ خسرو کیا خوب ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

شعر۔ ۹ اہل وفا: عشاق۔ حزیں: غمگیں۔ دونوں مصرعوں میں استفہام انکاری ہے۔ مرزا پہلے بھی لکھ چکے ہیں:

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم اثر فریاد، دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

شعر۔ ۱۰ یعنی اہل جہاں کی نغمہ سرائی کو سن ضرور لیتا ہوں لیکن اتنی طاقت اور اتنا دماغ نہیں کہ اس کی تعریف یا نفریں کرسکوں۔

شعر۔ ۱۱ ہرزہ سرا: بیہودہ گو۔ یک قلم: بالکل۔ یعنی معاذ اللہ میں بھی کیسا بیہودہ گو ہوں کہ مجھ کو آداب وقار و تمکین کا مطلق خیال نہیں۔ یہاں سے شاعر نے گریز کیا ہے۔

شعر۔ ۱۲ لاحول: نہیں ہے قوت۔ کلمہ نفرت و بیزاری کا ہے۔ قرین: نزدیک۔ مطلب یہ ہے کہ اے خامۂ ہذیاں تحریر، تو اب اس ہذیان نویسی سے نجات کے لیے لاحول کا تعویذ لکھ اور جو کچھ

بیہود بکا ہے، اس پر نفریں بھیج اور استغفار کہہ، اور اے فطرت وسواس قرین، تو ان وسواسہائے شیطانی سے بچنے کے لیے حضرت علیؑ کے نام مبارک کا ورد کر۔

شعر۔ ۱۳ قبلہ و کعبہ، دونوں سے مراد صرف اظہار فضیلت و بزرگی ہے۔ ایجاد: دنیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ فیض خدا کے مظہر اور رسول خاتم النبیین کے سب سے پیارے ہیں۔ آل نبی کے قبلہ یقین رکھنے والی دنیا کے کعبہ ہیں، یعنی مسلمانوں میں سب سے زیادہ بزرگ ہیں۔

شعر۔ ۱۴ گردہ: مصوروں کا خاکہ۔ گردۂ تصویر زمین: مراد کرۂ زمین۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں وہ سرمایۂ ایجاد دنیا، سرگرم خرام ہو، وہاں کی ہر کف خاک ایک کرۂ زمین بن سکتی ہے۔

شعر۔ ۱۵ یعنی جس جگہ ان کا نقش قدم جلوہ پرداز ہو، وہ ایک مٹھی خاک دونوں عالم کے لیے باعث عزت و فخر ہو جائے۔

شعر۔ ۱۶ حضرت علی کی کنیت ابوتراب ہے، اور تراب مٹی کو کہتے ہیں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ زمین کو ان کے نام (کنیت) کے ساتھ نسبت ہونے کی وجہ سے، اس کے ناز اٹھانے کے لیے پشت فلک ہمیشہ جھکی رہتی ہے۔

شعر۔ ۱۷ عطر آگیں: خوشبو سے بھری ہوئی۔ خوشبودار۔ مطلب صاف ہے۔

شعر۔ ۱۸ یعنی ان کی تیغ (ذوالفقار) کی برش (کاٹ) کا شہرہ سن کر یہ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کبھی رشتۂ آفرینش ہی قطع ہو جائے۔

شعر۔ ۱۹ یعنی ان کا جلوۂ ایسا کفر سوز ہے کہ اس کے باعث بُت خانۂ چین سے رونق اس طرح اُڑ جاتی ہے جیسے کہ ایک عاشق (زار) کا رنگ (اُڑ جاتا ہے)۔

شعر۔ ۲۰ وصی: وہ شخص جس کو وصیت کی گئی ہو۔ حضرت علیؓ سے خطاب ہے۔ کہ اے جاں پناہ اے فیض رسانِ دل و جان، اے بادشاہ، تو خاتم المرسلین صلعم کا یقیناً وصی ہے۔

شعر۔ ۲۱ اطہر: بڑا پاک۔

شعر۔ ۲۲ آئین بندی: وہ زیب و آرایش، جو ہر وقت داخل ہونے بادشاہ وغیرہ کے شہر کے بازاروں میں کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سوائے خدا کے تیری تعریف کسی سے ممکن نہیں۔ کیونکہ شمع کی زینت صرف شعلہ شمع ہی کرسکتا ہے۔

شعر۔۲۳ رقم بندگی: بندگی کے نشانات۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے آئینہ سنگ آستان کے جوہر حضرت جبرئیلؑ امیں کے نشانات بندگی (ناصیہ فرسائی) سے بنے ہیں۔

شعر۔۲۴ یعنی ہم جان و دل و دین، سب کچھ تیرے اوپر نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔

شعر۔۲۵ دل و جان کام و زبان سب تیری ہی مدح کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اور لوح و قلم دست و جبیں تیرے ہی سلام کرنے کو بنے ہیں۔

شعر۔۲۶ دونوں مصرعوں میں استفہام انکاری ہے۔

شعر۔۲۷ حضرت مرتضیٰ علی علیہ السلام کا لقب شیر خدا (اسد اللہ) ہے۔ پس شاعران کو اس لقب سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ اے اسد اللہ اسدؔ! بازار معاصی کی ایک جنس ہے جس کو سوائے تیرے کوئی نہیں خرید سکتا۔ لفظ اسدؔ میں ابہام ہے۔ اسدؔ ثانی، شاعر کا تخلص ہے۔

شعر۔۲۸ چوں کہ اس کو تیری وسعت فضل و کرم پر پورا پورا یقین ہے، اسی لیے وہ اپنے عرض مطالب میں اس قدر شوخ اور گستاخ ہے۔

شعر۔۲۹ اجابت: قبولیت۔

شعر۔۳۰ شبّیر: امام حسین علیہ السلام، شبّر، شبیر، مشبّر، یہ تینوں نام حضرت ہارون علیہ السلام کے بیٹوں کے تھے۔ حضرت رسول خدا صلعم نے یہی نام اپنے نواسوں حسنؔ، حسینؔ اور محسنؔ کے رکھے تھے۔

شعر۔۳۱ دُلدل: مادہ خچر جو حاکم اسکندریہ نے آنحضرت صلعم کو دیا تھا، اور جس کو پھر آپ نے حضرت علیؑ کو دیدیا تھا۔ ''اُس سے قدم اور مُجھ سے جبیں'' ترجمہ ہے فارسی محاورے۔ ''از وقدم و از من جبیں۔'' کا مطلب یہ ہے کہ یا الٰہی میری طبع کو دلدل کے ساتھ اس قدر اُلفت و عشق ہو کہ جہاں کہیں اس کا قدم ہو، میری جبیں ہو۔

شعر۔۳۲ میرے دل کو الفت (ممدوح) سے نسبت ہو، اور میرے سینہ کی فضا توحید ہو (یعنی توحید سے معمور ہو) میری نگاہ پرستار جلوہ (ممدوح) اور میرا نفس صدق گزیں ہو۔

شعر۔۳۳ شعلۂ دودِ دوزخ (میرے ممدوح کے) دشمنوں پر صرف ہو، اور گل و سنبل و فردوس بریں (اس کے) احباب کے لیے وقف ہو۔

قصیدہ سویم

شاہ ظفر کی مدح میں عیدالفطر کے موقع پر لکھا گیا

ہاں، مہِ نو! سُنیں ہم اُس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صُبح
یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب؟
بندہ عاجز ہے، گردشِ ایّام
اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا، اے سُرورِ خاصِ خواص!
حبّذا، اے نشاطِ عامِ عوام!
عُذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اُس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صُبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا، کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام؟
جانتا ہوں کہ، آج دنیا میں
ایک ہی ہے امیدگاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اُس کا مگر نہیں ہے غُلام؟
جانتا ہوں کہ، جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو، اے ماہ
قُربِ ہر روزہ برسبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایہ رُوشناسی کا
جُز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون!
مجھ کو کیا بانٹ دیگا تو اِنعام
میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص
گر تجھے ہے امیدِ رحمت عام

جو کہ بخشیگا تجھ کو فرِّ فروغ   کیا نہ دیگا مجھے مئے گُلفام!
جب کہ چودہ منازلِ فلکی   کر چکے قطع تیری تیزیِ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر   کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز   اپنی صورت کا اِک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کرچکا تھا میرا کام   تجھ کو کِس نے کہا کہ ہو بدنام
مَے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں   غم سے جب ہوگئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا، یہی غنیمت ہے   کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دُشنام
کعبے میں جا، بجا ئینگے ناقوس   اب تو باندھا ہے دَیر میں اِحرام
اُس قدح کا ہے دَور مجھ کو نقد   چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام
بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار   دل کے لینے میں جن کو تھا اِبرام
چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے   کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام؟
کہہ چکا میں تو سب کچھ، اب تُو کہہ   اے پری چہرہ، پیکِ تیز خرام!
کون ہے، جس کے در پہ ناصیہ سا   ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مُجھ سے سُن   نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ   مظہرِ ذو الجلالِ والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف   نو بہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل، صورتِ اعجاز   جس کا ہر قول، معنیِ الہام

بزم میں میزبانِ قیصرِ روم   جُرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام
وارثِ مُلک جانتے ہیں تجھے   ایرج و تورو خسرو و بَہرام
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے   گیو و گودرز و بیژن و رُہام
مرحبا، موشگافیِ ناوک!   آفریں، آب داریِ صمصام!
تیر کو تیرے، تیرِ غیر، ہدف   تیغ کو تیری، تیغِ خصم، نیام

ق

رعد کا کررہی ہے کیا دم بند   برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا   تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

ق

فنِّ صورتگری میں تیرا گُرز   گر نہ رکھتا ہو خواستگاہِ تمام
اُس کے مضروب کے سر و تن سے   کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے   صفحہ ہاے لیالی و ایّام
اور اُن اوراق میں بہ کلکِ قضا   مُجملاً مُندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کُش   لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
آسماں کو، کہا گیا کہ کہیں   گُنبدِ تیز گردِ، نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ، لکھیں   خال کو دانہ اور زُلف کو دام
آتش و آب و بادہ و خاک نے لی   وضعِ سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام، خسروِ روز   ماہِ تاباں کا اِسم، شحنۂ شام
تیری توقیع سلطنت کو بھی   دی بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حُکم نے بموجبِ حکم   اُس رقم کو دیا طرازِ دَوام۔
ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام

شعر۔۱ ماہ نو (ہلال) کی خمیدگی کو اس کے جھک کر سلام کرنے سے تعبیر کیا ہے۔

شعر۔۲ دودن آیا ہے تو نظر دمِ صبح: یعنی چھبیس اور ستائیس کو چاند چودہ تاریخ کے بعد گھٹنا شروع ہو جاتا ہے اور ہر دوسری رات کو پہلی رات سے دیر میں اُٹھتا ہے۔ حتّٰی کہ چھبیس تاریخ کو صرف ذرا سا ہلال کے برابر رہ جاتا ہے اور وہ بھی صرف صبح کو تھوڑی دیر کے واسطے دکھائی دیتا ہے۔ یا تو وہ چھبیس سے ہی غائب ہو جاتا ہے، یا پھر ستائیس کی صبح کو تھوڑی دیر نظر آنے کے بعد غائب ہو جاتا ہے۔ دونوں حالتوں میں پورے دو روز بالکل غائب رہتا ہے۔ اگر چھبیس سے غائب ہوا ہے تو ستائیس، اٹھائیس کو اور اگر ستائیس سے غائب ہوا ہے تو اٹھائیس اور اُنتیس کو۔ شعر نمبر ۶ میں دو روز کے ساتھ تیسرا دن چاندرات کا بھی شامل کر لیا ہے۔

شعر۔۳ پہلے مصرعہ میں سوال اور دوسرے میں جواب ہے۔

شعر۔۵ یعنی اے باعث سرور و نشاطِ خواص و عوام مرحبا مرحبا۔

شعر۔۷ صبح جو جائے اور آئے شام: چھبیس یا ستائیس کی صبح کو غائب ہوا تھا اور اُنتیس یا تیس کی شام کو نکل آیا۔ پس صبح کو گیا اور شام کو آ گیا۔ یہ پورا شعر ایک عام محاورہ ہے جس کو شاعر نے نہایت خوبی کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔

شعر۔۹ نمّام: چغلخور۔

شعر۔۱۰ انام: عوام۔ امیدگاہ انام: یعنی جس سے عوام کی امیدیں وابستہ ہیں۔

شعر۔۱۱ حلقہ بگوش: غلام۔ ہلال کے لیے حلقہ بگوش کا لفظ لانا مُنتہائے فصاحت ہے۔ مصرعہ ثانی میں جیسا کہ مرزا نے دوسرے شعر میں صاف کر دیا ہے، استفہام اقراری ہے۔ یعنی جس طرح تو اس کے در کا غلام ہے اسی طرح غالبؔ بھی اس کا غلام ہے۔

شعر۔۱۳ بر سبیل دوام: ہمیشہ۔ یعنی اے ماہ اگر خورشید کو ہمیشہ ہر روز اس کی قربت (کا فخر) حاصل ہے تو ہوا کرے۔

شعر۔۱۴ تجھ کو روشناسی اور باریابی کا شرف و مرتبہ عید ماہ رمضان کی تقریب کی موقع کے سوائے کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ صیام جمع ہے صوم کی بمعنی روزہ۔

شعر۔۱۵ ماہ تمام: بدر۔

شعر۔۱۶ کس خوبی کے ساتھ انعام کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شعر۔۲۰، ۲۱، ۲۲ گام: قدم۔ مشکوے: محلات۔ بام: کوٹھا۔ جب تیری تیزیِ گام چودہ منازل ملکی طے کر چکے۔ یعنی جب تو بدر بن جاوے اور تیری چاندنی ہر کوچہ و محل، منظر و بام پر پھیل جاوے، اس وقت میرے ہاتھ میں اپنی صورت جیسا ایک ساغرِ بلوریں، شراب سے بھرا ہوا میرے ہاتھ میں دیکھنا۔

شعر۔۲۳ توسن: گھوڑا۔

غزل

شعر۔۲۴ یعنی میرا تو زہر غم سے ہی کام تمام ہو چکا تھا۔ تو نے ناحق میرے قتل کی اپنے سر پر بدنامی لی۔

شعر۔۲۵ یعنی حرام حرام دونوں برابر، یا یہ کہ شراب کیوں کر نہ پیے جاؤں۔ کم از کم اس سے غم ہی غلط ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ اور کہہ چکے ہیں:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو؟ اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

شعر۔۲۶ یعنی اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ مجھ کو ان کی گالیوں میں بھی مزا آتا ہے تو وہ گالیاں دینا بھی بند کر دیں گے۔ اسی قسم کا ایک شعر اور بھی گزر چکا ہے:

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو شکوۂ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

شعر۔۲۷ ناقوس: سنکھ، گھنٹہ۔ یعنی ہمارا کوئی مذہب نہیں۔ جب جو جی چاہا کر لیا۔

شعر۔۲۸ دام: ادھار

شعر۔۲۹ ابرام: ضد کرنا:

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مُفت آئے تو مال اچھا ہے

شعر۔۳۰ یعنی میں نے اپنا نام غالب صرف ان کے چھیڑنے کو رکھا ہے تا کہ ان کو غصہ آئے اور میں دیکھوں۔

شعر۔۳۱ بوجہ حُسن کے چاند کو پری چہرہ اور بوجہ گردش کے اس کو پیکِ تیز خرام کہا ہے۔

شعر۔۳۲ زہرہ و بہرام، دونوں ستاروں کے نام ہیں۔ پہلے کو زہل اور دوسرے کو مرّیخ بھی کہتے ہیں۔ ناصیہ سا۔ پیشانی رگڑنے والا، سر بسجود۔

شعر۔۳۵ حدیقہ: باغ۔

شعر۔۳۶ اس کا ہر فعل ایک معجزہ اور ہر قول ایک الہام معلوم ہوتا ہے۔

شعر۔۳۷ رستم و سام دونوں فارس کے مشہور پہلوانوں کے نام ہیں۔ سام رستم کا دادا تھا۔

شعر۔۳۸ فرخی فرجام: مبارک انجام، مبارک۔ خی: مبارک۔ فرجام: انجام، آخر۔

شعر۔۳۹ یعنی چشم بددور تیرا شکوہ و دبدبہ شاہانہ ہے اور ماشاء اللہ تیرا کلام عارفانہ ہے۔

شعر۔۴۰ مرشد جام: مولانا جامی سے مراد ہے۔ یعنی تیرے جاں نثاروں اور تجھ سے فیضیاب ہونے والوں میں اس قدر بڑے بڑے لوگ ہیں۔

شعر۔۴۱ ایرج: نام ہے فریدوں بادشاہ فارس کے بیٹے کا۔ تور: فریدوں کا بڑا بیٹا۔ ملک توران اسی کی طرف منسوب ہے۔ خسرو: نام پرویز بن ہُرمز بن نوشیرواں کا، جو شیریں کا عاشق تھا۔ بہرام: نام ایک بادشاہ عراق کا جس کو بہرام گور بھی کہتے ہیں۔

شعر۔۴۲ گیو۔ گودرز۔ بیژن۔ اور رہام چاروں ایران کے مشہور پہلوانوں کے نام ہیں۔

شعر۔۴۳ موشگافی: بال کو چیر دینا۔ یعنی تیرے تیر کی موشگافی کا کیا کہنا! اور تیری تلوار کی آبداری کی کیا بات ہے!

شعر۔۴۴ ہدف: نشانہ۔ یعنی تیرا تیر دشمن کے تیر کو بیندھکر نکل جاتا ہے اور تیری تلوار دشمن کی تلوار میں گھُس جاتا ہے۔

شعر۔۴۵۔۴۶ گرج۔ کڑک، جسد، کود۔ رخش: گھوڑا۔ صنعت لف و نشر مرتب ہے۔ تیسرے مصرعہ کا تعلق پہلے مصرعہ سے اور چوتھے کا دوسرے سے ہے۔

شعر۔۴۷۔۴۸ فن صورت گری: مصوّری۔ مضروب، ضرب پایا ہوا، زخمی۔

شعر۔۴۹ رقم پذیر ہوئے: لکھے گئے۔ لیالی: جمع ہے لیل کی بمعنی رات۔

شعر۔۵۰ کلک: قلم۔

شعر۔۵۱ شاہد: معشوق۔ دشمن کام۔ نامراد۔ (کام۔ مقصد۔ مراد)

شعر۔۵۲ یعنی آسمان کے متعلق حکم دیا گیا کہ اس کو سب گنبد تیز گرد نیلی فام (چھت) کہیں۔

شعر۔۵۴ یعنی آتش کو سوز، آب کو نمی، باد کو رم (بھاگنا) اور خاک کو آرام کی خاصیتیں عطا ہوئیں۔ صنعت لف و نشر مرتب ہے۔

شعر۔۵۵ توقیع: فرمانِ بادشاہی۔ ارقام: لکھنا۔ مطلب یہ کہ ان احکام کے ساتھ ساتھ تیری سلطنت کا بھی فرمان لکھا گیا۔

شعر۔۵۷ یعنی کاتب حکم نے حسب الحکم خداوندی تیرے فرمانِ سلطنت پر ہمیشگی کا نقش بنا دیا۔ یعنی لکھ دیا کہ تیری سلطنت ہمیشہ قایم رہے گی۔

شعر۔۵۸ یعنی تیری سلطنت ازل سے شروع ہوئی ہے۔ خدا کرے اس کا خاتمہ کہیں ابد میں جا کر ہو۔

قصیدہ چہارم

صُبح دم دروازۂ خاور کھُلا　　مہرِ عالمتاب کا منظر کھُلا
خسروِ انجم کے آیا صَرف میں　　شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھُلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود　　صبح کو رازِ مہ و اختر کھُلا
ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ　　دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھُلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو　　موتیوں کا ہر طرف زیور کھُلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر　　اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھُلا
تھی نظر بندی، کیا جب رَدِّ سحر　　بادۂ گُلرنگ کا ساغر کھُلا
لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے　　رکھ دیا ہے ایک جام زر کھلا
بزمِ سُلطانی ہُوئی آراستہ　　کعبۂ امن و اماں کا در کھُلا
تاجِ زرّیں، مہرِ تاباں سے سوا　　خسروِ آفاق کے مُنھ پر کھُلا

شاہِ روشن دل، بہادر شہ کہ، ہے   رازِ ہستی اُس پہ سرتا سر کھُلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں   مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھُلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے   عُقدۂ احکامِ پیغمبر کھُلا
پہلے دارا کا نِکل آیا ہے نام   اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھُلا
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے   واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھُلا

قطعہ

توسنِ شہ میں وہ خوبی ہے کہ جب   تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھُلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب   تو کہے، بُتخانۂ آزر کھُلا
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے   منصبِ مہرومہ و محور کھُلا
لاکھ عقدے دل میں تھے، لیکن ہر ایک   مری حدِّ وسع سے باہر کھُلا
تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید   کِس نے کھولا، کب کھُلا، کیونکر کھُلا؟
باغِ معنی کی دکھاؤںگا بہار   مُجھ سے گر شاہِ سخن گُستر کھُلا
ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نَفَس   لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھُلا

غزل

کُنج میں بیٹھا رہوں یُوں پر کھُلا   کاشکے ہوتا قفَس کا دَر کھُلا!
ہم پُکاریں اور کھُلے، یوں کون جائے؟   یار کا دروازہ پائیں گر کھُلا
ہم کو، ہے اِس رازداری پر گھمنڈ   دوست کا ہے راز دشمن پر کھُلا
واقعی دلِ پر بھلا لگتا تھا داغ   زخم لیکن داغ سے بہتر کھُلا
ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کماں!   کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا
مُفت کا کِس کو بُرا ہے بدرقہ!   رہروی میں پردۂ رہبر کھُلا
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک!   آگ بھڑکی مینھ اگر دَم بھر کھُلا
نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ   رہ گیا خط میری چھاتی پر کھُلا

دیکھیو، غالبؔ سے گر اُلجھا کوئی!   ہے ولی پوشیدہ، اور کافر کھُلا
پھر ہوا مِدحت طرازی کا خیال   پھر مہ و خُرشید کا دفتر کھُلا
خامہ سے پائی، طبیعت نے، مدد   بادباں بھی، اُٹھتے ہی لنگر کھُلا
مدح سے ممدُوح کی دیکھی شکوہ   یاں عَرَض سے رُتبۂ جوہر کھُلا
مِہر کانپا، چرخ چکّر کھا گیا   بادشہ کا رایتِ لشکر کھُلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب   اب عُلُوِّ پایۂ منبر کھُلا
سِکّۂ شہ کا ہوا ہے روشناس   اب عیارِ آبروے زر کھُلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ   اب مآلِ سعیِ اسکندر کھُلا
مُلک کے وارث کو دیکھا خلق نے   اب فریبِ طُغرل و سَنجر کھُلا
ہو سکے کیا مدح، ہاں اِک نام ہے   دفترِ مدحِ جہاں داور کھُلا
فِکر اچھی، پر ستایش ناتمام   عَجزِ اعجازِ ستایش گر کھُلا
جانتا ہوں، ہے خطِ لوحِ اَزل   تُم پہ اے خاقانِ نام آور! کھُلا

تم کرو صاحبقرانی، جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھُلا

شعر۔۱ خاور: مشرق۔

شعر۔۲ یعنی رات کو جو ستارے نکلے ہوئے تھے، وہ سورج نکلنے پر سب چھپ گئے۔

شعر۔۳ سیمیا: ایک فن کا نام ہے جس کے ذریعہ عجیب عجیب چیزیں، جن کا حقیقتاً کوئی وجود نہیں، ہونا نظر آنے لگتی ہیں۔ پس مطلب یہ ہوا کہ صبح کو ہم کو یہ بات ظاہر ہوئی کہ وہ چیزیں جو رات کو چاند اور ستاروں کی شکل میں دکھلائی دیتی تھیں، صرف اشیائے وہمی تھیں۔ فی نفسہٖ ان کا کوئی وجود نہ تھا۔

شعر۔۴ یعنی ستارے اصل میں تو کچھ ہیں اور نظر کچھ آتے ہیں۔ یہ بازیگر کھُلا دھوکہ دیتے ہیں۔ ستارے جو منوّر نظر آئے، تو وہ خود روشن نہیں بلکہ ان کی روشنی سُورج کی روشنی ہے۔

شعر۔۷ یعنی جب طلسم نظر بندی ہٹا تو ہم کو معلوم ہوا کہ وہ دراصل شراب سُرخ کا بھرا ہوا ایک پیالہ ہے۔

شعر۔۸ صبوحی: شراب پینا۔ وہ شراب جو صبح کو پی جاتی ہے۔

شعر۔۹ یعنی بادشاہِ جہاں کے مُنہ پر تاج زرّیں خورشید درخشاں سے بھی خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔

شعر۔۱۲ تکوین: پیدا کرنا، ہست کرنا۔ یعنی ایسا بادشاہ کہ جس کے پیدا ہونے کے سبب سے نو آسمان اور ساتوں ستارے پیدا کیے گئے ہیں۔

شعر۔۱۳ عقدہ: گرہ۔ یعنی وہ بادشاہ کہ جس نے احکامِ رسولِ خدا کی باریکیوں اور ان کے نکات کو بیان کیا ہے۔

شعر۔۱۴ سرہنگ: سپاہی۔ یعنی دارا جیسے عالی مرتبت بادشاہ کا نام اس کے سپاہیوں کی فہرست میں ہے۔

شعر۔۱۶ تھان: گھوڑا باندھنے کی جگہ۔ غیرت صرصر: ہوا سے بھی زیادہ تیز۔

شعر۔۱۷ آزر: حضرت ابراہیمؑ کے چچا کا نام ہے جو کہ بُت تراش تھا۔

شعر۔۱۸ محور: اُس خط وہمی کو کہتے ہیں جو قطب شمالی سے قطب جنوبی تک کھینچا گیا ہے، اور جس کے چاروں طرف زمیں گردش کرتی ہے۔

شعر۔۱۹ یعنی میرے دل کے عقدے جو میرے کھولے نہ کُھلتے تھے، اس کے فیض سے یوں ہی کُھل گئے۔

شعر۔۲۰ یعنی میرا دل اک ایسا قفل تھا کہ جس کی کوئی کُنجی ہی نہ تھی۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ وہ کُھل گیا۔ آخر اس کو کس نے کھولا۔ اور وہ کب کھلا اور کیسے کھلا؟

شعر۔۲۱ گر شاہ سخن گُستر کُھلا۔ یعنی اگر اس نے بے تکلفی برتی۔

شعر۔۲۲ طبلہ: صندقچہ۔ پٹاری۔

شعر۔۲۳ یعنی افسوس کہ میں قفس میں اس طرح پر کھولے ہوئے بیٹھا رہوں۔ کاش کہ قفس کا در بھی کُھلا ہوتا۔

شعر۔۲۴ یعنی یار کا دروازہ کُھلا ہوا دیکھ کر جانے کو جی نہیں چاہتا، کیوں کہ ہر شخص جا سکتا ہے۔ ہماری آرزو تو یہ ہے کہ دروازہ اوروں کے لیے بند رہے اور صرف ہمارے ہی واسطے کھولا جائے۔ یا یہ کہ اس طرح کون جائے کہ جائیں، جا کر دستک دیں، جب جا کر کہیں دروازہ کُھلے! ہاں

اگر دروازہ کُھلا ہوا ہو تو کوئی مضایقہ نہیں۔

شعر۔۲۷ یعنی اس کے اشارات اور غمزہ جات بدستور گھائل کیے جاتے ہیں۔

شعر۔۲۸ بدرقہ: نگہبان، رہبر۔ یعنی اگر راستہ چل کر ہم کو یہ معلوم ہوا کہ رہبر ناواقف ہے تو ہمارا نقصان ہی کیا ہوا، مُفت کا رہبر ہے۔ جیسا بھی کچھ ہے اچھا ہے:

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

شعر۔۲۹ یعنی باران اشکباری سے کچھ تسکین ضرور ہوتی ہے۔ لیکن آخر اس سوز دل کا کیا علاج کہ اگر تھوڑی دیر کو بھی آنسو بند ہو جاویں تو سینہ میں آگ بھڑک اٹھے۔

شعر۔۳۰ یعنی خدا خدا کر کے تو ان کا خط آیا لیکن افسوس کہ میں اس کو پڑھنے نہ پایا تھا کہ روح قبض ہو گئی اور وہ یوں ہی سینہ پر کُھلا رہ گیا۔ ایسا ہی حسرت بھرا ایک اور شعر بھی ہے:

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

شعر۔۳۱ متنبہ کرتا ہے کہ غالبؔ سے ہرگز کوئی نہ اُلجھنا، اِس لیے کہ وہ ظاہر میں کافر نظر آتا ہے لیکن در پردہ ولی ہے۔

شعر۔۳۲ یعنی غزل کے بعد پھر مدح لکھنے کا خیال آیا۔

شعر۔۳۳ قلم کو بادبان اور طبیعت کو لنگر سے تشبیہ دی ہے یعنی قلم اُٹھتے ہی طبیعت بھی کُھل گئی۔

شعر۔۳۴ مدح کو عرض اور ممدوح کو جوہر کہا ہے۔

شعر۔۳۵ رایت: علم لشکر کا، جھنڈا۔

شعر۔۳۶ یعنی منبر کے بلند مرتبہ کا سبب یہ ہے کہ خطیب اس پر کھڑا ہو کر بادشاہ کا نام لیتا ہے۔ خطبہ میں بادشاہ وقت کا نام پڑھا جاتا ہے۔

شعر۔۳۷ عیار: کسوٹی۔ یعنی آبروئے زر کا باعث اس پر بادشاہ کا سکہ ہے

شعر۔۳۸ مآل: نتیجہ، انجام۔ سکندر آئینہ کا موجد تھا۔

شعر۔۳۹ یعنی طغرلؔ و سنجرؔ فریب سے بادشاہ بن بیٹھے تھے۔ اصل میں سلطنت کا وارث میرا ممدوح ہے۔

شعر۔۴۰ جہان داور: بادشاہِ دنیا۔

شعر۔۴۲ اے خاقان نام آور، میں جانتا ہوں کہ تحریر لوح ازل کا حال تجھ کو بخوبی معلوم ہے۔ (اس لیے میری تکرار کی ضرورت نہیں)

مثنوی در صفت انبہ

ہاں دلِ دردمندِ زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز!
خامہ کا صفحے پر رواں ہونا
شاخِ گُل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے، کیا لکھیے؟
نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے۔
بارے، آموں کا کچھ بیاں ہوجائے
خامہ، نخلِ رطب فشاں ہوجائے
آم کا کون مردِ میداں ہے؟
ثمر و شاخ، گوے چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں!
آئے، یہ گوے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جاوے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو، تمھیں خبر کیا ہے!
آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گُل اس میں نہ شاخ و برگ، نہ بار
جب خزاں آئے تب ہو اُس کی بہار
اور دوڑایئے قیاس کہاں!
جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں!
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
کوہکن باوجود غمگینی

ق

جان دینے میں اس کو یکتا جان
پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
کہ دواخانۂ ازل میں مگر
آتشِ گُل پہ قند کا ہے قوام
شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے بحکمِ ربُّ النّاس
بھر کے بھیجے ہیں سر بمُہر گلاس
یا لگا کر خِضَر نے شاخِ نبات
مدّتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں ورنہ، اور کہاں یہ نخل
تھا تُرنجِ زر ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد، پر کہاں بُو باس
آم کو دیکھتا، اگر اِک بار
پھینک دیتا طلاے دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا
نازشِ دودمانِ آب وہوا
رہروِ راہِ خُلد کا توشہ
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ برگ و بار ہے، آم
ناز پروردۂ بہار ہے، آم
خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو
وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد
عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد
فخرِ دیں، عزِّ شان و جاہ و جلال
زینتِ طینت و جمالِ کمال
کارفرماے دین و دولت و بخت
چہرہ آراے تاج و مسند و تخت
سایہ اُس کا، ہُما کا سایہ ہے
خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے
اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور
جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
اِس خُداوندِ بندہ پرور کو
وارثِ گنج و تخت و افسر کو
شاد و دلشاد و شادماں رکھیو
اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

شعر۔۱ یعنی اے دلِ دردمند زمزمہ ساز، تو خزانہ راز کا دروازہ کیوں نہیں کھولتا۔

شعر۔۴ رُطب: خرما۔

شعر۔۵ ثمر کو گوے (گیند) اور شاخ کو چوگان سے تشبیہ دی ہے۔

شعر۔۶ تاک: انگور کی بیل۔ یعنی تاک کے دل میں ارمان نہ رہنا چاہیے۔ آئے اور آن کر مقابلہ کرے۔

شعر۔۷ انگور کو تاک کے پھپولے سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تشبیہ نہایت ہی بے مثل ہے۔

شعر۔۱۱ گنّوں کی تحقیر کی ہے کہ اسمیں نہ پھول ہوتا ہے، نہ شاخ، نہ پتّے اور نہ پھل، اور جب اور چیزوں کی خزاں ہوتی ہے تب اس کی بہار آتی ہے۔ گنّے کی فصل جاڑوں (موسم خزاں) میں ہوتی ہے۔

شعر۔۱۲ یعنی آموں میں جو مٹھاس ہے، وہ جانِ شیریں میں بھی نہیں۔

شعر۔۱۳ شیرینی اور کوہ کن میں رعایتِ لفظی ہے۔

شعر۔۱۷ رافت: مہربانی۔

شعر۔۱۸ انگبیں: شہد۔ ربُّ النّاس:۔ آدمیوں کی پرورش کرنے والا، خداوند تعالیٰ۔

شعر۔۱۹ تُرنج: مشہور میوہ ہے۔ مثل بڑے لیموں کے۔

شعر۔۲۲ طلائے دست افشار: خالص سونا جو ہاتھ سے دبانے سے دب جاتا ہے۔ تُرنج زر کی طرف اشارہ ہے۔

شعر۔۲۳ کارگاہ برگ ونوا: درخت۔ دودمان آب وہوا:۔ باغ۔

شعر۔۲۴ طوبیٰ: نام ایک درخت کا بہشت میں جس کی ایک ایک شاخ بہشتیوں کے مکان میں ہوگی۔ اور اس ایک شاخ سے طرح طرح کا میوہ اور خوشبوئیں حاصل ہوں گی۔

سدرہ: ساتویں آسمان پر ایک بیری کا درخت ہے، اس کو سدرۃ المنتہےٰ بھی کہتے ہیں۔

شعر۔۲۶ نوبر: نیا پھل۔

شعر۔۲۷ عہد اوّل بمعنی عہد و پیان و عہد دوم بمعنی زمانہ، وقت۔

شعر۔۳۱ مفیض: فیض پہنچانے والا۔ خدا کی طرف خطاب ہے۔

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر!
اے جہاندارِ کرمِ شیوہ و بے شبہ و عدیل!

پانو سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اِکلیل
تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل
تجھ سے عالم پہ کھلا، رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دُنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل
بہ سخن، اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
بہ کرم داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل
تا ترے وقت میں ہو عیشِ وطرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و اَلم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑدیا ثور سے جانا باہر
زُہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل
تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش، مری انجاحِ مقاصد کی کفیل
تیرا اقبالِ ترحّم، مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کجباز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
تپشِ دل، نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دَم، نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل
دُرِ معنی سے مرا صفحہ، لقا کی داڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ، عَمَر کی زنبیل
فکر میری، گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کِلک میری، رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدّق، توضیح
میرے اِجمال سے کرتی ہے تراوش، تفصیل
نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں! خستہ نوازی میں یہ دیر!
کعبۂ امن واماں! عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

قطعہ (۲)

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی، جانے دو، مل جاؤ
قسم لو ہم سے، گر یہ بھی کہیں، کیوں ہم نہ کہتے تھے؟

قطعہ (۳)

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں!
اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے!

وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب وہ نازنین بُتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حَف نظر! طاقت رُبادہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے!

قطعہ(۴)

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی زیب دیتا ہے، اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ، اِسے کیا لکھیے! ناطقہ سر بہ گریباں کہ، اسے کیا کہیے!
مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے حرزِ بازوے شگرفانِ خود آرا کہیے
مِسّی آلودہ سرانگشتِ حسیناں لکھیے داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلا کہیے
حَجر الاسودِ دیوارِ حَرم کیجے فرض نافہ آہوے بیابانِ ختن کا کہیے
وضع میں اِس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
صومعے میں اِسے ٹھہرایئے گر مُہرِ نماز میکدے میں اِسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
کیوں اِسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟ کیوں اِسے نقطۂ پَر کارِ تمنا کہیے؟
کیوں اِسے گوہرِ نایاب تصوّر کیجے؟ کیوں اِسے مردُمکِ دیدۂ عنقا کہیے؟
کیوں اِسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھیے؟ کیوں اِسے نقشِ پئے ناقۂ سلما کہیے
بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض اور اِس چکنی سُپاری کو سُویدا کہیے

قطعہ(۵)

نہ پوچھ اِس کی حقیقت، حضورِ والا نے مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خُلد سے باہر جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

قطعہ(۱)

شعر۔۱ عدیل: وہ دو شخص جو ایک کجاوہ میں دونوں طرف بیٹھیں۔ ہر ایک دوسرے کا عدیل ہوا۔ پس بےعدیل بمعنی جس کا کوئی ہمسر نہ ہو۔

شعر۔۲ اورنگ: تخت۔ اکلیل: تاج۔ مطلب یہ ہے کہ تخت تیرے پانو پر اپنا سرِ ارادت ملتا ہے، اور تاج تیرے سر سے سعادت حاصل کرتا ہے۔

شعر۔۳ شانہ: کنگھی۔ یعنی تیرا اندازِ سخن الہامی دقائق کو سُلجھا دیتا ہے اور تیرے قلم کی جنبش گویا جنبشِ بالِ جبرئیل ہے، جس سے غیب کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ ایک جگہ مرزا خود اپنے متعلق بھی کہتے ہیں:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

شعر۔۴ بذل: بخشش۔ یعنی تیرے قربِ خداوندی اور تیری بخششِ عام کو دیکھ کر لوگوں کو 'قربِ کلیم' اور 'بذلِ خلیل' کا کچھ انداز ہو گیا۔ اپنے ممدوح کے قربِ خداوندی کو 'قربِ کلیم' (موسیٰ) اور اس کی بخشش کو 'بذلِ خلیل' (ابراہیم) سے تشبیہ دی ہے۔

شعر۔۵ یعنی تیری سخنوری سے معانی والفاظ کا مرتبہ بڑھ گیا ہے اور تیرے کرم سے قلزم و نیل شرمندہ ہیں۔

شعر۔۶ توفیر: زیادتی۔ تقلیل: کمی۔

شعر۔۷ ثور: نام دوسرے بُرج کا آسمان پر جو بہ شکل بیل ہے۔ حوت: نام بارھویں بُرج آسمان کا جو خوبصورت مچھلی کے ہے۔ ماہ کا بُرج ثور میں اور زہرہ کا حوت میں ہونا مبارک ہوتا ہے۔ تحویل: اصل میں تحول ہے، بمعنی پھر جانا ایک جگہ سے دوسری جگہ کو۔

شعر۔۸ انجاج: مطلب پورا کرنا۔

شعر۔۱۱ اپنے بخت کی ناسازی کو شاعر اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کو میرے ساتھ ایسی دشمنی ہے کہ پہلے میرے دستِ تدبیر کو بیکار کر کے مجھ کو مصیبت میں ڈالا ہے تاکہ میں اس سے نکل ہی نہ سکوں۔

شعر۔۱۲ جرِ ثقیل: نام ایک علم کا جس میں بھاری چیزوں کے کھینچنے کے قاعدے مُندرج ہوئے ہیں۔ مطلب یہ کہ تپشِ دل میرے لیے ایک خوفِ عظیم کا باعث ہے۔ اور کششِ دم (سانس لینا) مجھ کو جرِ ثقیل سے کم نہیں۔

شعر۔۱۳ 'لقا' اور عمر کی زنبیل' دونوں تلمیح داستان امیر حمزہ سے لی گئی ہیں۔ مشہور ہے کہ لقا کی داڑھی کے ہر ہر بال میں موتی پروئے گئے تھے عمر عیار کی زنبیل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اس میں پڑتا تھا، سب غائب ہو جاتا تھا اور وہ کبھی پُر نہ ہوتی تھی۔

شعر۔۱۴ یعنی گو میری عبارت مختصر ہے لیکن اس میں معانی و اشارات کثیر ہیں۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے   جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

شعر۔۱۵ ابہام: کسی بات کو کھول کر بیان نہ کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے ابہام پر توضیح قربان ہے اور میرے اجمال سے تفصیل ٹپکتی ہے۔

شعر۔۱۶ نیک ہوتی: یعنی اچھوتی۔

قطعہ(۲)

شعر۔۱ تقریر کیا کرتے تھے۔ یعنی بیان کیا کرتے تھے۔

شعر۔۲ کیوں نہ کہتے تھے۔ یعنی ہم پہلے ہی کہتے تھے کہ غیر بالکل بے وفا ہے۔

قطعہ(۳)

شعر۔۲ مطرا: تازہ، صاف و آبدار۔

شعر۔۳ حف نظر: چشم بد دور۔

قطعہ(۴)

شعر۔۱ ایک مجلس میں کسی صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا ''فیضی کو لوگ جیسا سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے۔'' اس پر بات بڑھی اور ان صاحب نے کہا کہ جب فیضی پہلی مرتبہ اکبر

کے پاس گیا تو اس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اسی وقت ارتجالاً پڑھا۔ مرزا بولے ''اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر تو ہر موقع پر بداہۃً کہہ سکتے ہیں۔'' یہ سُن کر انھوں نے فوراً ایک چکنی ڈلی ہتیلی پر رکھ کر مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے اُس وقت یہ قطعہ موزوں کر کے پڑھا۔

شعر۔۲ انگشت بدندان: حیرت زدہ، متحیر۔ سر بہ گریبان:۔ فکر مند، متفکر۔

شعر۔۳ حرز: تعویذ۔

شعر۔۴ مانہ: مشابہ۔

شعر۔۷ حجرالاسود: کعبہ میں ایک کالا پتھر ہے جس کا چھونا، باعث دُور ہونے گناہ کا ہے۔

شعر۔۹ صومعہ: عبادت خانہ۔

شعر۔۱۲ تکمہ: گھُنڈی لیکن اُردو میں گھنڈی کے حلقہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ ناقہ: اونٹنی۔ سلما: نام عرب کی ایک حسین معشوقہ کا۔

قطعہ(۵)

شعر۔۱ ''جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہل دربار کے لیے بطور اولوش کے بھیجا کرتے تھے۔ اس کے شکریہ میں مرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور میں کہتے تھے۔ یہ قطعہ بھی اسی قبیل کا ہے۔

جس وقت چوبدار شاہی یہ اولوش لے کر آیا، ایک باہر کا رہنے والا طالب علم جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا، موجود تھا۔ چوبدار کے چلے جانے کے بعد اس نے مرزا سے متعجب ہو کر پوچھا ''بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور اولوش کے تقسیم ہوتی ہے۔'' مرزا نے کہا 'ارے احمق، چنا وہ چیز ہے کہ اس نے ایک دفعہ جناب الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مُجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ مجھے دَلتے ہیں، پیستے ہیں، بھونتے ہیں، پکاتے ہیں اور مجھ سے سیکڑوں کھانے کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جا، ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا

جائیں۔" (یادگارِ غالب)

سہرا

خوش ہوا اے بخت! کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے! پَر اے طرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا
ہے رگِ ابر گہر بار سراسر سہرا
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مکرر سہرا
جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا
تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تاب گراں باریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

شعر۔۱ بادشاہ کے چھوٹے بیٹے جواں بخت کی شادی کے موقع پر مرزا نے یہ سہرا لکھ کر نہایت تکلف کے ساتھ بادشاہ کی حضور میں پیش کیا۔ مقطع کو دیکھ کر بادشاہ کو یہ خیال گزار کہ یہ شاید ان کے استاد پر حملہ ہے۔ اس لیے ان کے ایما سے ذوق نے بھی تعریضاً اسی قافیہ و ردیف میں یہ سہرا لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا:

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا
آج وہ دن ہے کہ لائے درانجم سے فلک
کشتی زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابش حسن سے مانند شعاع خورشید
رُخِ پُرنور پہ ہے تیرے منور سہرا
وہ کہے صلِّ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھیے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا
تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
دھوم ہے گلشن آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغان نواسنج نہ کیونکر سہرا
روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تار بارش سے بنا ایک سرار سہرا
ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا
اک گہر بھی نہیں صدکان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا
پھرتی خوشبو سے ہے اتراتی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا
سُر پہ طرّہ ہے مزین تو گلے میں بدّھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا
رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے ہٹا کر سہرا
کثرت تار نظر سے ہے تماشائیوں کے
دم نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا
درخوش آب مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوقؔ ثناگر سہرا

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنادو ان کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اس سہرے کا جواب مرزا نے آیندہ قطعہ میں دیا ہے۔

شعر۔۳ **لمبر:** مرزا نے نمبر کو بگاڑ کر اس کا ترجمہ اردو میں لمبر کیا ہے۔

شعر۔۱۱ یعنی سہرے کا تار نہیں ہے کہ وہ گرانباری گوہر کی تاب نہ لا سکے، بلکہ یہ رگِ ابر بہار ہے، موتیوں کے وزن کو برداشت کر لے گا۔

قطعہ (۶)

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پُشت سے، ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری، ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

آزادہ رَو ہوں، اور مِرا مسلک ہے صُلحِ کُل ہر گز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفؔر کا غلام ہوں مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ہو مجھے پر خاش کا خیال یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نُما ہے شہنشاہ کا ضمیر سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون، اور ریختہ، ہاں اِس سے مدّعا جُز اِنبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے، سخن گسترانہ بات مقصود اُس سے، قطعِ محبت نہیں مجھے
رُوئے سخن کسی کی طرف ہو، تو رُوسیاہ سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
قِسمت بُری سہی، پہ طبیعت بُری نہیں ہے شُکر کی جگہ کہ، شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ، جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

شعر۔۳ مسلک: راستہ۔

شعر۔۷ انبساط: خوشی

شعر۔۸ امتثال: حکم ماننا یعنی میں نے جو سہرا لکھا، وہ محض بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔

مدح

نصرتُ الملک بہادر! مُجھے بتلا کہ مجھے تجھ سے جو اتنی ارادت ہے، تو کِس بات سے ہے؟
گر چہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور میں وہ ہوں کہ، گر جی میں کبھی غور کروں غیر کیا، خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا، جس کے سبب سے سرِ دست نسبت اِک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عِناں! یہ دُعا شام و سَحَر قاضیِ حاجات سے ہے
تو سکندر ہے، مرا فخر ہے مِلنا تیرا گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اِس پہ گزرے نہ گُماں ریو و ریا کا زنہار
غالبِ خاک نشیں، اہلِ خرابات سے ہے

قطعہ ۷: شعر۔۴ یعنی میں خستہ دل ہوں اور تو کریم ہے۔ اس لیے خستگی کا خدا بھلا کرے کہ اس کی وجہ سے مجھ کو تیرے دست (کرم) سے یک گونہ نسبت حاصل ہے۔

شعر۔۷ ریو و ریا: مکّاری، ریا کاری۔

آخری چہار شنبہ

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صَفَر، چلو رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مُشک بُو کی ناند
جو آئے، جام بھر کے پیے اور ہو کے مست سبزے کو روندتا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند
غالبؔ! یہ کیا بیاں ہے، بجز مدحِ بادشاہ بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت خواند
بٹتے ہیں سونے رُوپے کے چھلّے حضور میں ہے جن کے آگے سیم و زر، مہر و ماہ ماند
یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

شعر۔۱ آخر چہار شنبہ ماہ صفر کو حضرت رسول مقبول صلعم کا یوم صحت سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اس روز خوشی منائی جاتی ہے۔ بادشاہ کے یہاں بھی اس روز خوشی میں چاندی سونے کے چھلّے تقسیم کیے جاتے تھے۔

درمدحِ شاہ

اے شاہِ جہاں گیر، جہاں بخشِ جہاندار! ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
جو عقدۂ دُشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو تو وا کرے اُس عقدے کو، سو بھی بہ اشارت
ممکن ہے، کرے خضر سکندر سے ترا ذِکر! گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کوسُلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخرِ سُلیماں جو کرے تیری وزارت
ہے نقشِ مُریدی ترا، فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غُلامی ترا، توقیعِ امارت
تو آب سے گر سلب کرے، طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے، تابِ شرارت
ڈھونڈھے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت
ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغُّل
ہے گر چہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دُعا پر
قاصر ہے ستائش میں تری، میری عبارت
نَوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظّارگیِ صنعتِ حق اہل بصارت
تجھ کو شرف مہرِ جہانتاب مُبارک
غالبؔ کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

شعر۔۲ یعنی جو عقدۂ مشکل کسی طرح نہیں کھُلتا، تو اس کو اپنے ایک اشارے سے کھول دیتا ہے۔

شعر۔۳ ممکن ہے کرے؟ استفہام انکاری ہے یعنی نہیں کر سکتا تھا۔ طہارت: پاکیزگی یعنی اگر خضر اپنے مُنہ کو آب حیات سے پاک نہ کر لیتا تو وہ ہرگز ازراہ ادب سکندر سے تیراز کرنہ کرتا۔

شعر۔۴ یعنی آصف کو تو سلیمان ہی کی وزارت پر فخر تھا۔ اگر سلیمان خود تیری وزارت کرے تو اس کے لیے باعث فخر ہے۔

شعر۔۵ فرمان: حکم۔

شعر۔۶ سلب: نیست کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تو پانی سے بہنے کی طاقت اور آگ سے گرمی نکال دے تو نہ موج دریا میں روانی رہے اور نہ آتش سوزاں میں حرارت۔

شعر۔۸ توغل: مشق کامل کرنا، مشغول رہنا۔

شعر۔۱۰ نظارگی: نظارہ کرنے والے۔ بطور اسم فاعل استعمال ہوا ہے۔

شعر۔۱۱ عتبہ: آستانہ، چوکھٹ۔

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ، اگر دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے، روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے، کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے، تو ناچار کیا کرے

قطعہ۔ ۱۰ یہ قطعہ جب رمضان میں بادشاہ کے حضور میں پڑھا گیا تو بادشاہ اور تمام اہل دربار بے اختیار ہنس پڑے۔

گزارشِ مصنّف بحضورِ شاہ

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ!
اے جہاندارِ آفتاب آثار!
تھا میں اِک بے نوائے گوشہ نشیں
تھا میں اِک درد مندِ سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیّار
گرچہ ازروئے ننگ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ، ہوں
بادشہ کا غلامِ کار گزار
خانہ زاد اور مُرید اور مدّاح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہوگیا صد شکر
نسبتیں ہوگئیں مشخّص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدّعائے ضروری الاظہار
پیرو مرشدا! اگر چہ مجھ کو نہیں
ذوقِ آرایشِ سرودستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہوں، ہے اگر چہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ ، اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار!
آگ تاپے کہاں تلک انساں!
دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار!
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار
میری تنخواہ جو مقرر ہے
اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردے کی چھماہی ایک
خَلق کا ہے اِسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات
اور چھماہی ہو سال میں دوبار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سُود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا
ہوگیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سُنیے
ہے زباں میری، تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میری، ابرِ گوہر بار
ظلم ہے، گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے، گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا!
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار!
میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دُعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سَلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ۔۱۱ گزارش مصنف: یہ وہ قطعہ ہے جو مرزا نے بادشاہ کی حضور میں اس درخواست سے گزارنا تھا کہ ان کی تنخواہ بجائے چھ مہینہ کی اکھٹی ملنے کے، ماہ بہ ماہ مل جایا کرے۔ بادشاہ نے یہ درخواست منظور فرمائی اور تنخواہ ماہ بہ ماہ ملنے لگی۔

شعر۔۱ یعنی اے وہ شہنشاہ کہ جس کا تخت آسمان ہے اور جس کی حکومت مثل آفتاب سارے جہان پر پھیلی ہوئی ہے۔

شعر۔۴ ثوابت: وہ ستارے جو حرکت نہیں کرتے۔ سیّارے: وہ جو حرکت کرتے ہیں۔ مطلب یہ

کہ تیری آبروبخشی سے مجھ ذرہ ناچیز کا رتبہ اتنا بلند ہوگیا ہے کہ ثوابت وسیارے تک سے روشناسی ہوگئی ہے۔

شعر۔۹ مشخص: تجویز کیا گیا، تشخیص کیا گیا۔ نسبتیں ہوگئیں مشخص چار: یعنی بادشاہ سے چار نسبتیں (تعلق) قائم ہوگئیں (۱) خانہ زاد غلام (۲) مُرید (۳) مدّاح (۴) نوکر۔

شعر۔۱۲ زمہریر: سخت سردی۔ کرۂ ہوا کا ایک طبقہ جو نہایت سرد ہے۔ بادِ زمہریرا: نہایت سرد ہوا۔

شعر۔۱۳ نزار: لاغر، دُبلا۔

شعر۔۱۷ وقنا عذاب النار: خدا ہم کو عذاب دوزخ سے بچاوے۔

شعر۔۱۸ ہنجار: طریقہ۔

شعر۔۲۳ نغز گو: خوش گو

قطعہ (۱۲)

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا، شریکِ غالب ہے

قطعہ۔۱ سیہ بخت: بدنصیب۔

شعر۔۲ شریک غالب: وہ شریک جس کا حصہ دوسرے شریکوں سے غالب ہو۔ یہ لفظ اپنی جگہ نہایت ہی پُر لطف و پُر معنی ہے۔

قطعہ (۱۳)

سہل تھا مُسہل و لے یہ سخت مشکل آپڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مُسہل سے پہلے، تین دن مُسہل کے بعد
تین مُسہل، تین تبریدیں، یہ سب کے دن ہوئے؟

یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے۔ شعر ثانی میں کل بارہ روز ہوئے۔ مُسہل سے قبل تین دن منضج کے۔ تین دل مُسہل کے۔ تین دن تبرید کے کیوں ہر مُسہل کے بعد ایک تبرید پلائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ تین دن ان تبرید کے جو مُسہل ختم ہو جانے پر پلائی جاتی ہیں۔ اطبا ان ایام میں چلنے پھرنے کو منع کرتے ہیں، اس لیے اس طرح بارہ روز کی رخصت چاہی ہے۔

تبرید: ٹھنڈائی۔

قطعہ (۱۴)

خُجستہ انجمنِ طُوے میرزا جعفر　　　کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محفوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں، غالبؔ!　　　نہ کیوں ہو مادّۂ سالِ عیسوی ”محفوظ“
۱۸۵۴ء

شعر۔۱ طُوی: ترکی میں شادی عروسی کو کہتے ہیں۔ خجستہ: مبارک۔

قطعہ (۱۵)

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی　　　ہوا بزمِ طَرَب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے، تاریخ اِس کی کیا ہے؟　　　تو بولا ”اِنشراحِ جشنِ جمشید“

شعر۔۱ ناہید: ستارۂ زہرہ جو تیسرے آسمان پر ہے۔ اس کو مُطربۂ فلک بھی کہتے ہیں۔

قطعہ (۱۶)

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں　　　دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام　　　اِس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

”بادشاہ کے دربار کا یہ آداب تھا کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے، تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے۔ چونکہ اُردو محاورہ میں کانوں پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں، اس لیے مرزا نے اِس کو اِس پیرایہ میں بیان کیا ہے“ (یادگار غالب)

رباعیات

بعد از اِتمامِ بزمِ عید اطفال　　　ایامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آپہنچے ہیں تا سوادِ اِقلیم عدم　　　اے عُمرِ گزشتہ! ایک قدم استقبال

اتمام: پورا کرنا، انجام کو پہنچانا۔
سواد: شہر کے اطراف۔ اس قطعہ میں اپنی گزری ہوئی عمر کی بازگشت کی تمنا کی ہے۔

دیگر

شب زلف و رُخِ عَرَق فشاں کا غم تھا　　　کیا شرح کروں کہ طُرفہ تر عالَم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک　　　ہر قطرۂ اشک، دیدۂ پُرنم تھا

یعنی رات، زلف و رُخ معشوق کے غم میں برابر میری آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ ایک عجیب حالت مجھ پر طاری تھی، جو بیان نہیں کی جاسکتی۔ آنسوؤں کا ہر ایک قطرہ زلف و رُخ محبوب کے تصوّر میں سیاہ و سفید ہو کر بالکل ایک دیدۂ پُرنم نظر آتا تھا۔ میں اسی حالت میں ہزار آنکھوں کے ساتھ صبح

کے ساتھ صبح تک روتا رہا۔ ہر قطرۂ اشک میں سیاہی و سفیدی سے آنکھ کی کیفیت پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہزار آنکھ سے رونا کہا ہے۔

دیگر

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی   بیتابیِ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن، اے تجلّی، افسوس!   تکرار روا نہیں، تو تجدید سہی

جان درد تمہید: یعنی وہ جان جس کا آغاز درد سے ہو۔ تجدید: از سرِ نو پیدا کرنا۔ 'سہی' شعر اول کے دونوں مصرعوں میں 'برداشت کیا' کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہمارے پاس دل تھا، رنج و الم اور بے تابی رشک و حسرت سب کچھ برداشت کر لیا کرتے تھے لیکن اب افسوس ہمارے جان و دل افسردہ ہو چکی ہیں۔ اے تجلّی یار، اب تو ان میں پھر سوز و گداز پیدا کر۔ اگر پہلے سوز گداز کا اعادہ ممکن نہیں ہے، تو از سرِ نو ہی سہی۔

دیگر

ہے خلقِ حسد قماش لڑنے کے لیے   وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے
یعنی، ہر بار صورتِ کاغذِ باد   ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

حسد قماش: حاسد۔ لفظاً وہ شخص جس کا جامہ حسد کا ہو (قماش: کپڑے ریشمی) کدۂ تلاش: یعنی تلاش روزی۔ وحشت کدۂ تلاش: ۔مراد دنیا۔ کاغذ باد: پتنگ۔

دیگر

دل سخت نژند ہوگیا ہے گویا   اُس سے گِلہ مند ہوگیا ہے گویا

پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں   غالبؔ! مُنہ بند ہوگیا ہے گویا

نژند: غمگین، سرگشتہ۔

دیگر

دُکھ، جی کے پسند ہوگیا ہے، غالبؔ!   دل رُک رُک کے بند ہوگیا ہے، غالبؔ!
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں   سونا سوگند ہوگیا ہے، غالبؔ!

دیگر

مشکل ہے زبس کلام میرا، اے دل!   سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش   گویم مُشکل، وگر نہ گویم مُشکل!

"آخر کے مصرعہ میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر ان کی فرمائش پوری کروں اور آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے، اور آسان نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ بُرا مانتے ہیں۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس باب میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو سخندان کامل کی نافہمی اور کند ذہنی ظاہر کرتی ہے اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں۔ پس ہر طرح مشکل ہے" (یادگار غالب)

دیگر

بھیجی ہے جو مجھ کو، شاہِ جمجاہ نے، دال   ہے لُطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال   ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

شاہ جمجاہ: یعنی جمشید جیسا مرتبہ رکھنے والا بادشاہ۔ شعر اوّل مصرعہ ثانی میں داں بمعنی دلالت کرنے

والی، بادشاہ کے یہاں مونگ کی دل پکا کرتی تھی، جو شاہ پسنی کہلاتی تھی۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے یہ دال مرزا کو بھی بھیجی۔ رباعی اسی شکریہ میں لکھی گئی۔

دیگر

ہیں شہ میں صفاتِ ذو الجلالی باہم   آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں، سافل و عالی باہم   ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم

سافل: زیر، پست۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے بادشاہ میں شوکت کی صفات موجود ہیں۔ اس میں جلال (غضب) و جمال (رحم) دونوں جمع ہیں۔ اس مرتبہ جب کہ شب قدر اور دیوالی دونوں ساتھ ساتھ آئی ہیں، تو پھر ادنیٰ و اعلیٰ سب کیوں کر خوش نہ ہوں۔

دیگر

حق، شہ کی بقا سے، خلق کو شاد کرے   تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں، گانٹھ   ہے صِفر کہ افزایشِ اعداد کرے

شیوع: ظاہر ہونا، رواج پانا۔ یہ رباعی مرزا نے بادشاہ کی سال گرہ کی مبارکبادی میں لکھی تھی۔

دیگر

اِس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا   اتنے ہی برس شمار ہوں، بلکہ سوا!
ہر سینکڑے کو ایک گِرہ فرض کریں   ایسی گرہیں ہزار ہوں، بلکہ سوا!

یہ بھی سالگرہ کے موقع پر لکھی گئی۔

دیگر

کہتے ہیں کہ، اب وہ مردم آزار نہیں   عُشاق کی پُرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا   کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

ظلم سے ہاتھ اٹھانا: اس سے دست بردار ہونا، اس کو ترک کرنا۔ بالکل نیا مضمون ہے۔ اس جملہ میں ابہام ہے۔

دیگر

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے   کرتے ہیں درنگ، کام کرنے والے
کہتے ہیں، کہیں خُدا سے، اللہ اللہ!   وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

''اِس رباعی میں مرزا نے غایت درجہ کی شوخی کی ہے، جو بالکل اچھوتی اور نئی طرح کی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم ہر چند دربار کے بااختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں مگر وہ ہماری کام روائی میں درنگ اور لیت و لعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی سے کہیں۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو۔ وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں۔ صبح و شام کرنا، لیت و لعل کو کہتے ہیں۔ چوں کہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے۔ تو خدا کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ صبح شام کرنے والے ہیں۔ مگر شاعر کا اصلی مقصود یہی ہے کہ کام روائی خلق میں جیسی لیت و لعل وہاں ہوتی ہے، ایسی کہیں نہیں ہوتی کہ اکثر ساری عمر امید ہی میں گزر جاتی ہے، اور مطلب حاصل نہیں ہوتا۔'' (یادگار غالب)

دیگر

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں!   آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں!

روزہ مرا ایمان ہے ، غالبؔ! لیکن   خسخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں!

یہ رباعی بھی اسی قطعہ کے ساتھ جس میں روزے کا مضمون باندھا ہے، دربار میں پیش کی گئی تھی۔

دیگر

اِن سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے!   بھیجے ہیں جو اَرمغاں شہ والا نے
گِن کر دیوینگے ہم دُعائیں سو بار   فیروزے کی تسبیح کے، ہیں یہ دانے

رباعی ۱۶۔ ارمغاں: تحفہ ایک مرتبہ بادشاہ نے مرزا کو سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا۔ اس کے شکریہ میں مرزا نے یہ رباعی لکھی۔ بڑا فیروزہ جو بیضوی شکل کا ہوتا ہے۔ وہ سیم کے بیج سے بہت مشابہ ہوتا ہے۔